مجلّہ غالب نامہ

اُردو میں علمی اور تحقیقی رفتار کا آئینہ

مدیراعلا۔ پروفیسر نذیر احمد

مدیران:

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی

پروفیسر شریف حسین قاسمی

شاہد ماہلی

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

مجلّہ غالب نامہ نئی دہلی

جولائی ۲۰۰۲ء

جلد نمبر ۲۳ —————— شمارہ نمبر ۲

قیمت - = ۱۵۰/ روپے

اردو شاعری - تاریخ و تنقید

ناشر و طابع — شاہد ماہلی

کمپیوٹر کمپوزنگ — محمد عمر کیرانوی

مطبوعہ — عزیز پرنٹنگ پریس، دہلی

حالی، الطاف حسین - تاریخ

خط و کتابت کا پتا

غالب نامہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۲

فہرست مضامین

اداریہ

غالب بین الاقوامی سمینار کا انعقاد، بیسیوں سال سے اس ادارے کے زیر اہتمام انجام پذیر ہوتا ہے جس میں ہندوستان، پاکستان، ایران، افغانستان، سنٹرل ایشیا وغیرہ کے فضلا و محققین کی شرکت ہوتی ہے، اور اس وسیلے سے جتنا نیا مواد "غالب" کی شخصیت، علمی فضیلت، شاعری، نثر نگاری وغیرہ پر شایع ہوا ہے وہ نہایت وقیع ہے۔ ادھر دو تین سال سے اردو کے دوسرے شعرا پر یہ سمینار ہو رہا ہے، میر تقی میر اور سودا سمینار کے موضوع رہ چکے ہیں اور امسال "حالی" پر یہ سمینار منعقد ہو رہا ہے، اس بین الاقوامی سمینار کے علاوہ غالب انسٹی ٹیوٹ یک روزہ سمینار بھی منعقد کرتا ہے اور اب تک دس بارہ یک روزہ سمینار تشکیل پا چکے ہیں۔

ادارہ نے چند سال سے یہ محسوس کیا کہ اردو، فارسی کے ریسرچ اسکالروں کی تربیت کی بھی ضرورت ہے، چنانچہ قریب کی یونیورسٹیوں کے طلبا کی شرکت سے یک روزہ سمینار منعقد ہوتے ہیں، جو اس لحاظ سے نہایت کامیاب سمینار ہوتے ہیں کہ مقالے لکھنے والے اور سامعین دونوں بڑی دلچسپی سے سمیناروں میں شرکت کرتے ہیں، ان سمیناروں کے بعض مقالے ہم غالب نامے میں شایع کرتے ہیں۔ اس ادارے کے تحت ہر سال

فخرالدین میموریل لکچر کا انعقاد بھی ہوتا ہے، اس میں ملک کے نامور حضرات کو مقالہ پڑھنے کی دعوت دی جاتی ہے، اور اب تک متعدد حضرات لکچر دے چکے ہیں، یہ خطبات الگ سے شائع ہوتے ہیں۔ سالِ رواں کے فخرالدین علی احمد میموریل لکچر کے لیے اس بار ہندوستان کے معروف اور روشن فکر صحافی اور مفکّر جناب کلدیپ نیّر صاحب کو زحمت دی گئی۔ آپ نے ''کیا ہندوستان میں سیکولر اِزم باقی رہے گا'' کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اس ادارے کے زیرِ اہتمام ہر سال ایک بین الاقوامی سمینار منعقد ہوتا ہے، یہ سمینار غالب پر ہوتا تھا، ادھر تین سال سے موضوع میں اتنی تبدیلی کی گئی ہے کہ اردو کے کسی بھی بڑے شاعر کو سمینار کا موضوع قرار دیا جائے، چنانچہ ''میر تقی میر'' اور ''محمد رفیع سودا'' پر گذشتہ اور پیوستہ سالوں میں سمینار ہو چکے ہیں۔ امسال ''خواجہ الطاف حسین حالی'' کو غالب انٹرنیشنل سمینار کا موضوع قرار دیا گیا ہے، اس موضوع کے تعلق سے چند باتیں عرض کرنا چاہوں گا۔

حالی غالب کے شاگرد تھے اور شاید سب سے ذی علم شاگرد رہے ہیں، وہ بڑے پایے کے نقّاد، شاعر، ادیب، انشا پرداز اور مورخ تھے اور ان سارے امور میں ان کے زمانے میں ان کا کوئی ہم پلّہ نہ رہا ہوگا۔ وہ اردو میں نقد نویسی کے بانی تھے اور بعض اعتبار سے اب تک کوئی ان کا ہم پلّہ نہیں ہوا ہے، قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ تنقید پر ان کی مشہور تصنیف مقدمۂ شعر و شاعری ہے۔ یہ کتاب ایک نہایت ہی مہذّب، متمدن اور شایستہ ذہن کا عکس ہے، حالی جیسا سلجھا ہوا ذہن نہیں ملے گا، اس کا کلاسیکی رچاؤ اپنی نظیر نہیں رکھتا، ان کی شخصیت کا بہترین اظہار ان کی تنقید کی زبان اور اسلوب میں ہوا ہے، جس کی تعریف میں سارے نقاد رطب اللسان ہیں۔ وہ صرف نقاد ہی نہیں بنیادی طور پر وہ بڑے دانشور تھے۔

ان کی رگوں میں پوری نسل کی دانشمندی خون بن کر دوڑ رہی تھی۔ وہ ادب اور

شاعری کو انسان کی پوری تاریخی، تہذیبی اور روحانی زندگی کے تناظر میں دیکھتے تھے، مقدمۂ شعر و شاعری میں وہ لکھتے ہیں کہ صدر اسلام کی شاعری میں جب تک غلامانہ ذہن نے راہ نہیں پائی تھی، تمام سچے جوش اور ولولے موجود تھے۔ جو لوگ مدح کے مستحق ہوتے تھے ان کی مدح ہوتی جب کوئی منصف خلیفہ یا وزیر مرجاتا تو اس کے دردناک مرثیے لکھے جاتے۔ ظالموں کی مذمت کرنے میں شاعر بے باک ہوتا تھا، اچھے حلفا اور سلاطین کی فتوحات میں جو واقعات پیش آتے، ان کا قصائد میں پرجوش انداز میں ذکر ہوتا۔ احباب کی صحبتیں جو انقلاب روزگار سے برہم ہو جاتیں، ان پر دردناک اشعار لکھے جاتے، چراگاہوں، چشموں اور وادیوں کی گذشتہ صحبتوں کی ہوبہو عکاسی ہوتی، جوانی کے عیش اور بچپن کی بےفکریوں کا تذکرہ ہوتا، دوستوں اور ہم عصروں کی سچی تعریفیں ہوتیں اور ان کے مرنے پر مرثیے لکھے جاتے، خاندان اور قبیلے کی شجاعت اور سخاوت کا فخر سے بیان ہوتا، اسی طرح تمام نیچرل حالات و جذبات جو ایک جوشیلے شاعر کے دل میں پیدا ہوتے، وہ سب اس کے کلام میں پائے جاتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ حالی کو شاعری میں آفاقی وسعت پسند ہے، ان کے لیے پوری کائنات شاعری کا مواد فراہم کرتی ہے۔

حالی ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے، وہ زندگی کے ہر شعبے پر چھائے ہوئے تھے، زندگی کے تمام شعبوں میں وہ سرگرم رہے لیکن ان کے یہاں کہیں ہنگامہ آرائی کا نام و نشان نہیں، وہ حوصلہ شکن اور تاریک دور میں اپنی تہذیب کے بکھرے ہوئے اجزا کو سمیٹتے رہے، ان امور کی بنا پر ان کی شخصیت میں ایسا حسن اور رچاؤ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ آج بھی نہایت دل نواز ہے۔ کلیم الدین احمد نے حالی کی تنقیدی اسلوب کی بڑی تعریف کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ حالی نے صاف اور سادہ طرز ایجاد کی لیکن اس طرز میں بے رنگی نہیں، پھسپھسا پن نہیں، حالی نے نثر کو ایک نیا طرز دیا، ان کی کوشش تھی کہ جو لطف ہو وہ صرف مضمون کی ادا میں ہو، جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تا کہ دل سے نکلے

اور دل میں بیٹھے، یہی ان کی نثر کی انفرادی خصوصیت ہے۔

حالی صرف نقاد اور ادیب ہی نہ تھے، وہ بڑے درجے کے شاعر تھے، ان کی شاعری کے دو انمول نمونے پیش کیے جاتے ہیں، جن سے ان کی عظمت ظاہر ہوتی ہے، پہلی نظم غالب کا مرثیہ ہے، شخصی مرثیوں میں اس سے بہتر کسی اور مرثیے کا تصور نہیں ہو سکتا

کیا کہوں حالِ دردِ پنہانی وقت کوتاہ و قصہ طولانی
عیشِ دنیا سے ہو گیا دل سرد دیکھ کر رنگِ عالم فانی
کچھ نہیں جز طلسمِ خواب و خیال گوشۂ فقر و بزمِ سلطانی
ہے سراسر فریب و وہم و گمان تاجِ فغفور و تختِ خاقانی
لفظِ مہمل ہے نطقِ اعرابی حرفِ باطل ہے عقلِ یونانی
ایک دھوکا ہے لحنِ داؤدی اک تماشا ہے حسنِ کنعانی
لوں نہ اک مشتِ خاک کے بدلے گر ملے خاتمِ سلیمانی

بحرِ ہستی بجز سراب نہیں
چشمۂ زندگی میں آب نہیں

بلبلِ ہند مر گیا ہیہات جس کی تھی بات بات میں ایک بات
نکتہ داں نکتہ سنج نکتہ شناس پاک دل پاک ذات پاک صفات
لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھکانا سو تکلف اور اس کی سیدھی بات
دل میں چبھتا تھا وہ اگر بمثل دن کو دن کہتا اور رات کو رات
اس کے مرنے سے مر گئی دلی خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات
یاں اگر بزم تھی تو اس کی بزم یاں اگر ذات تھی تو اس کی ذات

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں ایک چراغ تھا نہ رہا

دل کو باتیں جب اس کی یاد آئیں ... کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں
لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں ... اہل میت جنازہ ٹھیرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو ... سوے مدفن ابھی نہ لے جائیں
قدسی و صائب و اسیر و کلیم ... لوگ جو چاہیں ان کو ٹھیرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے ... ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

غالب نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج ... اپنا بیگانہ اشکبار ہے آج
تھا زمانے میں ایک رنگیں طبع ... رخصت موسم بہار ہے آج
بارِ احباب جو اٹھاتا تھا ... دوشِ احباب پر سوار ہے آج
دل میں مدت سے تھی خلش جس کی ... وہی برچھی جگر کے پار ہے آج
کس کو لاتے ہیں بہرِ دفن کہ قبر ... ہمہ تن چشمِ انتظار ہے آج

غم سے بھرتا نہیں دلِ ناشاد
کس سے خالی ہوا جہاں آباد

نقد معنی کا گنجداں نہ رہا ... خوانِ مضموں کا میزباں نہ رہا
ساتھ اسکے گئی بہارِ سخن ... اب کچھ اندیشۂ خزاں نہ رہا
عشق کا نام اس سے روشن تھا ... قیس و فرہاد کا نشاں نہ رہا
ہو چکیں حسن و عشق کی باتیں ... گل و بلبل کا ترجماں نہ رہا
اہل ہند اب کرینگے کس پر ناز ... رشک شیراز و اصفہاں نہ رہا
کوئی ویسا نظر نہیں آتا ... وہ زمیں، اور وہ آسماں نہ رہا

اٹھ گیا، تھا جو مایہ دارِ سخن
کس کو ٹھیرائیں اب مدارِ سخن

کیا ہے جس میں وہ مرد کار نہ تھا　　اک زمانہ کہ سازگار نہ تھا
خاکساروں سے خاکساری تھی　　سربلندوں سے انکسار نہ تھا
بے ریائی تھی زہد کے بدلے　　زہد اس کا اگر شعار نہ تھا
ایسے پیدا کہاں ہیں مست وخراب　　ہم نے مانا کہ ہوشیار نہ تھا

مظہر شان حسن فطرت تھا
معنی لفظ آدمیت تھا

ایسے مرثیے کی کوئی مثال اردو میں نہیں ملتی۔

دوسری نظم مسدّس حالی ہے، اس کا دوسرا نام مدّ وجزر اسلام ہے، ایسی پر جوش، عبرت انگیز، سبق آموز، دلوں کو ابھارنے اور غیرت دلانے والی نظم، ہماری کسی زبان میں نہیں، یہ نظم ہماری قومی زندگی کا کامل مرقع ہے، اس میں ہمارے خط وخال صاف نظر آتے ہیں، پھر حسن بیان نے اسے معراج کمال تک پہنچادیا ہے۔ اس میں ایسے تیز نشتر ہیں جو جگر کے پار ہو جاتے ہیں۔

مسدّس حالی زندہ جاوید کتابوں میں شمار کی جاتی ہے، اس کی درد بھری آواز ہمیشہ دلوں کو تڑپاتی رہے گی، رلاتی رہے گی، اور اس کے دردمندانہ اقوال دلوں میں گھر کیے بغیر نہیں رہیں گے۔ اس نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں

وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا خدا کا　　خلیل ایک معمار تھا جس بنا کا
ازل میں مشیّت نے تھا جس کو تاکا　　کہ اس گھر سے ابلے گا چشمہ ہدیٰ کا

وہ تیرتھ اک بت پرستوں کا گویا
جہاں نامِ حق کا نہ تھا کوئی جویا

چلن ان کے جتنے تھے سب وحشیانہ　　ہر اک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا ان کا زمانہ　　نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ

وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بے باک جیسے

نہ ٹلتے تھے ہرگز جو اڑ بیٹھتے تھے
سلجھتے نہ تھے جب جھگڑ بیٹھتے تھے

جو دو شخص آپس میں لڑ بیٹھتے تھے
تو صدہا قبیلے بگڑ بیٹھتے تھے

بلند ایک ہوتا تھا گر واں شرارا
تو اس سے بھڑک اٹھتا تھا ملک سارا

جو ہوتی تھی پیدا کسی گھر میں دختر
تو خوف شماتت سے بے رحم مادر

پھرے دیکھتی جب تھی شوہر کے تیور
کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اس کو جا کر

وہ گود ایسی نفرت سے کرتی تھی خالی
جنے سانپ جیسے کوئی جننے والی

یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت
بڑھا جانب بو قبیس ابرِ رحمت

ادا خاک بطحا نے کی وہ ودیعت
چلے آتے تھے جس کی دیتے شہادت

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیل اور نوید مسیحا

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

خطا کار سے درگذر کرنے والا
بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا

مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا
قبایل کو شیر و شکر کرنے والا

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

مس خام کو جس نے کندن بنایا — کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا

عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا — پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا

اِدھر سے اُدھر پھر گیا رخ ہوا کا

اوپر جو مثالیں نقل ہوئی ہیں ان سے واضح ہے کہ وہ نابغۂ روزگار تھے، وہ ہماری زبان کے ان بلند پایہ ادیبوں میں ہیں جو بڑے شاعر بھی ہیں اور نثر نگار و انشا پرداز بھی، جہاں اردو ان کی شاعری کی رہین منّت ہے وہیں ان کی نثر نگاری کے زیر بار احسان بھی ہے، ان کی نثر اور ان کا انداز نہایت دلپذیر ہوتا ہے، چاہے شعر ہو یا نثر، وہ جو کہتے ہیں دل میں اتر جاتا ہے، ان کی انشا پردازی بھی بڑی قابل توجہ ہے، انشا پردازی کے لحاظ سے اردو میں وہ یک و تنہا نظر آتے ہیں۔ ان کی طرز نگارش میں جو مسجع نثر ہے بڑی پر کشش ہے، ذیل میں ان کے اس طرز کے نمونے پیش کیے جاتے ہیں، ان کا ایک مقالہ مناجات بہ درگاہ قاضی الحاجات ہے جس کے چند جملے اس طرح ہیں

"الٰہی تیرا کرم وسیع، تیری عنایت شامل، تیرا فیض عام، تیرے ہاتھ کشادہ، تیرا ملک بے زوال، تیرے خزانے بے حساب، تیری نعمتیں سرمدی، تجھ سے کیا کیا مانگیے اور کہاں تک مانگیے، تجھ سے دولتِ کونین پر راضی ہونا ایسا ہے جیسا بحر قلزم سے پیاسا پھر آنا، تجھ سے دنیا اور آخرت مانگنی ایسی ہے جیسے خوانِ یغما سے بھوکا لوٹنا، تیرا گدا نہیں جو ہفت اقلیم کی سلطنت پر لات نہ مارے، تیرا بھوکا نہیں جو نعیم جنت کے لیے ہاتھ پسارے، جس نے تجھ سے تیرے سوا آرزو کی، اس نے آرزو کرنی نہ جانی، جس نے تیرے ہوتے

عرش اور مادون العرش پر خاک نہ ڈالی، اس نے تیری قدر
نہ پہچانی۔"

حالی کا ایک مضمون "زبان گویا" کے عنوان سے ہے، وہ انشا پردازی کا ایسا دلفریب نمونہ ہے کہ اس کو بار بار پڑھنے سے طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ اس کا ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے

اے میری بلبلِ ہزار داستان، اے میری طوطی شیوا بیاں، اے میری قاصد، اے میری ترجمان' اے میری وکیل، اے میری زبان، سچ بتا تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے، تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں نیا مزہ ہے، کبھی تو ایک ساحرِ فسوں ساز ہے جس کے سحر کا نہ رد، نہ جادو کا اتار، کبھی تو ایک افعی جاں گداز ہے جس کے زہر کا نہ درد، نہ کاٹے کا منتر، تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی، تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی اور کبھی اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی۔

اے میری بنی بات کی بگاڑنے والی اور میرے بگڑے کاموں کی سنوارنے والی، روتے کو ہنسانا، ہنستے کو رلانا، روٹھے کو منانا، بگڑنے کو بنانا نہیں معلوم تو نے کہاں سیکھا اور کس سے سیکھا، کہیں تیری باتیں وِس کی گانٹھیں ہیں اور کہیں تیرے بول شربت کے گھونٹ، کہیں تو شہد ہے اور

کہیں حنظل، کہیں زہر ہے تو کہیں تریاق۔ الٰہی اگر ہم کو
رخصت گفتار ہے تو زبان راست گفتار دے، اگر دل پر تجھ کو
اختیار ہے تو زبان پر ہم کو اختیار دے، جب تک دنیا میں
رہیں سچے کہلائیں اور جب تیرے دربار میں آئیں تو سچے
بن کر آئیں۔

اردو میں اس طرح کے نمونے شاذ ہیں، بخوبی ممکن ہے کہ حالی کو یہ طرز ورثے
میں ملا ہو، اس لیے کہ ان کے مورث اعلی عبداللہ انصاری سہروردی تھے، اور فارسی میں اس
طرز کے بانی سمجھے جاتے ہیں، ان کی نثر کے چند نمونے ذیلاً نقل کیے جاتے ہیں

اے خالق بے مدد، واے واحد بے عدد، اے عزیز
بے ذلت، اے آخر بے نہایت، اے ظاہر بے صورت و
اے باطن بی سیرت، اے حیّ بے حیلت، اے اول بے
بدایت، اے آخر بے نہایت، اے غنی بے قلت، اے معطی
بی فکرت، اے بخشندۂ بے منّت، اے دانندۂ رازہا، اے
بینندۂ نمازہا، اے پذیرندۂ نیازہا

الٰہی اگر بگیری بر تو حجت ندارم، اگر بسوزی طاقت
ندارم، از بندہ خطا آید وزلت، و از شاہ عطا آید و رحمت،
اے کامگارے کہ دل دوستان در کنف وحدت تست، اے
کارگذارے کہ جان بندگان در صدف تقدیر تست، اے
مفضلے کہ بہ افضال کسی ترا حاجت نیست، اے منعمے کہ
انعام ترا نہایت نیست۔

حالی انہیں شیخ الاسلام عبداللہ انصاری کی اولاد میں تھے، چنانچہ انہوں نے اپنے

ایک مضمون میں اپنا سلسلۂ نسب اس طرح بیان کیا ہے

اس قصبے میں (یعنی پانی پت میں) کچھ کم سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ جس سے راقم الحروف کا تعلق ہے، چلی آتی ہے۔ ساتویں صدی میں جب کہ غیاث الدین بلبن تخت دہلی پر متمکن[1] تھا، شیخ الاسلام خواجہ[2] عبداللہ انصاری معروف بہ پیر ہرات کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی نام جو علوم متعارفہ میں اپنے تمام معاصرین سے ممتاز تھے، ہرات سے ہندوستان وارد ہوے جن کا نسب ۲۶ واسطوں سے حضرت ابو ایوب انصاری تک اور ۸ واسطے سے شیخ الاسلام تک اور ۱۰ واسطے سے ملک محمود شاہ انجو[3] ملقب بہ آقا خواجہ تک جو غزنوی دور میں فارس و کرمان و عراق عجم کا فرمان روا تھا، پہنچتا تھا۔

محمود شاہ انجو کے بارے میں حالی کی اطلاع صحیح نہیں، وہ غزنوی دور سے تعلق نہیں رکھتا، اس کے بیٹے کا نام ابو اسحاق اینجو ہے، وہ حافظ کا ممدوح تھا، ۷۵۸ھ میں امیر مبارز الدین سے مغلوب اور اس کے حکم سے قتل ہوا، ابو اسحاق کے باپ کا نام شرف الدین محمود اینجو تھا، پہلے وہ امیر چوپان کا ملازم تھا، پھر اس نے ایران کے جنوبی علاقے کو مسخر کر کے خود وہاں کا والی ہوگیا۔ اس کا یہ خاندان اینجو خاندان کہلاتا ہے اور اس خاندان کے حسب ذیل حکمراں ہوے ہیں

محمود شاہ، پھر اس کے چار بیٹے

جلال الدین، مسعود شاہ، غیاث الدین کیخسرو، جمال الدین ابو اسحاق

اس کا آخری فرمانروا تھا جو مبارز الدین کے ہاتھوں ۷۵۸ھ میں مغلوب ہوا، اور اسی پر اینجو

۱۔ ۶۸۶۔ ۶۶۵ھ ۲۔ ان کے حالات کے لیے دیکھیے نفحات الانس ص ۳۳۶ بعد، وفرہنگ نفیس ج ۵ ص ۱۱۵۰، ۳۹۶۔ ۴۸۱ھ ان کی ولادت اور وفات دونوں ہرات میں ہوئی۔

۳۔ ملک اینجو امیر چوپان کا ملازم تھا، اس کا نام شرف الدین محمود تھا۔

خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہوا، ابو اسحاق حافظ شیرازی کا ممدوح تھا۔

حالی نے نثر مسجع میں اپنے چند مقالے لکھ کر اپنے خاندان کی روایت برقرار رکھی ہے۔ ایرانی ادبی تاریخ میں خواجہ عبداللہ انصاری پیر ہرات کو نثر مسجع میں جو شہرت حاصل ہے وہ کسی اور فارسی نثر نویس کو میسر نہیں، اسی طرح خواجہ حالی بھی نثر مسجع کے اعتبار سے اردو میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے اور حالی نے یہ کمال اپنے جدّ بزرگوار خواجہ انصاری سے حاصل کیا تھا۔

''خواجہ الطاف حسین حالی'' پر سمینار میں پڑھے گئے بیشتر مضامین اس شمارے میں پیش خدمت ہیں جو حالی کی زندگی اور علمی و ادبی خدمات کو اجاگر کرنے کے لیے اہم مآخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پروفیسر نذیر احمد

رشید حسن خاں

یادگارِ غالب

مقدّمۂ شعروشاعری کی طرح "یادگارِ غالب" کو بھی اپنے موضوع پر بنیادی کتاب کی حیثیت حاصل ہے۔ پچھلے پچاس ساٹھ برسوں میں مرزا صاحب کی شخصیت، اردو نثر اور اردو شاعری سے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے، اِس کے باوجود سو برس سے زیادہ پرانی کتاب "یادگارِ غالب" کی اساسی حیثیت آج بھی برقرار ہے۔ اس قول کے ساتھ اگر اِس جملے کو شامل کرلیا جائے کہ مرزا صاحب کی فارسی نثر اور فارسی شاعری سے متعلق حالؔی نے جو کچھ لکھا تھا، اُس پر ذرا سا بھی اضافہ نہیں کیا جاسکا ہے، تو بات مکمّل ہو جائے گی۔ اسباب سے یہاں بحث نہیں، واقعہ یہی ہے۔ یہ واضح کردیا جائے کہ 'برہانِ قاطع' سے تعلق رکھنے والی بحثیں اِس قول کے دائرے سے باہر کی چیز ہیں۔ ان کا تعلق لسانی مباحث سے ہے تنقید یا ادبی تحقیق سے نہیں۔

'یادگارِ غالب' کا پہلا حصّہ مرزا صاحب کے حالاتِ زندگی اور ان کی اردو نثر و نظم کے تنقیدی جائزے پر مشتمل ہے۔ حالاتِ زندگی سے متعلق جو کچھ حالؔی نے لکھا ہے، وہ تحقیق کے ذیل میں آتا ہے اور اِس وقت اِس حصّے کا تحقیقی پہلو ہی پیشِ نظر ہے۔ تنقیدی پہلو

اس تحریر کے دائرے میں نہیں آتا۔

یہ بات ہمارے سامنے ضرور رہنا چاہیے کہ حالی کا ذہن تنقیدی مباحث سے جیسی قریب کی نسبت رکھتا تھا، تحقیقی مباحث سے ان کے مزاج کو ویسا علاقہ نہیں تھا۔ اسی وجہ سے اس کتاب کا تحقیقی حصّہ خاصا کم زور ہے اور حالی کے بہت سے بیانات قابلِ قبول نہیں۔ ایک مشکل اور بھی تھی۔ مولانا کو مرزا صاحب سے بہ قولِ خود شاگردی کی نسبت بھی حاصل تھی، وہ برائے نام سہی، لیکن وہ مرزا صاحب کو اپنا اُستاد مانتے تھے اور مرزا صاحب کے علمی کمالات کے ساتھ ساتھ ان کی سماجی حیثیت اور خاندانی وقار کو بھی مانتے تھے۔ اِس کے اثرات ان کے ذہن پر چھائے ہوئے تھے۔ وہ ایسی کوئی بات نہیں لکھنا چاہتے تھے جس سے مرزا صاحب کی کوئی کم زوری یا برائی نمایاں ہو جائے۔ یہ میری رائے ہے کہ حالی کو بہت سے واقعات کا علم تھا۔ وہ اگر اپنے طور پر ان کو لکھتے تو بعض ایسی باتیں ضرور بیان میں آ جاتیں جو ان کے نزدیک وضاحت طلب نہیں تھیں۔ اس الجھن اور اِس کشمکش سے چھٹکارا حاصل کرنے کا یہ طریقہ انھوں نے اختیار کیا کہ بعض اہم واقعات کے بیان میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے خود مرزا صاحب کے بیانات کو نقل کر دیا، اِس طور پر کہ سوانح نگار کی حیثیت سے ان کے کسی بیان کا جائزہ نہیں لیا۔ اِس طریقۂ کار نے کئی واقعات کی حقیقی شکل صورت کو سامنے نہیں آنے دیا۔

اِس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ یہ کتاب انیسویں صدی کی آخری دہائی کی یادگار ہے۔ تب سے اب تک مرزا صاحب کے حالاتِ زندگی سے متعلق بہت سی نئی معلومات ہمارے سامنے آئی ہے جو مولانا حالی کی دسترس میں نہیں تھی۔

اس صورتِ حال کے تحت یہ بات بہت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ یادگارِ غالب کے پہلے حصّے کو، ایک مستقل کتاب کے طور پر جدید طریقۂ تدوین کے تحت مرتب کیا جائے۔ اس میں مفصّل توضیحی حواشی ہوں، جن میں وہ ساری معلومات بہ قدرِ ضرورت شامل کر دی

جائے جس کی مدد سے اِس کتاب کے مندرجات صحیح طور پر اور بہتر طور پر سامنے آسکیں۔

پہلے حصّے کی تدوین کے سلسلے میں دو تین باتوں کو خاص طور پر مرتّب کے ذہن میں رہنا چاہیے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مرزا صاحب زندگی بھر اس کش مکش کا شکار رہے کہ خاندانی وقار اور حالات کے تقاضوں کے تحت بات کیسے بنائی جائے۔ یہ درست ہے کہ خاندانی وقار اور اپنے کمال کا احساس کبھی کبھار ان کی مصلحت شناسی پر غالب آجاتا تھا۔ ایسا ہوتا تو تھا، مگر کم، عموماً مصلحت کے تقاضوں کو وہ ملحوظ رکھا کرتے تھے۔ اِس کے نتیجے میں بھی ان کے کچھ بیانات باہم مختلف ہیں۔ اِسی دباؤ کے تحت وہ ایسی باتیں کہنے پر بھی مجبور ہوئے جو بجائے خود صحیح نہیں تھیں۔ ایسے مقامات حاشیہ نگار کی توجہ کے خاص طور پر مستحق ٹھہریں گے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ مرزا صاحب عادتاً جھوٹ بولا کرتے تھے اور یہ کہ وہ طبعاً راست گفتار نہیں تھے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ جن غیر موافق حالات سے وہ زندگی بھر دوچار رہے، جس کش مکش نے ان کو مبتلائے پیچ وتاب رکھا، یہ اس کے نشانات ہیں۔ ہاں تحقیق کی نگاہ میں غلط بیان اور باہم مختلف بیانات ہر صورت میں تصحیح طلب ہوتے ہیں، اِس بنا پر حواشی میں ایسے جملہ بیانات کا جائزہ لیا جانا چاہیے۔

مولانا کے لکھے ہوئے بعض واقعات کے تحت ایسی تشریحی عبارتوں کا اضافہ ضروری معلوم ہوتا ہے جن سے وہ باتیں اپنے مالہ و ماعلیہ کے ساتھ نظروں کے سامنے آسکیں۔ اِس سلسلے کی تیسری بات یہ ہے کہ اِس کتاب کے لکھے جانے کے بعد جو معلومات سامنے آئی ہے، وہ ہمارے علم میں تو ہے، مگر بکھری ہوئی ہے، کچھ اِس مضمون میں، کچھ اُس کتاب میں۔ جو حواشی لکھے جائیں گے، ان کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ بہت سی معلومات ترتیب کے ساتھ یک جا ہو جائے گی۔ اِس طرح توضیح، تکمیل اور تصحیح، اِن تینوں عنوانات کے تحت اضافوں کے ساتھ اس کتاب کے پہلے حصّے کا یہ جدید اڈیشن اساتذہ، طلبہ اور دوسرے ادب دوستوں اور مرزا صاحب کے کمالات کا اعتراف کرنے والوں کے لیے

دستاویزی حیثیت کا بیش قیمت تحفہ ہوگا۔

حواشی کی تسوید اور ترتیب کا انداز کیا ہونا چاہیے، اِس کا تعلق تو مرتّب کے طریقۂ کار سے ہوگا۔ اِن میں کس طرح کے اجزا شامل ہو سکتے ہیں، اُس کا موٹا سا اندازہ کرنے کے لیے محض بہ طورِ مثال ذیل میں ایسے چند مقامات کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

حالاتِ زندگی کے تحت حالؔی نے جُوے کے سلسلے میں مرزا صاحب کے قید ہونے کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ پورا بیان حقائق کے خلاف ہے اور یہاں مولانا حالی سوانح نگار کے بجائے محض سعادت مند شاگرد نظر آتے ہیں جس کی کوشش یہ نظر آتی ہے کہ استاد پر الزام نہ آنے پائے۔ اِس کے لیے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اپنی طرف سے کچھ لکھنے کے بجائے خود مرزا صاحب کے ایک فارسی خط کا ترجمہ درج کر دیا۔ اُس کے مندرجات کا جائزہ لیے بغیر جس میں مرزا صاحب نے یہ لکھا ہے کہ کوتوال میرا دشمن تھا اور مجسٹریٹ مجھ سے ناواقف تھا۔ یعنی مرزا صاحب کے لکھنے کے مطابق وہ بے گناہ تھے، حالانکہ یہ واقعے کے خلاف ہے۔ حالؔی نے قید کا جو سنہ لکھا ہے، وہ بھی درست نہیں۔ حالؔی نے یہ بھی نہیں لکھا کہ مرزا صاحب اِس واقعے سے چند برس پہلے بھی ایک بار اِسی علت میں گرفتار ہو چکے تھے۔ مولانا عرشؔی نے مکاتیبِ غالب کے مقدمے میں اِس سلسلے کی بیش تر تفصیلات کو یک جا کر دیا ہے۔ مالک رام صاحب نے (ذکرِ غالب میں) اور مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی (نقشِ آزاد) میں اِس سلسلے میں کچھ ضروری باتیں لکھی ہیں۔ یادگارِ غالب کے حاشیہ نگار کو اس اندراج کے تحت جملہ ضروری تفصیلات کی نشان دہی کرنا چاہیے اور صحیح تاریخ اور سنہ کا بھی تعین کیا جانا چاہیے۔ اِس سلسلے میں ایک ضمنی بات بھی ایسی ہے جسے شاملِ حاشیہ کیا جانا مناسب بھی ہوگا اور شاید ضروری بھی۔ جو کچھ ہوا، وہ حادثے سے کم نہیں تھا، مگر ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ ہاں پہلے وہ جرمانے کی رقم ادا کر کے قید سے بچ گئے تھے۔ توجہ طلب بات یہ ہے کہ ہمارے سامنے ایسی کوئی شہادت موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ پہلے

واقعے کے بعد اُن کی عزّت و وقار میں کسی طرح کی کمی ہوئی تھی۔ دوسری بار واقعہ سخت تھا، مگر اُس کے بعد بھی ایسا نہیں ہوا کہ اُن کی سماجی یا علمی حیثیت پر حرف آیا ہو۔ مغل بادشاہ نے اُس کے بعد، یعنی اُس واقعۂ قید و بند کے بعد ان کو "نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ" کے خطابات، چھے پارچے کے خلعت اور تین رقومِ جواہر کے ساتھ عطا کیے تھے۔ اُس کے بعد اُنہوں نے اُستادِ شاہ ہونے کا شرف پایا، جو اُس زمانے کی روایت کے مطابق معمولی بات نہیں تھی۔ پھر فرماں روائے رام پور کا استاد بننے کی عزّت بھی ان کو حاصل ہوئی تھی۔ یہ باتیں اسی پر دلالت کرتی ہیں کہ مرزا صاحب کے معاشرے نے، جو طبقہ اشرافیہ کا معاشرہ تھا، قمار بازی کے جرم میں اس قید اور اس جرمانے کو کوئی ایسی چیز نہیں سمجھا تھا جس کی بنا پر مرزا صاحب کی سماجی اور علمی حیثیت ختم ہو جائے یا کم ہو جائے۔ اِس سلسلے میں نواب مصطفا خاں شیفتہ کے یہ الفاظ بھی ہمارے سامنے رہنا چاہیے

> "مجھے مرزا صاحب سے عقیدت ان کے زُہد و اتّقا کی بنا پر نہ تھی، فضل و کمال کی بنا پر تھی۔ گرفتاری کے بعد بھی ان کا فضل و کمال ایسا ہی ہے جیسا پہلے تھا"۔

آج اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ مرزا صاحب کا جُوا کھیلنا، یا اپنے مکان پر جوا کھیلنے کا انتظام کرنا، ان کا شراب پینا یا جوے کی علّت میں قید ہونا بجائے خود جو بھی حیثیت رکھتا ہو، ان کی شاعرانہ عظمت اور ان کی شخصیت پر اِن باتوں سے ذرا بھی حرف نہیں آتا' یہ دو قطعی طور پر مختلف باتیں ہیں' تو یہ بات صرف ہم اِس زمانے میں نہیں کہتے، مرزا صاحب کے زمانے کے اربابِ اعتبار بھی اس بات کو مانتے تھے اور وہ سب لوگ جو خوش ذوقی سے محروم نہیں اور تنگ نظری سے بے تعلّق رکھتے ہیں، ایسے لوگ ہر زمانے میں اس بات کو مانیں گے۔ "یادگارِ غالب" کے پہلے حصے کا حاشیہ نگار اِس پورے واقعے کے ذیل میں اِس ضمنی بات کو بھی شاملِ تحریر کرلے گا تو یہ بہتر ہوگا کہ اِس طرح ایک قابلِ توجہ پہلو روشنی میں

آجائے گا۔

مولانا حالی نے وضاحت کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ ایک شخص پارسی نژاد جس کا اصلی نام "ہرمزد" تھا اور اسلامی نام عبدالصمد، وہ آگرے میں اور پھر دلی میں مرزا صاحب کے ساتھ دو برس تک مقیم رہا تھا۔ "میرزا نے اُس سے فارسی زبان میں کسی قدر بصیرت پیدا کی" (ص ۱۴)۔ اِس کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ مرزا صاحب کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ "عبدالصمد" محض ایک فرضی نام ہے۔ مولانا عرشی، قاضی عبدالودود اور مالک رام صاحب کی تحریریں اِس بحث سے متعلق موجود ہیں۔ قاضی صاحب اور عرشی صاحب دونوں یہ مانتے ہیں کہ عبدالصمد وجودِ خارجی سے محروم تھا، وہ مرزا صاحب کے ذہن کی تراشی ہوئی ایک شکل ہے اور یہی بات درست معلوم ہوتی ہے۔ بہ ہر طور، ایک مفصل حاشیے میں اِس سے متعلق تحریروں کے ضروری اجزا کو یک جا کر دیا جانا چاہیے۔ ساتھ ہی ان مختلف اجزا کا تجزیہ کر کے صحیح صورتِ حال معلوم کرنے کی کوشش کی جانا چاہیے۔ اس سلسلے کی یہ دو باتیں ہمیں معلوم ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایک مالک رام صاحب کے سوا باقی اربابِ نظر نے جنھوں نے اِس موضوع پر مضامین لکھے ہیں، یہ مانا ہے کہ مرزا صاحب کی مصلحت اندیشی نے معترضوں کا منہہ بند کرنے کے لیے اِس وجودِ ذہنی کی تشکیل کی تھی، اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ مالک رام صاحب ہر طرح کی روایتوں کو بہ آسانی قبول کرلیا کرتے تھے۔ اُن کی کتاب "تذکرۂ ماہ وسال" میں اور تذکرۂ معاصرین کی چاروں جلدوں میں جو بے شمار غلطیاں ہیں، اُس کی بڑی وجہ اُن کی یہی کم زوری ہے۔

اپنے کمال اور خاندانی وقار کا احساس مرزا صاحب کے ذہن میں ہمیشہ رہتا تھا۔ دوسری طرف اُن کی کبھی نہ ختم ہونے والی معاشی ضرورتیں تھیں جو مصلحت پسندی پر آمادہ کر دینے کے لیے ہمہ وقت کارفرما رہا کرتی تھیں۔ اِس طرح کشاکش کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ وجود میں آگیا تھا۔ مرزا صاحب دُنیاوی معاملات میں خاصے مصلحت شناس تھے،

مگر جذبۂ بے اختیارِ شوق کے دباؤ کے تحت کبھی کبھی یہ عالم نمایاں ہو جاتا تھا کہ سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا۔ قیامِ لکھنؤ کا واقعہ اِس کی بہترین مثال ہے اور اِسی لیے اِس واقعے کو اُن کے سوانح میں خاص اہمیت حاصل ہے۔

مولانا حالی نے لکھا ہے

"جب مرزا نے دلی سے کلکتے جانے کا ارادہ کیا تھا، اُس وقت راہ میں ٹھہرنے کا قصد نہ تھا، مگر چوں کہ لکھنؤ کے بعض ذی اقتدار لوگ مدت سے چاہتے تھے کہ مرزا ایک بار لکھنؤ آئیں، اِس لیے کان پور پہنچ کر اُن کو خیال آیا کہ لکھنؤ بھی دیکھتے چلیں۔ اُس زمانے میں نصیر الدین حیدر فرماں روا اور روشن الدولہ نائب السلطنت تھے۔ روشن الدولہ کے یہاں بہ عنوانِ شایستہ اُن کی تقریب کی گئی لیکن مرزا صاحب نے ملاقات سے پہلے دو شرطیں ایسی پیش کیں جو منظور نہ ہوئیں۔ ایک یہ کہ نائب میری تعظیم دیں۔ دوسرے نذر سے مجھے معاف رکھا جائے" (ص ۲۷)۔

"یادگارِ غالب" کے حاشیہ نگار کے لیے اِس بیان میں چار باتیں خاص طور پر توجہ طلب ہیں۔ اِن میں دو تصحیحات ہوں گی، ایک اضافہ ہوگا اور ایک وضاحت ہوگی۔ حالی نے اِس اہم واقعے کے ذیل میں کہیں بھی تاریخ نہیں لکھی، کہ یہ کب کا واقعہ ہے۔ سند کا تعین ضروری تھا۔ سفرِ کلکتہ کے سلسلے میں تاریخوں کے تعین پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ یہ ضروری ہوگا کہ اِس بیان سے متعلق حاشیے میں لکھنؤ میں مرزا صاحب کے ورود اور پھر وہاں سے کلکتے کی طرف جانے کی تاریخوں کا تعین کیا جائے۔

حالی نے لکھا ہے "اُس زمانے میں نصیر الدّین حیدر فرماں روا اور روشن الدّولہ

نائبُ السلطنت تھے"۔ دیگر شواہد کے سوا خود مرزا صاحب کا قول موجود ہے کہ اُن دنوں معتمدالدّولہ وزیرِ اعظم تھے

لائی ہے معتمدالدّولہ بہادر کی اُمید
جادۂ رہ، کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اُس زمانے میں نصیرالدین حیدر نہیں، غازی الدّین حیدر فرماں روا تھے۔ حاشیے میں اِس کی وضاحت ضروری ہے اور یہ بھی کہ جب معتمدالدّولہ سے ملاقات نہ ہو سکی، تو مرزا صاحب نے منقولۂ بالا مصرعے کو بدل دیا۔ متداول دیوان میں یہ مصرع اس شکل میں ملتا ہے، لیے جاتی ہے کہیں ایک توقّع غالب۔

حالی کے لکھنے کے مطابق مرزا صاحب کو کان پور پہنچ کر یہ خیال آیا کہ لکھنؤ بھی دیکھتے چلیں۔ حالی کے اِس بیان سے اختلاف کیا گیا ہے۔ مالک رام صاحب نے مرزا صاحب کی طویل فارسی عبارت کے حوالے سے لکھا ہے کہ میں کان پور پہنچ کر سخت بیمار ہو گیا۔ چوں کہ کان پور میں مناسب علاج کا انتظام نہیں تھا، یوں اُسی بیماری کے عالم میں لکھنؤ آ گیا۔ لکھنؤ میں وہ کئی مہینے مقیم رہے تھے، اِس سے بہ ظاہر مرزا صاحب کے قول کی تائید ہوتی ہے، مگر ایک یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کیا لکھنؤ پہنچ کر مرزا صاحب کو خیال آیا کہ فرماں روائے اودھ کی مدح میں قصیدہ لکھنا چاہیے؟ کئی اُمور بہ ظاہر اِس پر دلالت کرتے ہیں کہ مرزا صاحب جب دہلی سے چلے ہیں، تو لکھنؤ میں قیام کا اور فرماں روائے ملک سے ملنے کا خیال اُن کے ذہن میں موجود تھا۔ حاشیے میں اِن سب باتوں پر روشنی ڈالی جانا چاہیے۔

اِس واقعے کے سلسلے میں ایک ذیلی سوال اور پیدا ہوتا ہے جو اہمیت سے خالی نہیں اور حاشیہ نگار کے لیے خاص طور پر نظر طلب ہے۔ مرزا صاحب اپنے ہی الفاظ میں اُن دنوں مصیبت، بے بسی اور قرض کے افسوس ناک حالات میں مبتلا تھے۔ دربارِ اودھ سے

یافت کی توقع ہو سکتی تھی اور یہ بات اُن کے ذہن میں تھی۔ اُنہوں نے نائب السلطنت کی مدح میں نثر لکھی، شاہِ وقت کی مدح میں قصیدہ لکھا، یعنی قاعدے کے مطابق حُسنِ طلب کا پورا اہتمام کرلیا۔ یہ ایک پہلو تھا۔ دوسری طرف مرزا صاحب کا احساسِ برتری تھا، جس کی بنیاد تین نقطوں پر قائم تھی شاعرانہ کمال، خاندانی وقار اور دہلی سے نسبت جو اُس مغل سلطنت کا مرکز تھا جہاں سے اودھ کی حکومت کو سندِ حکومت ملتی رہی تھی۔ مرزا صاحب نے جو اِس پر اصرار کیا کہ مجھے نذر پیش کرنے سے معاف رکھا جائے اور یہ کہ نائبُ السلطنت کھڑے ہو کر میری پذیرائی کریں، غالباً یہ اِسی احساس کا شاخسانہ تھا۔ نذر پیش کرنے کا مطلب ہوتا ہے زیردستی کا اعتراف اور اعلان، اور مرزا صاحب اِس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ اُن کا ذہن اِس حقیقتِ واقعہ کو نہیں قبول کرسکا کہ اب دربارِ اودھ پچھلے دنوں کی طرح نواب وزیر کا دربار نہیں، ایک بادشاہ کا دربار ہے اور آغا میر اُسی بادشاہ کے وزیرِاعظم ہیں۔ مرزا صاحب اُس نئی صورتِ حال سے واقف تو تھے، مگر ان کا ذہن اُس کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مرزا صاحب کے الفاظ میں ''گداطبع سلطان صورت'' آغا میر مرزا صاحب کی دونوں شرطیں ماننے کے لیے تیار نہیں ہوا اور وہ بہ قولِ خود اِس سے کم کو ''آئینِ خویشتن داری'' کے خلاف خیال کرتے تھے۔ یہ واقعہ ایک مفصّل حاشیے کا طلب گار ہے۔

مرزا صاحب نے اردو میں خط لکھنا کب سے شروع کیا، اِس سلسلے میں مولانا حالؔی کا بیان یہ ہے ''معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط کتابت کرتے تھے''۔ اِس کی ایک وجہ بھی اُنہوں نے لکھی ہے۔ پچھلے پچاس برسوں میں اِس سلسلے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اِس سے متعلق مفصّل، حاشیہ لکھا جانا ضروری ہے جس میں اِس مبحث سے متعلق دست یاب تحریروں کے ضروری اقتباسات کو یک جا کر کے، اُن کا جائزہ لے کر بعض اُمور کا تعین کیا جاسکتا ہے یا نشان دہی کی جاسکتی ہے۔

اِن چند مقامات کا حوالہ اِس وضاحت کے لیے کافی ہوگا کہ اِس کتاب کے پہلے

حصے کا ایک نیا اڈیشن مرتب کیا جانا کس قدر ضروری ہے اور یہ کہ حواشی کا انداز کیا ہوسکتا ہے۔ ادب کے عام خوش ذوق قارئین کے لیے، طالب علموں کے لیے اور بیش تر اساتذہ کے لیے یہ نیا اڈیشن ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں ہوگا۔

نثار احمد فاروقی

مولانا الطاف حسین حالی: قدامت اور جدت کے درمیان

مولانا الطاف حسین حالی اُس وقت پیدا ہوئے جب مغلوں کی برائے نام حکومت کے آخری بیس سال بچے تھے۔ وہ ایک متوسط گھرانے کے فرد تھے اور بچپن ہی میں حصول تعلیم کے شوق میں پانی پت سے پیدل چلتے ہوئے دلی آگئے تھے۔ زوال و انحطاط کا چکر تو پورا ہو چکا تھا مگر پھر بھی اُس وقت کی دلی میں ایسے باکمالوں کی آخری محفل سجی ہوئی تھی کہ زمین پر اس کہکشاں کو دیکھ کر بقول محمد حسین آزاد فلک کو بھی رشک آتا ہوگا۔ یہاں غالبؔ تھے، مومنؔ اور ذوقؔ تھے۔ مفتی صدرالدین آزردہؔ اور امام بخش صہبائی تھے، سب سے پہلے نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہؔ نے اُن کی دستگیری کی اور اپنے بچوں کا اتالیق بنا دیا۔ حالی نے عربی فارسی اور دینیات کی رسمی تعلیم حاصل کی تھی، غالب اور شیفتہ کی صحبت نے ان کے علمی اور ادبی ذوق کو توانائی بخشی، شعر گوئی، شعر فہمی اور تصنیف و تالیف کی طرف راغب کیا۔ مرزا غالب سے وہ اپنی نوجوانی کے زمانے میں ملے تھے اور زیادہ استفادہ اُن سے نہیں کر سکے تھے۔ بلکہ انہوں نے کبھی موقع پا کر مناسب لفظوں میں غالب کی شراب نوشی وغیرہ کے بارے میں انہیں کچھ نصیحت بھی کی۔ مرزا غالب خود اپنے آپ کو "سقر مقر" اور "ہاویہ

راویہ" لکھتے تھے، اپنے گناہوں کا اقرار کرتے تھے اور اُن سے پشیمان بھی تھے۔ وہ شاید اس نصیحت کا برا نہ مانتے مگر دونوں کی عمروں میں ۴۲ برسوں کا فرق تھا۔ اس زمانے کے اخلاقی معیار یہ گوارا نہ کر سکتے تھے کہ ایک نوجوان اپنے "سترے بہترے" بزرگ کا دانش آموز بنے۔ اس لیے غالب ان سے کچھ زمانے تک رنجیدہ بھی رہے۔ آخر حالی نے معافی تلافی کر کے انہیں ہموار کر لیا۔ یہاں اس واقعے کے اظہار سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اپنی تربیت اور ابتدائی ماحول کے زیر اثر مولانا حالی وضع قدیم سے جڑے ہوئے تھے۔ وہ اباحت اور آزادگی کے قائل نہ تھے، اسلامی اخلاقی قدروں کے قدردان، اور مذہبی ذہن کے مالک تھے۔ انہوں نے شاعری شروع کی تو اُن کے سامنے اُردو کے اساتذۂ متقدمین کا کلام تھا۔ اس نہج پر انہوں نے شعر کہے جو اُن کے دیوان میں موجود ہیں اور بہت سے اشعار وہ ہیں جو اب ضرب المثل بن کر زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں، مثلاً

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں
حالی نشاط نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقت صبح رہے رات بھر کہاں

یا یہ اشعار

اُن کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت
کس سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گل تر کی صورت

یہاں ایک دلچسپ واقعہ یاد آ گیا۔ اینگلو محمڈن کالج علی گڑھ میں مشاعرہ تھا۔ اس میں مولانا حالی بھی تشریف لائے تھے۔ اُس وقت امرو ہے کے ایک نوجوان داؤد عباسی اس

کالج کے طالب علم تھے یہ مزاحیہ اشعار بھی لکھتے تھے۔ انہوں نے مولانا حالی کی اس غزل کی پیروڈی لکھی اور مشاعرے میں مولانا حالی کی موجودگی میں پڑھی۔ مقطع کی پیروڈی یوں کی تھی

جب کسی کام کا کرتا ہے ارادہ انسان
دیکھ لیتا ہے وہ اُس کا م کے ہے بھی شایاں
سن کے لوگوں سے وہ کل آئے تھے داؤد کے ہاں
اُن کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

مولانا حالی یہ پیروڈی سن کر بہت خوش ہوئے، طالب علم کو داد دی اور اپنے دیوان کا ایک نسخہ دستخط کر کے انہیں بطور انعام دیا۔ یہ نسخہ داؤد عباسی کے چھوٹے بھائی محمود احمد عباسی کے پاس تھا۔

مولانا حالی نے اپنی تصنیف و تالیف کے ابتدائی زمانے میں سفرنامۂ ناصر خسرو بھی اپنے مقدمے کے ساتھ چھپوایا تھا۔ ناصر خسرو سے انہیں کیا ذہنی مناسبت تھی اور انہوں نے اس کے سفرنامے کی اشاعت کا اہتمام کیوں کیا یہ بجائے خود غور و فکر کا موضوع ہے۔

مولانا حالی نے نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا۔ ان کے مقالات بھی دو جلدوں میں شائع ہوئے، خطوط بھی چھپے، انہوں نے شیخ سعدی کی حیات و تصانیف پر بھی ایک کتاب لکھی، مگر ان کی نثری تصانیف میں جو عام طور پر بہت مقبول ہوئیں اور جن پر مولانا حالی کی شہرت و عظمت کا دارومدار ہے، ان میں مرزا غالب کی حیات اور فکر و فن پر ان کی پہلی باقاعدہ تصنیف یادگارِ غالب، سرسید احمد خاں کی سوانح عمری حیات جاوید اور ان کے دیوان کا مقدمہ بہت اہم ہیں۔ یہ مقدمہ اب الگ کتاب بن گیا ہے اور اسی حیثیت سے اس کو پڑھا جاتا ہے۔

مولانا حالی کی جوانی ہی میں انگریزی سامراج کی گرفت مضبوط ہو چکی تھی۔
میکالے رپورٹ کے بعد ورنا کیولر اسکول اور کالج قائم ہونے لگے تھے۔ ساتھ ہی انگریزی زبان سے کچھ کتابوں کے ترجمے ہو کر آنے لگے تھے، جس میں نیچرل پوئٹری کے نمونے بھی تھے اور بعد میں اس نہج پر انجمن پنجاب نے موضوعاتی مشاعرے شروع کر دیے تھے جس کے لیے محمد حسین آزاد اور حالی نے بھی نظمیں لکھیں۔ یہ عوامی تحریک تو نہ بن سکی مگر ایک اچھا آغاز ہوا، جس کے بعد بہت سی موضوعاتی اور بیانیہ نظمیں لکھی گئیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ناکام ہو جانے کے بعد سر سید نے بہت دور اندیشی سے مستقبل کا نقشہ بنایا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ روایتی فکر کا ایک حصہ قطعاً فرسودہ و ناکارہ ہو چکا ہے جس نے صحت مند فکر کے سوتے بند کر دیے ہیں، اب مغربی تعلیم کا رواج ہوگا اور اس کے ساتھ مغربی فکر بھی آئے گی، تہذیب و ثقافت بھی، ہم اپنی قدیم روایات سے چمٹے رہ جائیں گے اور نئی رفتار ترقی کا ساتھ نہ دے سکیں گے جس کے لیے رواجی تعلیم سے ہٹ کر عقلیت پسندی کی ضرورت ہے۔ سر سید احمد خاں اپنے منصوبے میں کامیاب ہوئے اگر چہ مسلمانوں کے بڑے طبقے نے ان کی مخالفت کر کے اس کی رفتار کو سست رکھا مگر جو حقیقت پسند اور دور اندیش لوگ تھے انھوں نے سر سید کی دعوت پر لبیک کہا اور ان کے مشن کو آگے بڑھانے میں ان کی معاونت کی۔ ان میں مولانا الطاف حسین حالی کا نام بھی نمایاں ہے۔

اس دور آخری میں جب یوں بگڑ چلے تم	اک ہاشمی تمہارا مصلح کھڑا کیا ہے
سرسبز چاہتا ہے جو قوم کو جہاں میں	فتووں سے قوم کے گو کافر ٹھہر چکا ہے
وقت اپنا کام اپنا جان اپنی مال اپنا	یاروں پہ جس نے سب کچھ قربان کر دیا ہے
دار اُس پہ قوم کے ہیں وہ قوم کی سپر ہے	قوم اس سے بدگماں ہے، وہ قوم پر فدا ہے
تعلیم کی تمہاری بنیاد اس نے ڈالی	ملکوں میں جس کا چرچا ہر سمت ہو رہا ہے

ایک طرف اُن کی نظر میں اسلامی تہذیب و اخلاقیات کا سرمایہ تھا، ایک ہزار سال میں علوم و

معارف کا بھرپور خزانہ تھا، دوسری طرف انہوں نے مغل حکومت کا عبرت انگیز انجام اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، وہ ایک دردمند دل رکھنے والے انسان تھے۔ انسانیت کی اعلیٰ اقدار پران کا ایمان پختہ تھا اوران قدروں کا زوال دیکھ کروہ خون کے آنسو رو رہے تھے اسی جذبے نے انہیں یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ ہماری قوم صرف شعروشاعری میں مست ہے اوراس میں بھی کوئی مثبت فکر نہیں، کوئی تعمیری جذبہ نہیں، کوئی خیراندیشی یا اصلاح کا پہلو نہیں، کچھ ٹکے بندھے، گھسے پٹے مضامین ہیں جنہیں ہر شاعر اپنی ہمت اور توفیق کے مطابق باندھے چلا جاتا ہے۔ شاعری میں کچھ کردار ہیں جیسے عاشق، معشوق، رقیب، ناصح، شیخ، زاہد، محتسب وغیرہ، ان کو کارٹون بنا کر رکھ دیا ہے۔ کچھ علامتیں اور استعارے اور تشبیہات ہیں جن کی لوٹ پھیر سے مضامین تراشے جارہے ہیں۔ ان میں نہ تازگی ہے نہ طرفگی، نہ یہ کسی قوم کی تعمیر وترقی میں کوئی رول ادا کرسکتے ہیں۔ اسی نظریے سے انہوں نے اپنے دیوان کا مقدمہ لکھا جو اردو میں تنقید کے نظری مبحث کا پہلا نمونہ ہے۔ یہ غنیمت ہے کہ مولانا حالی نے اپنے دیوان سے روایتی شاعری کے حصے کو یکسر خارج نہیں کیا ورنہ ہم ان کی شاعری کے اس رنگ سے بے بہرہ رہ جاتے۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ حالی اگر روایتی شاعری کی مخالفت کریں اور شاعری میں پیروی مغربی کا اعلان کرکے اس کے کچھ نمونے بھی پیش کریں تو اس کا فوراً کوئی پائیدار نتیجہ ظاہر ہو۔ لیکن یہ بارش کے پہلے قطرے والی بات تھی۔ اگر حالی اس فرسودہ شاعری کی مخالفت نہ کرتے تو شاید علامہ اقبال بھی پیدا نہ ہوتے اوران کی شاعری نے جو پیغام دیا وہ ہمیں نہ ملتا۔ مولانا حالی بنیادی طور پر قدامت کے پروردہ ہیں مگر ان کو جدت کا اور عہد جدید کا نقیب سمجھنا چاہیے۔

حالی کی فکرونظر کے دو پہلو بہت اہم ہیں ایک یہ کہ وہ مسلمانوں میں تعلیم کو عام دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے فقدان سے رنجیدہ ہیں۔ دوسرے وہ معاشرت کی خراب رسموں سے دل برداشتہ ہیں۔ انہوں نے پیروں، واعظوں، مولویوں اور جھوٹے پندار میں

مبتلا لوگوں کی خوب خبر لی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ لوگ زمانے کی بدلتی ہوئی حالت کو دیکھیں اور مستقبل میں کیا پیش آنے والا ہے اس کا احساس کریں، فضول رسمیں، توہمات، اسراف، ناچ رنگ، عیش و عشرت میں مگن رہنا یہ سب قوم کے ادبار کی علامتیں ہیں

دیکھو جس سلطنت کی حالت درہم
سمجھو کہ وہاں ہے کوئی برکت کا قدم
یا تو کوئی بیگم ہے مشیر دولت
یا ہے کوئی مولوی وزیر اعظم

حالی کی تجدید و اصلاح میں اخلاص اور نیک نیتی تو ہے، انتہا پسندی نہیں ہے۔ وہ اصلاح کو بھی اعتدال کے ساتھ نافذ کرنے کے حق میں تھے

دھونے کی ہے اے رفارمر جا باقی
کپڑے پہ ہے جب تلک کہ دھبا باقی
دھو شوق سے دھبے کو پہ اتنا نہ رگڑ
دھبا رہے کپڑے پہ نہ کپڑا باقی

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حالی قدامت و جدت کے بین بین چل رہے تھے۔ اگر وہ انتہا پسند ہوتے تو ایک نئے فرقے کے بانی بن جاتے جیسا کہ ہمارے بعض رفارمر ہو گئے۔

مختار الدین احمد

حالی کی چند کمیاب تصانیف

بیس پچیس سال پہلے کی بات ہے کہ ایک ادبی صحبت میں جناب مالک رام صاحب سے میں نے رحمت قطبی صاحب کا نام سنا۔ معلوم ہوا وہ دہلی کے رہنے والے ہیں، یہیں کی ایک قدیم خانقاہ کے سجادہ نشیں ہیں اور قدیم اور نادر ذخیرۂ مخطوطات و مطبوعات کے مالک ہیں۔ ان سے ملنے اور ان کا ذخیرۂ کتب دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ غالب سے دلچسپی رکھنے والے لالا پرتھوی چند سے ذکر آیا وہ میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے۔ پرانی دہلی کے ایک پر ہجوم محلے میں ایک سنسان کمرے میں کتابوں کے درمیان ایک خاموش آدمی کو بیٹھا پایا۔ معلوم ہوا یہی رحمت قطبی صاحب ہیں۔ ان کی درگاہ کے بارے میں جس کے وہ متولی تھے کچھ باتیں ہوئیں، پھر میں نے روئے سخن ان کے ذخیرۂ کتب کی طرف پھیرا۔ انہوں نے بہت کم وقت میں چابک دستی سے بہت سی کتابیں دکھائیں اور متعدد آثار و تبرکات کی زیارت کرائی۔ سرسید کے آٹھ دس قدیم غیر مطبوعہ مکتوبات تھے، مؤلف فرہنگ آصفیہ منشی سید احمد دہلوی کے کچھ خطوط، تحریریں اور فرہنگ کے مسودات کے کچھ اوراق تھے اور کچھ اسی طرح کے نوادر۔ مطبوعات میں شکسپیر اور فالن کی ڈکشنریاں، کچھ اردو لغات، فارسی و اردو

کے کچھ قدیم دواوین۔ ایک مجلّد کتاب انہوں نے دکھائی جس میں خواجہ الطاف حسین حالی کے کسی عقیدت مند نے ان کی کچھ قدیم تصانیف ایک ساتھ مجلد کرادی تھیں۔ اس سے میری دلچسپی دیکھتے ہوئے انہوں نے میری روانگی کے وقت یہ کتاب ساتھ کردی۔ میں نے قیمت پوچھی بولے قیمت پھر کبھی طے ہوجائے گی، آپ کو اطلاع کردوں گا۔ یہ اطلاع آج تک نہ آئی۔ مجھے میرٹھ کے ایک مطبع سے جس کا تعلق میرزا غالب سے رہا تھا 'عود ہندی' طبع اول کے بہت سے نسخے حاصل ہوئے تھے جو غالب کی زندگی میں چھپے تھے اور نہایت نادر تھے۔ ان میں سے ۱۶۱ نسخے مالک رام صاحب سے مشورے کے بعد میں نے رحمت قطبی صاحب کے حوالے کردیے، پھر پلٹ کر ان کے بارے میں کبھی نہیں پوچھا۔

آج کی صحبت میں اس مجلّد کے مشمولات پر گفتگو مقصود ہے۔ اس میں حالی کے سات نظم ونثر کے رسائل ہیں

۱۔ مولود شریف

سلسلۂ مطبوعات تصانیف حالی کی یہ پہلی کتاب ہے جو خواجہ فرزند علی کے اہتمام میں حالی پریس پانی پت سے ۱۳۴۲ھ میں چھپی، صفحات ۹۸ قیمت؟؟

سرورق کی پشت پر حالی پریس پانی پت کے قیام کے بارے میں حالی کے نواسے خواجہ فرزند علی کی حسب ذیل تحریر ہے "ایک عرصے سے پانی پت میں ایک مطبع جاری کرنے کی ضرورت محسوس ہورہی تھی۔ مولانا حالی کی زندگی میں ان کے دوست جناب مولانا وحیدالدین صاحب سلیم نے ایک مطبع اس نام کا جاری کیا تھا جو چند سال نہایت مفید کام کرنے کے بعد بند ہوگیا۔ اب میں نے اپنے نانا صاحب (مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی) مرحوم ومغفور کی یادگار میں ایک نیا مطبع بنام حالی پریس جاری کیا ہے۔ اس کا مقدم مقصد یہ ہے کہ مولانا حالی مرحوم کی تمام تصانیف ایک سلسلے کی صورت میں اور ایک تقطیع پر چھپوائی جائیں اور ان کی تصحیح کا پورا اہتمام کیا جائے "

اس کے بعد ان ۹ کتابوں کا اشتہار ہے جو اس وقت تک سلسلۂ تصانیف حالی میں چھپ چکی تھیں مولود شریف، مجالس النساء، مجموعۂ نظم حالی، بیوہ کی مناجات، مثنوی حقوق اولاد، شکوہ ہند، چپ کی داد، ضمیمۂ کلیاتِ نظم اردو مقدمۂ شعر و شاعری۔ پھر زیر طبع کتابوں کے نام اور ان کی مختصر کیفیت ہے۔ یہ حسب ذیل ہیں مکتوبات حالی، تریاق مسموم، مسدس حالی، حیات سعدی، سوانح عمری حکم ناصر خسرو، یادگار غالب، حیات جاوید اور دیوان حالی۔ یہ سب سترہ کتابیں ہیں۔

مولود شریف جو ۱۸۷۰ء سے پہلے تصنیف ہوئی کسی وجہ سے مولانا حالی کی زندگی میں شائع نہ ہوسکی۔ کتاب سے پہلے حالی کے صاحبزادے سجاد حسین کی لکھی ہوئی دو صفحوں کی تمہید ہے بعض ضروری عبارات یہ ہیں

"حال ہی میں والد مرحوم کے کاغذات میں ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا مجلد مسودہ مولود شریف کا دستیاب ہوا جو نقل کر کے مطبع کے سپرد کیا گیا۔ مسودے کے آخر میں مولانا مرحوم کے دستخطی یہ الفاظ ہیں کاتبہ، ومؤلفہ، محمد الطاف حسین عُفی عنہٗ" اگرچہ والد مرحوم کے تصنیف و تالیف کے کام سے مجھے اکثر آگاہی رہتی تھی لیکن مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی مولود شریف کا مسودہ دیکھا ہو اگرچہ اس بات کے قوی قراین ہیں کہ اس کی تالیف ۱۸۷۰ سے پہلے ہو چکی تھی۔ موصوف کی زندگی میں مولود شریف کے نہ چھپنے کے دو سبب ہو سکتے ہیں اول تو غالباً کتاب چھپنے کا انتظام نہ ہو سکا ہو اور اس کے کچھ عرصہ بعد تعجب نہیں یہ خیال مانع ہوا ہو کہ ولادت شریف کے متعلق جو روایات لکھی گئی ہیں اور جس پیرایے میں ان کو تالیف کیا گیا ہے وہ اس زمانے کے مناسب حال نہیں ہیں اور اسی وجہ سے ایک دوسری اور مبسوط سیرت لکھنے کا انہیں اخیر عمر تک خیال رہا مولود شریف جس کو تالیف ہوئے پچاس برس سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے اور جو غالباً والد مرحوم کی اولین تصنیف ہے بہت پس و پیش کے بعد تبرکاً و تیمناً پبلک کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس کتاب سے معلوم ہوگا کہ مؤلف مرحوم کو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے عشق تھا اور اس عشق کی وجہ سے ان کا دل امت

محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی غمخواری سے تمام عمر لبریز رہا اور دم واپسیں تک اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس جذبے کی بدولت ان کے کلام میں غیر معمولی اثر تھا اور یہی وہ چیز تھی جو عمر بھر ان کے افعال واقوال کی محرک اور رہبر رہی اور جس نے اُن کو ایک اعلیٰ درجے کا نمونہ اخلاق اسلامی کا بنایا تھا"۔

اب ۱۸۷۰ء سے پہلے کی لکھی ہوئی خواجہ حالی کی نثر دیکھیے

سنو محبت وولائے رسول الثقلین کی بہت سی علامتیں ہیں انسان میں جب تک وہ سب علامتیں پائی نہ جائیں، اس نعمت عظمیٰ سے محروم ہے۔

اول ہر بات میں ہر کام میں آپ کی پوری پوری پیروی اور دل کی خواہشوں کو شرع کا تابعدار کر دینا اِن کنتم تحبّونَ الله فاتّبعونی یُحبِبکُمُ الله (اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری راہ چلو، تم کو اللہ دوست رکھے گا) اللہ اکبر۔ آدمی رسول مقبول کی متابعت سے محبوبیت کے مقام پر پہنچتا ہے۔

دوسری علامت یہ ہے کہ آپ کا ذکر جمیل اکثر زبان پر رکھے مَن اَحبّ شیاً اکثر ذکرہ (محبوب کو ہر وقت یاد رکھنا اس کا نام محبت ہے)۔ وللہ دَرّ القائل

شاید اس کا نام محبت ہے شیفتہ
ہے آگ سی جو سینے کے اندر لگی ہوئی

تیسری علامت یہ ہے کہ آپ کا ذکر شریف سُن کر مراسم تعظیم وتکریم بجالائے اور خضوع وخشوع اور عجز وانکساری کی صورت بن جائے جیسا آپ کے بعد صحابہ کا حال تھا کہ جب آنحضرت کا ذکر آتا بے اختیار رو پڑتے اور ان کے بدن پر نام پاک کی ہیبت سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور یہی حال تابعین وتبع تابعین کا تھا۔ اس طرح ہر حال میں آپ کی تعظیم وتکریم اور رعایت ادب جزو ایمان کیا بلکہ عین ایمان ہے۔ اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے اِنا اَرسلناك شاهداً و مبشراً و نذیراً لتؤمنوا بالله و تعزروه (ہم نے بھیجا کے تجھ کو اے محمد احوال بتانے والا اور خوشی اور ڈر سنانے والا تا کہ تم لوگ یقین کرو اللہ پر

اور اس کے رسول پر اور اس کی مدد کرو اور اس کا ادب رکھو) اور فرمایا یا ایھاالدین آمولاترمعوااصواتکم موق صوت السی و لاتحھروا له بالقول لحھر بعصکم بعصٍ اَن تحبط اعمالکم و اَنتم لاتشعرون (اے ایمان والو اونچی نہ کرو اپنی آوازیں نبی کی آواز سے اوپر اور اس سے نہ بولو کہک کر جیسے کہکتے ہو ایک دوسرے پر۔ کہیں اکارت نہ ہو جائیں تمہارے کیے اور تم کو خبر نہ ہو) کیا خوب کہا ہے کہنے والے نے

یا خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار۔

چوتھی علامت قرآن مجید کی محبت اور تعظیم و تکریم ہے ۔کوئی شے ایمان کی مضبوط کرنے والی قرآن پڑھنے اور قرآن سننے سے زیادہ نہیں۔

پانچویں علامت مسلمان بھائیوں کی خیر خواہی اور ان پر شفقت اور ان کی مشکلوں میں کام آنا۔

چھٹی علامت یہ ہے کہ آدمی، جانور، درخت، پتھر، شہر، مسجد، کنواں اور اسکے سوا جس شے کو حضرت کے ساتھ کچھ بھی نسبت اور لگاؤ ہو اس کی محبت اور تعظیم بعینہ آپ کی محبت اور تعظیم ہے۔"

کتاب کی زبان سادہ، عام فہم اور نثر خوبصورت اور دلکش ہے۔ کہیں کہیں عربی فارسی اور اردو شعر بھی ملتے ہیں، شیفتہ کا شعر اوپر گزرا۔ خود حالی کے شعر بھی ملتے ہیں

اس سے ہوتا ہے ظاہر عیار استعداد — محک ہے حُبِّ نبی دل کے امتحان کے لیے
خدا کی ذات کریم اور نبی کا خلق عظیم — گنہ کریں تو کریں رخصت انس و جاں کے لیے
شفاعت نبوی میں وہ برق عصیاں سوز — کہ حکم خس ہے وہاں کفرِ دو جہاں کے لیے

اگر نصیب ہو یثرب میں جا کے شربت مرگ — پیوں، آب بقا عمر جاوداں کے لیے
اگر بقیع میں گز بھر زمین میسر آئے — کروں نہ طول عمل، روضۂ جناں کے لیے

سمایا اس کا جو نقش قدم تصوّر میں ہجوم شوق میں بوسے کہاں کہاں کے لیے
نبی کا نام ہو وردِ زبان رہے جب تک سخن زباں کے لیے اور زباں دہاں کے لیے

کتاب کا خاتمہ مناجاتِ حالی پر ہے، چند سطریں اسکی بھی سنیے

''الٰہی تیرا کرم وسیع۔ تیری عنایت شامل۔ تیرا فیض عام۔ تیرے ہاتھ کشادہ۔ تیرا ملک بے زوال۔ تیرے خزانے بے حساب، تیری نعمتیں سرمدی۔ تجھ سے کیا کیا مانگیے اور کہاں تک مانگیے۔ تجھ سے دولتِ کونین پر راضی ہونا ایسا جیسے بحر قلزم سے پیاسا پھرنا، تجھ سے دنیا اور آخرت مانگنی ایسی جیسے خوان یغما سے بھوکا اٹھنا، تیرا گدا نہیں جو ہفت اقلیم کی سلطنت پر لات نہ مارے، تیرا بھوکا نہیں جو نعیم جنت کے لیے ہاتھ پسارے۔ جس نے تجھ سے تیرے سوا آرزو کی اس نے آرزو کرنی نہ جانی۔ جس نے تیرے ہوتے عرش اور ماورائے عرش پر خاک نہ ڈالی اس نے تیری قدر نہ پہچانی۔

الٰہی جس طرح اپنے شریک کو صفحۂ امکان سے مٹایا اسی طرح نقش غیر ہماری لوح خاطر سے محو فرما۔ الٰہی جس طرح ستاروں کو سورج کی روشنی میں کھپایا، اسی طرح ہم کو انوار ذات میں مضمحل کر۔ الٰہی وہ جلوہ دکھا جس کا حجاب اُسی کی یکتائی ہے، جس کی اوٹ دیدۂ تماشائی ہے۔ جو علم و ادراک کے پردوں میں مستور ہے، جس کا منشاے خفا غایت ظہور ہے۔ جس کا ملنا حوصلۂ توقع سے باہر ہے جو تقریر میں نہ آئے، جو تحریر میں نہ سمائے

وہ مانگتا ہوں جس کے بیاں سے زبان ہے لال
اے وائے گر روا نہ ہو مطلب فقیر کا

مجلد کی دوسری کتاب ''مضامین حالی'' ہے۔ یہ 'سلسلۂ سحر و اعجاز' کی پہلی کتاب ہے جسے مولوی وحید الدین سلیم نے پنجاب نیشنل ایجنسی پانی پت سے شائع کیا ہے۔ صفحات ۲۶۰ تاریخ طبع ندارد لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوسرا اڈیشن ہے۔ یہ مجموعہ حالی کے ۳۳ مضامین پر مشتمل ہے جو تہذیب الاخلاق، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ، ام اے او کالج میگزین،

معارف (علی گڑھ) اور اخبار رفیق ہند میں شائع ہوئے تھے۔ بیشتر مضامین تہذیب الاخلاق میں ۱۲۹۳ سے ۱۳۱۱ھ میں اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ رسالۂ انجمن مفید عام (قصور)، میں ۱۸۷۱ اور ۱۹۰۱ء کے درمیان انطباع پذیر ہوئے تھے۔ مرتب نے بعض مضامین ان کتابوں سے لیے گئے ہیں جن میں بطور دیباچہ یا تقریظ مولانا کی تحریریں چھپی ہیں۔ مثلاً مجموعے کا پہلا مضمون 'زبان گویا' تزک اردو حصۂ نثر (مطبوعہ آگرہ ۱۸۱۸ء) سے اور آخری مضمون معلم الشطرنج مولفہ راجا بابو مطبوعہ دہلی ۱۹۰۱ء سے لیا گیا ہے۔ حالی نے اس کتاب پر بہت دلچسپ ریویو لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس فن سے بھی دلچسپی تھی۔ حالی لکھتے ہیں

"جہاں تک مجھ کو معلوم ہے آج تک کوئی کتاب ہماری زبان میں شطرنج پر ایسی جامعیت کے ساتھ نہیں لکھی گئی اور اس فن کے متعلق اس قدر معلومات کا ذخیرہ کبھی جمع نہیں کیا گیا لیکن اس کتاب میں ایک بات کی کسر معلوم ہوتی ہے یعنی جبکہ اس میں بہت سے یوروپین، شاطروں کے کمال شطرنج بازی کا ذکر کیا گیا ہے تو تقضائے مقام یہ تھا کہ ہندستان کے نہایت نامور اور باکمال شاطروں کا بھی کسی قدر تذکرہ کیا جاتا۔ خصوصاً انیسویں صدی کے مشہور شاطر مثل کرامت علی خاں و میرزا رحیم الدین حیا و امام علی خاں وغیرھم ضرور اس بات کے مستحق تھے کہ جو کتاب ہندستان کی زبان میں ایک ہندوستان ہی کے ایجاد کے ہوئے کھیل پر لکھی جائے اس میں ان کی خاص خاص بازیوں اور نقشوں کا ذکر کیا جائے۔ لیکن حق یہ ہے کہ ہمارے لٹریچر میں کوئی ذریعہ ایسا موجود نہیں ہے جس سے ہندستانی شاطروں کی کسی بازی یا کسی نقشے کا سراغ لگانا ممکن ہو۔ جو شاطر مر گیا اس کی بازیاں اور اس کے نقشے اسی کے ساتھ مر گئے۔ البتہ ہمارے عزیز دوست راجا بابو صاحب نے اردو لٹریچر میں ایک ایسی مثال قائم کی ہے کہ اگر اس کی پیروی کی گئی تو ہمارے آیندہ شاطروں کے عمدہ عمدہ نقشے آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ رہ سکیں گے"۔

حالی، آگے لکھتے ہیں

"دلّی میں عبدالحکیم نامی ایک مشہور غائب باز تھا جس کو ہم نے خود حاضر و غائب دونوں طرح کھیلتے دیکھا ہے۔ اس کی نسبت یہ بات مشہور تھی کہ وہ حاضر بازی میں تو مات ہو جاتا ہے، مگر غائب بازی میں کبھی مغلوب نہیں ہوتا۔ لیکن آج اسکی بازی کا نقشہ بھی کسی کو یاد نہیں۔

'مضامین حالی' کے ۳۳ مضامین میں کچھ حسب ذیل ہیں زمانہ (جب زمانہ بدلے تم بھی بدل جاؤ)، تدبیر، الدین یسر"، مسلمان اور ترقی، ہم جیتے ہیں یا مر گئے؟، حسب اور نسب، مسلمانوں میں عملی قوت کیوں نہیں رہی، تجارت کا اثر عقل اور اخلاق پر، سلسلۂ (درس) نظامیہ میں اصلاح کی ضرورت اور اخبار نویسی اور اس کے فرائض۔

اس مجموعے میں حسب ذیل کتابوں پر حالی کے لکھے ہوئے تبصرے ہیں تاریخ ہندوستان (منشی محمد ذکاء اللہ)، ترجمۂ اقوام المسالک فی معرفۃ احوال الممالک (مولوی محمد اسمٰعیل اڈیٹر اخبار سین ٹیفک سوسائٹی، علی گڑھ)، نیرنگ خیال (محمد حسین آزاد دہلوی)، تذکرۂ آب حیات (محمد حسین آزاد)، سیرت نعمان (شبلی نعمانی)، فرہنگ آصفیہ (سید احمد دہلوی)، کلیات ڈلمیر (منور خاں ڈلمیر، رئیس میرٹھ) اور معلم الشطرنج (راجا بابو)۔

سرسید اور علی گڑھ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے حسب ذیل مضامین قابل مطالعہ ہیں

مولوی سید احمد خاں بہادر، مدرسۃ العلوم مسلمانان، سرسید احمد خاں اور مذہب، قرآن مجید میں اب تفسیر کی گنجایش باقی ہے یا نہیں؟۔

مضامین حالی میں حالی کا سفر نامہ "دورۂ ایام تعطیل، پڑھنے کے لائق ہے، یہ ان کے دہلی سے علی گڑھ، فیروز آباد، اٹاوہ، مین پوری، کانپور، ہمیر پور، آگرہ، الور کا مختصر سفر نامہ ہے جو ۱۸۸۰ء کے کسی مہینے میں انہوں نے کیا تھا۔

سفر نامے کی ابتدا ان سطروں سے ہوتی ہے

"ایام تعطیل میں دوستوں اور عزیزوں سے ملنے کی غرض سے ہم کو چند مقامات میں دورہ کرنے کا اتفاق ہوا۔ اول ہم دہلی سے علی گڑھ میں پہنچے اور جناب آنریبل سید احمد خاں بہادر کی کوٹھی پر ٹھہرے۔ اب کی دفعہ مدرسۃ العلوم کو ہم نے تیسری مرتبہ دیکھا۔ اُس کی روز افزوں ترقی دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا"

دورے کی روداد کا خاتمہ ان سطور پر ہوتا ہے

"ہم جناب ماسٹر سریرام صاحب کے جو مہاراجہ صاحب کے سکریٹری ہیں اور جناب ماسٹر گنج بہاری لال صاحب ہیڈ ماسٹر ہائی اسکول الور کے دل سے شکر گزار ہیں جن کی عنایت سے ہم نے الور کی خاطر خواہ سیر کی اور پانچ روز الور میں ٹھہر کر ہم رمضان کی انیسویں تاریخ دن کی ریل میں الور سے روانہ ہوئے اور شام کو دلّی میں پہنچ گئے"۔

اس مضمون بانیان مدرسۃ العلوم کے مذہبی اعتقادات اور رایوں کو مدرسۃ العلوم کی تعلیم میں کچھ بھی دخل نہیں ہے۔ یہاں تک کہ رسالہ تہذیب الاخلاق جو مطبع علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ سے چھپ کر شائع ہوتا ہے، اس کی کوئی کاپی مفت یا بقیمت کسی طالب علم کو نہیں دی جاتی۔

یہ مضمون اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ ۱۸۸۰ میں چھپا تھا۔ اس پر اڈیٹر کا حسب ذیل نوٹ دلچسپی سے پڑھا جائے گا

"معلوم ہوا ہے کہ مدرسۃ العلوم کے ریڈنگ روم میں مندرجہ ذیل اخباروں اور کتابوں کے آنے کی ممانعت ہے۔

۱۔ تہذیب الاخلاق اور وہ جو اس کے ردّ و قدح میں جاری ہیں۔

۲۔ وہ تمام اخبارات جو "پنچ" کے نام سے جاری ہیں۔

۳۔ فسانۂ آزاد جو اودھ اخبار کے ساتھ نکلتا ہے۔ (اودھ اخبار کی ممانعت نہیں ہے مگر جس میں کوئی مضمون بعنوان ظرافت چھاپا گیا ہو، اسکی ممانعت ہے)۔

۴۔ تفسیر القرآن، مؤلفہ سید احمد خاں۔

اس مجلد کی تیسری کتاب مجالس النساء جسے حالی نے عورتوں کی تعلیم کے لیے تالیف کیا تھا۔ اسے خواجہ فرزند علیؒ نے حالی پریس پانی پت سے ۱۳۴۲/۱۹۲۴ میں چھپوا کر دو حصوں میں شائع کیا۔ پہلے حصے میں پانچ اور دوسرے حصے میں چار مجلسیں ہیں۔ یہ مولانا مرحوم کی اولین تصنیف ہے جس میں لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے نظام کا خاکہ ایک نہایت دلچسپ قصے کے پیرایے میں کھینچا گیا ہے۔ دلچسپ اور مفید ہونے کے علاوہ آسان اور سنجیدہ اردو نویسی کا یہ کتاب عمدہ نمونہ ہے۔

چوتھی کتاب حقوق اولاد ہے اسے بھی خواجہ فرزند علی نے حالی پریس پانی پت سے شائع کیا ہے۔ سال طباعت ۱۳۴۲ ھ ہے۔ اس میں ایک باپ اور بیٹے کی گفتگو نظم کی شکل میں اولاد کی باقاعدہ تعلیم و تربیت نہ کرنے کے ہولناک نتائج ایک دلچسپ قصے کے پیرایے میں بیان کیے گئے ہیں۔

پھر اس مجلد میں حالی کی شکوۂ ہند، اور آخر میں عرض حال بجناب سرور کائنات علیہ افضل الصلوٰۃ و اکمل التحیات ہے۔ مسدس حالی کے درجے کی نہایت بے نظیر نظم جس کے پڑھنے سے مسلمانوں کے عروج و زوال اور ان کے تمام اخلاق فاضلہ کا سارا نقشہ آنکھوں کے آگے پھر جاتا ہے۔ اس میں تیرہ بند ہیں۔

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

مجموعے کی چھٹی اور ساتویں نظمیں ''مناجات بیوہ'' اور ''چپ کی داد'' حالی کی مشہور نظمیں ہیں۔ ''بیوہ کی مناجات'' میں ہندستان کی مجبور بیواؤں کی حالت زار کا نقشہ نہایت درد انگیز پیرایے میں کھینچا ہے اور ''چپ کی داد'' میں عورتوں کی عام اخلاقی خوبیوں مثلاً حیا و شرم، عفت و عصمت، صبر و تحمل، محنت و جفاکشی اور خدمت و طاعت وغیرہ کا بیان مناسب دلفریب و سلیس زبان میں نظم کیا گیا ہے۔

خلیق انجم

حالؔی کے سوانح

مولانا الطاف حسین حالؔی اردو کی ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت کا نام ہے۔ انھیں اگر اردو تنقید کا باوا آدم کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ انھوں نے اردو میں سوانح نگاری کا آغاز ہی نہیں کیا بلکہ آج تک وہ اردو کے اہم ترین سوانح نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اردو میں جن شاعروں کو نظمِ جدید کا موجد کہا جاتا ہے، ان میں ایک نمایاں اور ممتاز نام حالؔی کا بھی ہے۔ وہ فارسی کے عالم تھے اور عربی زبان سے بخوبی واقف تھے۔ اردو زبان کی کشتی کے کھیون ہار تھے۔ انھوں نے اصلاح پسند طبیعت پائی تھی۔ اس لیے اگر سرسیّد تحریک نے انھیں اپنے دامن میں لے لیا تو اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ ادب کی دنیا میں حالؔی کا سب سے بڑا ایثار یہ ہے کہ وہ اعلا پائے کے غزل گو کے منصب سے دستبردار ہوکر ''مدّو جزرِ اسلام''، ''مناجاتِ بیوہ'' اور ''چپ کی داد'' جیسی نظمیں لکھ کر اصلاحِ معاشرہ کے خشک میدان میں اُتر آئے۔ مکتوب نگاری اُن کے کلام کی ایک اور جولان گاہ ہے۔

حالؔی اردو کے جس دور میں پیدا ہوئے وہ نشاۃ الثانیہ کا دور تھا اور حالؔی صحیح معنوں میں

ایک RENAISSANCE ادیب تھے۔

اگر وہ کسی مغربی ملک میں پیدا ہوئے ہوتے تو ان کی شخصیت اور ادبی خدمات پر بلامبالغہ سینکڑوں کتابیں لکھی جاچکی ہوتیں۔ بدنصیبی ہے کہ حالی جیسے عظیم شاعر، نقاد اور سوانح نگار پر بس اتنی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ تمام کتابیں ایک الماری کے زیادہ سے زیادہ دو خانوں میں آجائیں گی۔ حالی کی تنقید پر تو خیر دو چار کتابیں اور خاصی تعداد میں اچھے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ لیکن ان پر تحقیقی کام بہت کم ہوا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حالی کی زندگی کے بہت کم حصے سے ہم لوگ واقف ہیں۔

حالی کے سوانح پر بنیادی مضمون خود حالی کا ہے، لیکن اتنا مختصر ہے کہ کل چودہ صفحات پر مشتمل ہے، ان چودہ صفحات میں تقریباً گیارہ صفحات پر سوانحی حالات ہیں اور باقی صفحات بھی حالی نے اپنی تصنیفات کی تفصیل بیان کی ہے۔ حالی میں اتنی خاکساری تھی کہ ان کے لیے اپنے حالات لکھنا ناممکن تھا۔ یہ مختصر سوانحی مقالہ اس لیے لکھا گیا کہ حالی نے دوسروں کی عظیم الشان سوانح عمریاں لکھیں۔ لیکن خود اپنی سوانح عمری کی طرف توجہ نہیں کی۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں اپنی سوانح عمری لکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے حالی جیسے مہذب اور منکسرالمزاج شخص کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے بارے میں کچھ لکھتے۔ حالی نے یہ مختصر مقالہ اس لیے لکھا تھا کہ ۱۹۰۱ء میں نواب عمادالملک بہادر کے ایک دوست نے لندن سے خط لکھ کر نواب صاحب سے فرمائش کی کہ وہ مولانا حالی کے سوانحی حالات فراہم کر کے انھیں بھیج دیں۔ نواب عمادالملک نے ڈاکٹر عبدالحق کے توسط سے مولانا حالی سے درخواست کی۔ مولانا حالی نے چودہ صفحات پر مشتمل مختصر ترین الفاظ میں اپنا سوانحی خاکہ لکھ کر بھیج دیا اس تحریر کے بارے میں حالی نے عبدالحق کے نام ایک خط مورخہ ۷رمئی ۱۹۰۱ء میں لکھا ہے۔

”نواب عمادالملک بہادر کی فرمائش جو بہت دن سے ہو رہی تھی۔ میں نے اس کی تعمیل کر دی ہے اور اپنا مختصر حال اور جو اُمور اس کے مطابق انھوں نے استفسار فرمائے تھے۔ بقدرِ ضرورت لکھ کر آج چار روز ہوئے ان کی خدمت میں بھیج چکا ہوں۔ اگر آپ سے کبھی ملاقات ہو تو اس کا ذکر کر دیجیے اور یہ بھی پوچھیے گا کہ جو اُمور آپ دریافت فرمانا چاہتے تھے وہ سب اس تحریر میں بیان ہو گئے ہیں۔ یا نہیں“ [1]

تحریر کو مطبوعہ دیوانِ حالؔی کے ذاتی نسخے کے ابتدائی اوراق پر لکھ لیا۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نے جب حالؔی کی کتاب ”مقالاتِ حالؔی“ شائع کی تو یہ تحریر بھی اُس میں شامل کر دی۔ یہ مختصر ترین سوانحی تحریر حالؔی کی زندگی کے بارے میں اہم مآخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہم لوگ حالؔی کی مداح سرائی تو بہت کرتے ہیں، ان کی بے معنی تعریف و توصیف میں الفاظ کا اپنا پورا خزانہ خالی کر دیتے ہیں۔ لیکن حالؔی پر کوئی بنیادی کام کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ حالؔی کی تقریباً بیشتر تصنیفات نایاب ہیں۔ ہمارے ادبی اداروں اور اردو اکیڈمیوں کو سیمناروں، مشاعروں اور مذاکروں سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ ایسے اہم کاموں کی طرف توجہ کریں۔

حالؔی پر اب تک گنتی کی جو کتابیں شائع ہوئی ہیں اور جن کے مطالعے کا مجھے موقع ملا ہے۔ اُن میں قابلِ ذکر کتابیں ہیں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کی تذکرۂ حالی (میں نے اس کتاب کا مطالعہ آٹھ دس سال پہلے کیا تھا۔ یہ مقالہ لکھتے ہوئے مجھے یہ کتاب نہیں مل سکی) سیماب اکبر آبادی کی حالاتِ حالؔی (اب یہ کتاب دستیاب نہیں ہے) صادق قریشی کی ذکرِ حالؔی۔ صالحہ عابد حسین کی یادگارِ حالؔی۔ چوں کہ صالحہ صاحبہ کا تعلق

خانوادۂ حالی سے ہے، اس لیے وہ حالی کی بے موقع اور بے وجہ مداح سرائی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جاتے دیتیں اور چوں کہ وہ افسانہ نگار ہیں، اس لیے انھوں نے اپنے اس فن کا استعمال "یادگارِ حالی میں بھی کیا ہے اس سب کے باوجود یادگارِ حالی کی اس اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ صالحہ عابد حسین نے بہت سی ایسی خاندانی روایتیں نقل کی ہیں جن کا واحد مآخذ یہی کتاب ہے۔ اس لیے میں نے زیرِ نظر مقالے میں اس کتاب سے محتاط طریقے سے استفادہ کیا ہے۔

حالی کے آباواجداد : مدینہ منورہ میں ایک چھوٹا سا گھر ہے۔ گھر کی دیوار پر ایک پتھر لگا ہوا ہے جس پر عربی میں کندہ ہے۔ "بیت ابوایوب انصاری"۔ مشہور ہے کہ آنحضرت رسول ﷺ جب مکّے سے مدینے ہجرت کرنے پر مجبور کیے گئے تو اس وقت مدینے میں ایسے لوگ بڑی تعداد میں تھے، جو اسلام قبول کر چکے تھے۔ مدینے کا ہر مسلمان چاہتا تھا کہ آنحضرت اس کے ساتھ قیام فرمائیں۔

اس خیال سے کہ اس مسئلے پر اہلِ مدینہ میں اختلافات نہ پیدا ہو جائیں، آنحضرت نے کسی ایک شخص کو ترجیح دینے کے بجائے ارشاد فرمایا کہ "اُن کی اونٹنی جس گھر کے سامنے بیٹھ جائے گی، میں اسی کے گھر میں قیام کروں گا"۔ اونٹنی ایک نوجوان ابوایوب انصاریؓ کے گھر کے سامنے بیٹھ گئی[1] چناں چہ آنحضرت نے ابوایوب انصاریؓ کے ساتھ قیام فرمایا۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا شمار ممتاز صحابۂ کرام میں ہوتا ہے۔ آنحضرت کی وفات کے بہت سال بعد جب خلیفہ معاویہؓ بزنطینی علاقے فتح کرنے کے لیے فوجیں بھیجنے لگے تو انھوں نے سوچا کہ اگر کسی صحابی کو فوج کی قیادت کے لیے بھیجا جائے تو فوج میں جوش اور ولولہ پیدا ہو جائے گا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب صحابۂ کرام میں صرف ابوایوب انصاریؓ حیات تھے۔ باقی سب خدا کو پیارے ہو چکے تھے، اس لیے فوج کی قیادت کے لیے اُن سے درخواست کی

گئی۔ حضرت ابوایوب اتنے ضعیف ہو چکے تھے کہ ان کے لیے چلنا بھی ممکن نہیں تھا۔ اس لیے انھیں ایک پالکی میں بٹھا کر فوج کے آگے آگے لے جایا گیا۔ حضرت ایوبؓ نے فوج کے کمانڈروں سے کہا کہ میں مر جاؤں تب بھی میرے جنازے کو فوج کے آگے ہی رکھا جائے۔ کچھ دن بعد اُن کا انتقال ہوگیا اور ان کی وصیت کے مطابق اس مہم میں اُن کا جنازہ فوج کے آگے رکھا گیا۔ فوج بازنطین کے دارالخلافہ قسطنطنیہ تک پہنچ گئی، لیکن اس دفعہ اس علاقے پر فتح نہیں پا سکی اور فوج حضرت ایوبؓ کی لاش قسطنطنیہ سے باہر دفن کر کے واپس آ گئی کچھ عرصے بعد جب مسلمانوں نے اس علاقے پر فتح حاصل کر لی تو پہلا کام یہ کیا کہ حضرت ایوبؓ کی قبر پر مقبرہ تعمیر کر دیا۔

مولانا الطاف حسین حالؔی کو یہ شرف حاصل تھا کہ وہ حضرت ابوایوب انصاریؓ کی نسل سے تھے۔

خواجہ عبداللہ انصاری: بقول، صالحہ عابد حسین، خواجہ ابوایوب انصاریؓ کے ایک صاحب زادے حضرت عثمانؓ کے عہد میں کسی مہم کے سلسلے میں خراسان پہنچے اور ہرات میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ خواجہ عبداللہ انصاریؒ بہت ہی پارسا بزرگ تھے اور ایک عالمِ باعمل تھے۔ اسی لیے ان کے نام سے پہلے شیخ الاسلام لکھا جاتا ہے۔ حضرت خواجہ عبداللہ انصاری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھیں فنِ حدیث پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ وہ اپنے عہد کے ممتاز ادیب اور زبردست خطیب تھے۔ اپنے زہد و تقویٰ اور بزرگی کی وجہ سے پیر ہرات کے نام سے مشہور تھے۔ ان کی ساری زندگی تصنیف و تالیف میں گزری۔ خواجہ غلام السیّدین کی کتاب ''مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں'' کا دوسرا حصہ ''ذکرِ جمیل'' کے نام سے بیگم صالحہ عابد حسین نے لکھا تھا۔ اس حصے میں انھوں نے لکھا ہے کہ ایک مستند روایت یہ ہے کہ

''حضرت ابوایوب انصاریؓ کی کسی پڑپوتی کی شادی امام علی رضاؑ

کے صاحب زادے سے ہوئی تھی اور کیوں کہ حضرت ابوایوب انصاریؓ کے پوتے کی کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی اس لیے انھوں نے اپنے نواسے یعنی امام علی رضا کے پوتے کو متبنّیٰ بنا لیا۔ان کی نسل انہی امام زادے سے چلی ہے[۲]

شیخ ابوالکلام خواجہ عبداللہ انصاریؓ کے بارے میں فارسی اور اردو کے محقق پروفیسر نذیر احمد نے پہلی بار ایسی اہم بات کہی ہے، جس پر اس سے پہلے حالی کے محققوں اور نقادوں میں کسی کی نظر نہیں گئی تھی، پروفیسر نذیر احمد نے حالی کی انشا پردازی کی خصوصیت بیان کر کے لکھا ہے کہ ان کے مورثِ اعلی عبداللہ انصاری سہروردی تھے اور فارسی میں اس طرز کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ اقتباس قدرے طویل ہے، لیکن چوں کہ حالی کی انشا پردازی کے بارے میں یہ بات پہلی بار کہی گئی ہے اور پروفیسر نذیر احمد جیسے ممتاز محقق نے کہی ہے اس لیے میں پورا اقتباس نقل کر رہا ہوں۔

حالی کی انشا پردازی بھی بڑی قابلِ توجہ ہے، انشا پردازی کے لحاظ سے اردو میں وہ بہت اہم نظر آتے ہیں۔ ان کی طرزِ نگارش میں جو مسجع نثر ہے وہ بڑی پُرکشش ہے، ذیل میں اُن کے اس طرز کے نمونے پیش کیے جاتے ہیں، ان کا ایک مقالہ مناجات بہ درگاہ قاضی الحاجات ہے جس کے چند جملے اس طرح ہیں

"الٰہی تیرا کرم وسیع، تیری عنایت شامل، تیرا فیض عام، تیرے ہاتھ کشادہ، تیرا ملک بے زوال، تیرے خزانے بے حساب، تیری نعمتیں سرمدی، تجھ سے کیا کیا مانگیے اور کہاں تک مانگیے، تجھ سے دولتِ کونین پر راضی ہونا ایسا ہے جیسا بحرِ قلزم سے پیاسا پھر آنا، تجھ سے دنیا اور آخرت مانگنی ایسی ہے جیسے خوانِ یغما سے بھوکا لوٹنا، تیرا گدا نہیں جو ہفت اقلیم کی سلطنت پر لات نہ

مارے، تیرا بھوکا نہیں جو نعیمِ جنت کے لیے ہاتھ پسارے، جس
نے تجھ سے تیرے سوا آرزو کی، اس نے آرزو کرنی نہ جانی،
جس نے تیرے ہوتے عرش اور مادون العرش پر خاک نہ ڈالی
،اس نے تیری قدر نہ پہچانی"۔

حالؔی کا ایک مضمون "زبانِ گویا" کے عنوان سے ہے، وہ انشا پردازی کا ایسا دلفریب
نمونہ ہے کہ اس کو بار بار پڑھنے سے طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ اس کا ایک نمونہ پیش کیا
جاتا ہے۔

"اے میری بلبلِ ہزار داستان، اے میری طوطیِ شیوا بیاں، اے
میری قاصد، اے میری ترجمان، اے میری وکیل، اے میری
زبان، سچ بتا تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے، تیرے
ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں نیا مزہ ہے، کبھی تو
ایک ساحرِ فسوں ساز ہے جس کے سحر کا نہ رد، نہ جادو کا اتار، کبھی تو
ایک افعیِ جاں گداز ہے جس کے زہر کا نہ درد، نہ کاٹے کا منتر
،تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے
غیروں کا جی لبھاتی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل
دکھاتی، تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار
کرتی تھی اور کبھی اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی۔

اے میری بنی بات کی بگاڑنے والی اور میرے بگڑے کاموں کی
سنوارنے والی، روتے کو ہنسانا، ہنستے کو رلانا، روٹھے کو منانا،
بگڑے کو بنانا، نہیں معلوم تو نے کہاں سے سیکھا اور کس سے
سیکھا، کہیں تیری باتیں رس کی گانٹھیں ہیں اور کہیں تیرے بول

شربت کے گھونٹ، کہیں تو شہد ہے اور کہیں حنظل، کہیں زہر ہے
تو کہیں تریاق، الٰہی اگر ہم کو رخصتِ گفتار ہے تو زبانِ راست
گفتار دے، اگر دل پر تجھ کو اختیار ہے تو زبان پر ہم کو اختیار
دے، جب تک دُنیا میں رہیں سچے کہلائیں اور جب تیرے
دربار میں آئیں تو سچے بن کر آئیں''۔[۴]

اردو میں اس طرح کے نمونے شاذ ہیں، بخوبی ممکن ہے کہ حالؔی کو یہ طرز ورثے میں ملا ہو، اس لیے کہ ان کے مورثِ اعلیٰ عبداللہ انصاری سہروردی تھے اور فارسی میں اس طرز کے بانی سمجھے جاتے ہیں، اُن کی نثر کے چند نمونے نقل کیے جاتے ہیں۔

''اے خالقِ بے مدد، اے واحدِ بے عدد، اے عزیزِ بے ذلت،
اے آخرِ بے نہایت، اے ظاہر بے صورت و اے باطنِ بے
سیرت، اے حیّ بے حیلت، اے اوّلِ بے بدایت، اے آخرِ بے
نہایت، اے غنیِ بے قلت، اے معطی بے فکرت، اے بخشندۂ
بے منّت، اے دانندہ رازہا، اے بنیندۂ انمازہا، اے پذیندۂ
نیازہا۔ الٰہی اگر بگیری بر تو حجّت ندارم، اگر بسوزی طاقت
ندارم، از بندہ خطا آید و زلت، و از شاہ عطا آید و رحمت، اے
کامگارے کہ دلِ دوستان در کنفِ وحدت تست، اے کار
گزارے کہ جان بندگان در صدف تقدیر تست، اے مفضلے کہ
بہ افضال کے ترا حاجت نیست، منعمے کہ انعام ترا نہایت
نیست''۔[۵]

حالی ان ہی شیخ الاسلام عبداللہ انصاری کی اولاد میں تھے۔ حالؔی نے اپنے اجداد میں ایک بزرگ ملک محمود شاہ انجو کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اُن کا سلسلہ ''ملک محمود

شاہ انجو ملقب بہ آقا خواجہ تک غزنوی دور میں فارس و کرمان و عراق عجم کا فرماں روا تھا، پہنچتا تھا، اس سلسلے میں پروفیسر نذیر احمد نے لکھا ہے۔

"محمود شاہ انجو کے بارے میں حالی کی اطلاع صحیح نہیں، وہ غزنوی دور سے تعلق نہیں رکھتا، اس کے بیٹے کا نام ابو اسحاق انجو ہے، وہ حافظ کا ممدوح تھا، ۷۵۸ھ میں امیر مبارز الدین سے مغلوب اور اس کے حکم سے قتل ہوا۔ ابو اسحاق کے باپ کا نام شرف الدین محمود انجو تھا، پہلے وہ امیر چوپان کا ملازم تھا، پھر اس نے ایران کے جنوبی علاقے کو مسخر کر کے خود وہاں کا والی ہو گیا۔ اس کا یہ خاندان انجو خاندان کہلاتا ہے اور اس خاندان کے حسب ذیل حکمراں ہوئے ہیں"۔

"محمود شاہ، پھر اس کے چار بیٹے: جلال الدین، مسعود شاہ، غیاث الدین کے خسرو جمال الدین ابو اسحاق، ابو اسحاق اس کا آخری فرمانروا تھا جو مبارز الدین کے ہاتھوں ۷۵۸ھ میں مغلوب ہوا، اور اسی پر انجو خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہوا، ابو اسحاق حافظ شیرازی کا ممدوح تھا"۔[۶]

"حالی نے نثر مسجع میں چند مقالے لکھ کر اپنے خاندان کی روایت برقرار رکھی ہے۔ ایران کی ادبی تاریخ میں خواجہ عبداللہ انصاری پیرِ ہرات کو نثرِ مسجع میں جو شہرت حاصل ہے وہ کسی اور فارسی نثر نویس کو میسر نہیں، اسی طرح خواجہ حالی بھی نثر مسجع کے اعتبار سے اردو میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے اور حالی نے یہ کمال اپنے جدّ بزرگوار خواجہ انصاری سے حاصل کیا تھا"۔

خواجہ ملک علی: ہرات سے اس خاندان کے ایک بزرگ خواجہ ملک علی

سلطان غیاث الدین بلبن کے عہدِ حکومت میں اپنے دو صاحب زادوں خواجہ مسعود اور خواجہ نصیر الدین کے ساتھ ۶۷۵ھ مطابق ۱۲۷۶ء میں ہندوستان پہنچے اور پانی پت میں سکونت اختیار کی۔ بقولِ حالؔی

"چوں کہ غیاث الدین اس بات میں نہایت مشہور تھا کہ قدیم اشراف خاندانوں کی بہت عزت کرتا ہے اور اس کا بیٹا سلطان محمد، علما، شعرا اور دیگر اہلِ کمال کا حد سے زیادہ قدرداں تھا، اس لیے اکثر اہلِ علم اور خاندانی لوگ ایران و ترکستان سے ہندوستان کا قصد کرتے تھے۔ اسی شہرت نے خواجہ ملک علی کو سفرِ ہندوستان پر آمادہ کیا تھا۔ چناں چہ جب خواجہ ملک علی ہندوستان آئے تو سلطان غیاث الدین نے چند عمدہ اور سیر حاصل دیہات، پرگنہ پانی پت میں اور معتد بہ اراضی سوادِ قصبہ پانی پت میں بطور مددِ معاش اور بہت سی زمین اندرونِ آبادی قصبۂ پانی پت واسطے سکونت کے ان کو عنایت کی اور منصب قضا و صدارت و تشخیصِ نرخ بازار اور تولیتِ مزارات ائمہ جو سوادِ پانی پت میں واقع ہے اور خطباتِ عیدین اُن کے متعلق کردی، پانی پت میں اب تک جو ایک محلہ انصاریوں کا مشہور ہے وہ انھیں بزرگوں کی اولاد سے ہے۔" [۷]

حالؔی کی اس تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ غیاث الدین بلبن نے خواجہ ملک علی کو (۱) منصب قضا و صدارت (۲) تولیتِ مزاراتِ ائمہ (۴) خطباتِ عیدین کے فرائض سونپے اور معاش کے طور پر انھیں عمدہ اور سیر حاصل دیہات پرگنہ پانی پت میں (۵) معتد بہ اراضی سوادِ قصبہ پانی پت میں (۶) بہت سی زمین اندرونِ قصبۂ پانی پت میں عطا کی۔

خواجہ ملک علی کے بارے میں صالحہ عابد حسین نے لکھا ہے کہ

> "(حالیؔ) کی والدہ سیّدانی تھیں، اور والد کا شجرۂ نسب حضرت ابو ایوب انصاری سے جا ملتا ہے۔ ان کے بزرگوں میں بڑے بڑے عالمِ دین، صوفی اور ادیب و خطیب گزرے ہیں۔ میرک علی شاہ ہرات کا فرماں روا تھا۔ اس کے بیٹے خواجہ ملک علی کسی وجہ سے دولت و حکومت چھوڑ کر ہندوستان چلے آئے۔ یہاں غیاث الدین بلبن نے اُن کے علم و فضل سے متاثر ہو کر انھیں پانی پت میں زمین و جائیداد دی۔ اور ۱۲۷۶ء میں وہ اس قصبے میں آباد ہوئے۔"[8]

لیکن خواجہ احمد عباس نے اپنے خودنوشت سوانح میں یہ نہیں لکھا کہ خواجہ ملک علی ہرات کے فرماں روا میرک علی شاہ کے صاحبزادے تھے، بلکہ لکھا ہے کہ خواجہ ملک علی کے بزرگوں کو افغانستان میں خواجہ کا خطاب ملا تھا۔ اس خاندان کی بعد کی نسلوں کے لوگ اپنے نام کے ساتھ خواجہ لگاتے تھے۔ خواجہ احمد عباس نے لکھا ہے کہ خواجہ ملک علی فارسی اور عربی کے عالم تھے۔ سلطان غیاث الدین بلبن نے خواجہ ملک علی کا بڑے احترام کے ساتھ استقبال کیا اور انھیں پانی پت میں قاضی کے عہدے پر فائز کر دیا۔ پانی پت کے چاروں طرف چوتھائی زمین انھیں بطور جاگیر عطا کی۔[9]

پانی پت شہر کی تاریخی حیثیت سے سب واقف ہیں۔ مہابھارت کی لڑائی اس مقام سے کچھ ہی کلومیٹر کے فاصلے پر لڑی گئی تھی۔ بعد کے زمانے میں اس علاقے کی جغرافیائی اہمیت کے پیشِ نظر اس پر تسلط کے لیے مغلوں، مرہٹوں اور انگریزوں میں لڑائیاں ہوئیں۔ جس کی وجہ سے اس خاندان کی جاگیر دوسرے لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔

اسماعیل پانی پتی نے تذکرۂ حالی میں حالی کے ننھیال اور ددھیال دونوں کا درجِ ذیل شجرۂ نسب نقل کیا ہے۔ میرے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ شجرہ کہاں تک درست ہے۔

"صحابی و میزبانِ رسول اللہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے ملتا ہے۔ آپ کی والدۂ محترمہ، سیدہ امتہ الرسول عرف بی چھولو، سیدانی تھیں اور سید الانبیا حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کی چھتیسویں پشت میں تھیں۔ اس طرح مولانا حالی دادھیال کی طرف سے انصاری اور ناھیال کی طرف سے سید تھے۔ شجرہ حسبِ ذیل ہے"۔[10]

ناھیال : (۱) سید الانبیا حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ (۲) سیدہ فاطمہ زہراؓ (۳) سیدنا امام حسینؓ (۴) سیدنا امام زین العابدین (۵) امام ابو جعفر محمد باقر (۶) امام جعفر صادق (۷) حضرت اسماعیل ناطق (۸) سید محمد نطق (۹) امام ابو القاسم اسماعیل شہید (۱۰) سید احمد (۱۱) سید اسماعیل شہید (۱۲) سید ابو جعفر (۱۳) سید موسیٰ مکحول (۱۴) سید ابراہیم (۱۵) سید یحییٰ (۱۶) سید ابی تمیم (۱۷) سید موسیٰ (۱۸) سید محمد (۱۹) سید مغیث (۲۰) سید نور الدین (۲۱) سید مرتضیٰ (۲۲) سید معظم (۲۳) سید شمس الدین (۲۴) سید حسام الدین (۲۵) سید اخوند (۲۶) سید نعمت اللہ (۲۷) سید امجد (۲۸) سید محمد (۲۹) سید منجھوں (۳۰) سید علی (۳۱) سید ابو القاسم (۳۲) سید عبد الرحیم (۳۳) سید عبد الرحمٰن (۳۴) سید محمد امین (۳۵) سید محمد شفیع (۳۶) سیدہ امتہ الرسول زوجۂ خواجہ ایزد بخش و والدۂ خواجہ الطاف حسین حالی۔

دادھیال : (۱) حضرت ابو ایوب خالد انصاری خزرجی رضی اللہ تعالےٰ عنہ (۲) ابو منصور امت الانصاری (۳) جعفر انصاری (۴) علی انصاری (۵) احمد انصاری (۶) محمد انصاری (۷) ابی معاذ انصاری (۸) ابو المعصور محمد (۹) شیخ الاسلام خواجہ عبد اللہ انصاری معروف بہ پیرِ ہرات (۱۰) شیخ محمد اوّل (۱۱) شیخ نصیر (۱۲) شیخ محمد ثانی (۱۳) اسعد انصاری (۱۴) خواجہ عبد اللہ (۱۵) خواجہ فضل اللہ (۱۶) خواجہ محمد

الملقب بہ امیر شیخ ابواسحاق (۱۷) خواجہ ملک شرف الدین امیر (۱۸) محمود شاہ ا انجو الملقب بہ آق خواجہ (۱۹) شیخ نافع (۲۰) خواجہ انفع (۲۱) خواجہ عقبہ (۲۲) خواجہ ابو طاہر (۲۳) خواجہ عثمان (۲۴) خواجہ ابراہیم (۲۵) خواجہ عمر (۲۶) خواجہ مسعود (۲۷) خواجہ میرک علی شاہ (۲۸) قاضی خواجہ ملک علی (۲۹) خواجہ نصیر الدین محمود (۳۰) خواجہ ابوتراب (۳۱) خواجہ ابوحامد (۳۲) خواجہ ابوراشد (۳۳) خواجہ ضیاء الدین (۳۴) خواجہ عبدالکافی (۳۵) خواجہ زین الدین احمد (۳۶) خواجہ مسلم (۳۷) خواجہ عبدالکریم (۳۸) خواجہ عبدالسبحان (۳۹) خواجہ غلام محمد (۴۰) خواجہ محمد بخش (۴۱) خواجہ بوعلی بخش (۴۲) خواجہ ایزد بخش پدر بزگوار خواجہ الطاف حسین حالی۔

حضرت ابوایوب انصاری کے صاحبزادے حضرت عثمانؓ کے عہد میں ایک مہم میں خراسان آئے اور انھوں نے ہرات میں سکونت اختیار کرلی۔اس خاندان کی نویں پشت میں شیخ الاسلام حضرت خواجہ عبداللہ انصاری ایک باعمل اور پارسا بزرگ تھے۔ وہ فن حدیث کے امام اور صوفی کامل، اعلادرجے کے خطیب اور بلند پایہ ادیب تھے۔ اپنے زہد وتقوے، ریاضت، عبادت، بزرگی، پرہیزگاری کی وجہ سے پیرِ ہرات کے نام سے مشہور ہوگئے تھے۔ان کی تمام عمر تصنیف وتالیف میں گزری"۔

حالی کے والد: جیسا کہ اسماعیل پانی پتی کے نقل کیے ہوئے شجرۂ نسب سے معلوم ہوتا ہے کہ حالی کے والد کا نام خواجہ ایزد بخش، دادا کا خواجہ بوعلی بخش اور پر دادا کا نام خواجہ محمد بخش تھا۔حالی کے دادا اور پردادا کے ہمیں صرف نام معلوم ہیں۔ حالی کے آباؤاجداد نے بظاہر دہلی اور لکھنو میں کوئی ملازمت اختیار نہیں کی لیکن حالی کے والد ایزد بخش پہلے شخص تھے جنھوں نے نے سرشتۂ پرمٹ میں انگریزی سرکار کی ملازمت کی تھی جس کا مطلب ہے کہ مالی اعتبار سے حالی متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ابھی نو ہی سال کے تھے کہ چالیس سال کی عمر میں والد داغِ مفارقت دے گئے۔ حالی کا بیان ہے کہ والد کے انتقال کے وقت ان کی عمر نو سال تھی حالی

۱۸۳۷ میں پیدا ہوئے تھے۔ اس طرح اُن کے والد کا انتقال ۱۸۴۶ء میں ہوا ہوگا، حالؔی کی ولادت کے فوراً بعد اُن کی والدہ کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ والد کے بعد حالؔی کی پرورش اُن کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے کی۔

حالی کی ولادت: پانی پت ضلع کرنال کا ایک قصبہ ہے۔ جو ہندوستان میں سیاسی، ادبی اور مذہبی لحاظ سے بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔ یہی قصبہ مولانا الطاف حسین حالؔی کا آبائی وطن ہے۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے حالؔی کی تاریخِ ولادت ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۶ء لکھی ہے، جو درست نہیں ہے کیوں کہ خود حالؔی نے اپنے سنہِ ولادت کے بارے میں "حالؔی کی کہانی خود اُن کی زبانی" میں لکھا ہے۔

"میری ولادت تقریباً ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں ہوئی"

۱۲۵۳ء اپریل ۱۸۳۷ء سے شروع ہو کر دسمبر ۱۸۳۷ء پر ختم ہوتا ہے، اس کا مطلب ہے کہ حالی اپریل ۱۸۳۷ء سے لے جنوری ۱۸۳۷ء کے درمیان پیدا ہوئے ہوں گے۔

حالی کے بہن بھائی: حالؔی چار بہن بھائی تھے۔ اُن کے علاوہ ایک بڑے بھائی خواجہ امداد حسین، دو بہنیں امتہ الحسین اور وجیہہ النساء۔

والد کی وفات اور والدہ کا دماغ مختل ہونے کے بعد۔ بھائی بہنوں کے علاوہ حالؔی کا دنیا میں کوئی نہیں رہا۔ چوں کہ بہن بھائیوں میں حالؔی سب سے چھوٹے تھے۔ اس لیے خواجہ امداد حسین اور دونوں بہنوں نے حالؔی کی پرورش اور تربیت اس انداز سے کی کہ حالؔی کو ماں باپ کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ بقول حالؔی

> "میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کو نہیں پایا"۔[11]

خواجہ امداد حسین: جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ جب حالؔی کے والد کا انتقال ہوا تو

حالی نو برس کے تھے۔ والدہ کا دماغی توازن بگڑ گیا تھا۔ حالی کی دو بہنیں اور بھائی خواجہ امداد حسین نے حالی کی پرورش اس طرح کی کہ انھیں ماں باپ کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ خواجہ امداد حسین نے حالی کی تعلیم اور تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ حالی کو بھی ان سے بے انتہا محبت تھی۔

خواجہ امداد حسین کو شعر و ادب سے بھی دلچسپی تھی مظہر تخلص کرتے تھے۔ غالباً انھوں نے باقاعدہ شاعری نہیں کی، لیکن کبھی کبھار شعر کہہ لیتے تھے۔ انھوں نے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی وفات پر اس شعر سے تاریخ وفات نکالی۔

ازسر زادی بیاید گفت ایں
رحمتِ حق بر محمد مصطفےٰ

۱۸۸۶ء کی بات ہے جب خواجہ امداد حسین بیمار ہو گئے۔ اُس زمانے میں حالی دہلی میں مقیم تھے۔ خواجہ امداد حسین علاج کے لیے دلّی آئے اور حالی کے پاس ہی ٹھہرے۔ حالی نے پانچ چھ مہینے تک بڑی لگن، خلوص اور محبت سے اپنے بھائی کی تیمارداری کی۔ لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ حالی کی کوششیں بھائی کو موت کے منہ سے نہ بچا سکیں۔ ۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸۸۶ء۔۱۸۸۷ء میں اُن کا انتقال ہوا۔ دہلی میں خواجہ باقی باللہ کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔ اس واقعہ کا اثر حالی کے دل پر بہت گہرا ہوا۔ خواجہ امداد حسین کے انتقال پر حالی نے جو مرثیہ کہا تھا، اس کے چند شعر ہیں

آئے ہیں سدا بھائیوں سے بھائی بچھڑتے
موت ایک کے آگے ہے ضرور ایک کو آنی
پر بھائی ہو جس شخص کا حالی کا سا بھائی
غم بھائی کا، مرجانے کی ہے اُس کے نشانی

جس بھائی نے بیٹوں کی طرح بھائی کو پالا
سوکھی ہوئی کھیتی میں دیا باپ کی پانی
جس بھائی کی آغوش میں ہوش اس نے سنبھالا
جس بھائی کے سائے میں کٹی اس کی جوانی
شفقت نے دیا جس کی بھلا مہر پدر کو
دی آنے کبھی دل پہ نہ بھائی کے گرانی
جیتا بھی رہا بھائی اگر اس بھائی کے پیچھے
لذت نہیں جینے کی نصیب اُس کی اٹھانی
دل مردہ ہو حالی کی طرح جس کا عزیزو!
کیا ڈھونڈتے ہو اُس کی طبیعت میں روانی
باقی رہے گا داغ سدا بھائی کا دل پر
ہر چند کہ فانی تھا وہ اور ہم بھی ہیں فانی

ابتدائی تعلیم: حالی نے اپنی ابتدائی تعلیم کے بارے میں خودنوشت مختصر سوانح "حالی کی کہانی خود ان کی زبانی" میں لکھا ہے کہ انھیں پہلے قرآن شریف حفظ کرایا گیا، پھر پانی پت ہی میں ممنون دہلوی کے بھتیجے اور نیز داماد بھی تھے اور بوجہ تعلق زنا وشوئی کے پانی پت میں مقیم تھے اور بقول حالی، فارسی لٹریچر، تاریخ اور طب میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ حالی نے ان سے فارسی کی دو چار ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اُن کی صحبت میں رہ کر حالی کو فارسی ادب سے خاص لگاؤ پیدا ہو گیا پھر حالی کو عربی کا شوق ہوا۔ ان

ہی دنوں مولوی حاجی ابراہیم انصاری سے حالؔی نے صرف ونحو پڑھی[۱۲]

شادی: حالؔی کی عمر سترہ سال تھی کہ بھائی بہنوں نے چاہا کہ ان کی شادی کردیں۔ حالؔی چوں کہ بہن بھائی کو والدین کی طرح سمجھتے تھے، انکار نہیں کر سکے۔ اس لیے حالؔی کے ماموں میر باقر علی کی صاحبزادی اسلام النساء سے ان کی شادی کردی گئی۔

حالؔی کے بڑے بھائی امداد حسین ایک دفتر میں ملازم تھے۔ ان ہی کی تنخواہ پر سارے گھر کا گزارا تھا، اتنے بڑے گھر کے لیے یہ تنخواہ کافی نہیں تھی اس لیے گھر کے لوگوں کی خواہش تھی کہ حالؔی بھی ملازمت کرلیں۔ لیکن بقول حالؔی

> ''اب بظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود ہوگئے۔ سب کی یہ خواہش تھی کہ میں نوکری تلاش کروں مگر تعلیم کا شوق غالب تھا اور بیوی کا میکہ آسودہ حال۔ میں گھر والوں سے روپوش ہوکر دلّی چلا گیا۔ اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں رہ کر کچھ صرف ونحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے جو وہاں ایک مشہور واعظ اور مدرّس تھے، پڑھیں''[۱۳]

صالحہ عابد حسین نے لکھا ہے کہ

> ''مولوی نوازش علی[۱۴] کے علاوہ دلّی کے زمانہ قیام میں انھوں نے (حالؔی نے) مولوی فیض حسن، مولوی امیر احمد اور شمس العلما میاں نذیر حسین کے درس سے بھی استفادہ کیا''[۱۵]

حالؔی نے اپنے مختصر سوانح میں دہلی کے صرف مولوی نوازش علی کا ذکر کیا ہے۔ ان تین حضرات سے استفادے کی بات صالحہ عابد حسین نے کی ہے۔

حالؔی نے دہلی میں رہ کر صرف مشرقی علوم کا مطالعہ کیا۔ انگریزی تعلیم کی طرف بالکل

توجہ نہیں کی۔ بقولِ حالی

''اگرچہ اس وقت قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا مگر جس سوسائٹی میں، مین نے نشوونما پائی تھی، وہاں علم صرف عربی اور فارسی زبان میں منحصر سمجھا جاتا تھا۔ انگریزی تعلیم کا خاص کر پانی پت میں اوّل تو کہیں ذکر ہی سننے میں نہیں آتا تھا اور اگر اس کی نسبت لوگوں کا کچھ خیال تھا تو صرف اس قدر کہ وہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے نہ یہ کہ اس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے بلکہ برخلاف اس کے انگریزی مدرسوں کو ہمارے علما جہلے (یعنی جہالت کی جگہ) کہتے تھے۔

دلّی پہنچ کر جس مدرسے میں مجھ کو شب و روز رہنا پڑا وہاں سب مدرّس اور طلبہ کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے۔ غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گزرتا تھا۔ ڈیڑھ برس تک دلّی میں رہنا ہوا، اس عرصے میں کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں اور نہ ان لوگوں سے (اس زمانے میں) کبھی ملنے کا اتفاق ہوا جو اس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے جیسے مولوی ذکاء اللہ، مولوی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ وغیرہ''[۱۶]

دلّی میں حالی تعلیم حاصل کرنے میں مصروف تھے کہ بقول اُن کے

''میں نے دلّی میں شرح سلّم، ملاحسن اور بیبذی پڑھنی شروع کی تھی کہ سب عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چار و ناچار مجھ کو دلّی چھوڑنا اور پانی پت آنا پڑا۔ یہ ذکر ۱۸۵۵ء کا ہے۔ دلّی سے

> آ کر برس ڈیڑھ برس تک پانی پت سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہاں بطور خود اکثر بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا'' ۔[ے۱]

حالؔی پانی پت آ کر کتابوں کے مطالعے میں مصروف ہو گئے۔ گھر کے لوگوں کا اصرار تھا کہ وہ ملازمت کریں۔ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے ملازمت کی تلاش کی ہو مگر ملازمت نہیں ملی۔ اس طرح ڈیڑھ سال گزر گیا۔ اس دوران حالؔی نے کتابوں کا مطالعہ جاری رکھا۔ بالآخر ۱۸۵۶ء میں حصار میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں انھیں بہت کم تنخواہ پر ملازمت مل گئی اپنے گھر کے حالات کے پیشِ نظر انھوں نے یہ ملازمت قبول کر لی۔ ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ ۱۸۵۷ء کا ناکام انقلاب ہو گیا۔ اور حالؔی ملازمت چھوڑ کر پانی پت کے لیے روانہ ہو گئے۔ راستے میں حالؔی کو جن صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا، اُن کا ذکر اُن کے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین کی زبانی سنیے۔ اُن کا بیان ہے۔

> ''والد (حالؔی) جس گھوڑی پر سفر کر رہے تھے وہ بھی ڈاکوؤں نے چھین لی اور آپ کے پاس صرف ایک حمائل (چھوٹا قرآن شریف) باقی رہ گئی تھی۔ جب پانی پت پہنچے تو پیدل سفر کی صعوبت اور راستے میں ناموافق اور ناوقت غذاؤں کی وجہ سے آپ کو اسہال کی شکایت ہو گئی جو ایک سال سے زیادہ رہی اور آخر پانی پت کے مشہور طبیب حکیم خورشید صاحب مرحوم نے والد کو گڈیوں (بکرے کی گھٹنے کی ہڈی) کا پلاؤ بتایا اور اُس سے مرض کا ازالہ ہو گیا۔ جوانی میں والد مرحوم کے قویٰ بہت اچھے تھے اور آپ کو کسرت کا بھی شوق تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس حصار سے پانی پت تک کے سفر میں جو تکلیف اٹھائی اُس نے اُن کی صحت پر بہت بُرا اثر ڈالا اور آپ اکثر معدے اور سینے اور پھیپھڑے کے امراض میں مبتلا رہنے لگے باوجود انتہائی احتیاط

کے جو آپ کی عادت تھی''۔[۱۸]

حالیؔ سفر کی مصیبتیں برداشت کرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح پانی پت پہنچ گئے۔ خاندان کے لوگوں نے جب اُنھیں زندہ سلامت دیکھا تو اُن کی جان میں جان میں آئی۔ اگر چہ پانی پت ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے محفوظ رہا، لیکن اس ہنگامے کا خوف و ہراس اہلِ پانی پت کے دلوں پر چھایا ہوا تھا۔ دہلی کے بہت سے لوگ بھاگ کر پانی پت میں پناہ گزین ہو گئے۔ اس وقت حالیؔ کی عمر تقریباً بیس سال تھی۔ انھوں نے جہاں تک ممکن ہوا، دہلی سے آئے ہوئے لوگوں کی خدمت کی۔ اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے صالحہ عابد حسین نے لکھا ہے

> ''ایک مصیبت زدہ خاندان کی کفالت اُن کے بھائی بھاوج نے ہمیشہ کے لیے اپنے ذمّے لے لی تھی۔ ایک اور اسّی سالہ بوڑھی بی مٹریا کو میں نے خود دیکھا تھا۔ یہ بی بی غدر میں دس سال کی تھیں۔ عقد ہو چکا تھا، رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ غدر کا ہنگامہ برپا ہوا اور ماں، باپ، عزیز و اقارب، شوہر سب مارے گئے اور اس کم سن لڑکی نے الطاف حسین کے خاندان میں آکر پناہ لی اور پھر اپنی ساری عمر انتہائی شرافت اور عزّت و خودداری کے ساتھ اس گھر میں گزار دی۔ جب تک ہاتھ پاؤں چلتے رہے سلائی کر کے، چھالیہ کاٹ کے، طرح طرح کے کشیدے کے کام اُجرت پر کرتیں اور اپنا خرچ چلاتی رہیں۔ آخر عمر میں مولانا حالیؔ کی بڑی پوتی مشتاق فاطمہ نے اُن کی دیکھ بھال اور خدمت کا بار اپنے ذمّے لے لیا تھا اور اُن کی وفات تک اُن کی ایسی خدمت کرتی رہیں جیسے کوئی بڑی سعادت مند بیٹی اپنی ماں کی کرتی ہے۔ خواجہ الطاف حسین بھی جب تک زندہ رہے بی مٹریا کا

بڑا لحاظ اور خیال کرتے تھے۔ عمر بھر بی مٹریا کو یہ محسوس نہیں ہوا
کہ وہ اسی خاندان کی ایک معزز فرد نہیں ہیں"۔[18]

حالی کی بیوی جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ حالی کی عمر سترہ سال تھی جب اُن کی شادی میر باقر علی کی صاحبزادی اسلام النسا سے کردی گئی۔ یہ خاتون بہت نیک، شریف، خداترس اور خدمت گزار تھیں۔ مزاج کی بہت تیز تھیں غصہ بہت جلد آتا تھا لیکن جلد اُتر بھی جاتا۔ اس کے برعکس مولانا حالی بہت نرم مزاج تھے۔

بقول صالحہ عابد حسین

"بی اسلام النسا، کبھی اپنے شوہر کے کسی کام میں رکاوٹ نہیں ڈالتی تھیں۔ وہ جہاں چاہیں رہیں، جو چاہیں کریں وہ دخل نہ دیتی تھیں اور گھر کی ساری فکریں اور پریشانیاں، ساری ذمہ داریاں بھی، جس حد تک پرانے زمانے کی کوئی عورت اٹھا سکتی تھی۔ نہایت خوش اسلوبی سے اٹھاتی تھیں۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے حقوق سے بھی دستبردار نہ ہوتی تھیں اور اگر شوہر کی کوئی بات ناگوار ہوتی تو اس کے اظہار میں ذرا سا تامل نہ کرتیں۔ خواجہ غلام السبطین مرحوم نے اپنی (غیر مطبوعہ) ڈائری میں اسی قسم کا ایک دل چسپ واقعہ لکھا ہے ایک مرتبہ محرم کی نو تاریخ کو حالی اپنے بیٹے خواجہ سجاد حسین اور اپنے سالے میر فیاض حسین کے ساتھ کہیں تانگے میں بیٹھ کر گئے۔ بیوی کو حالی کی یہ بات سخت ناگوار گزری۔ اتفاق سے تانگا الٹ گیا۔ جب یہ لوگ واپس آئے تو سیدانی کا جلال انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ انھوں نے میاں، بیٹے اور بھائی کو دل کھول کر بُرا بھلا کہا کہنی کے نواسے پر

تو قیامت کا وقت پڑ رہا ہے، اُن کے بچے بھوک پیاس سے تڑپ رہے ہیں اور تم سواریوں میں بیٹھے سیر کر رہے ہو۔ اچھا ہوا تانگا الٹ گیا وغیرہ وغیرہ۔ میر فیاض حسین اور خواجہ سجاد حسین کو یہ بات ناگوار گزری کہ مولانا کو ایسی سخت باتیں کہی جائیں لیکن فرشتہ منش حالی نے صرف اتنا کہا ''سیدانی غصے میں ہیں اور حق پر ہیں۔ غلطی ہماری ہی تھی کہ آج کے دن سواری پر بیٹھے، وہ جو کہتی ہیں بجا ہے''[19]

حالی کے خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتے تھے۔ خطوں میں اُن کا جب بھی ذکر آیا ہے، بڑی محبت، ادب اور احترام سے آیا ہے۔ ۲۲ راگست ۱۹۰۰ء کو ہیضے میں مبتلا ہو کر مولانا حالی کی بیوی کا انتقال ہو گیا جس کی اطلاع مولانا حالی نے ایک خط میں اپنے بیٹے خواجہ سجاد حسین کو ان الفاظ میں دی

''پرسوں تمھاری والدہ کو دس بجے رات کے ہیضے کا اثر ہوا اور کل نو بجے رات انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اگر چہ اس حادثۂ ناگہانی سے جو صدمہ سب عزیزوں اور متعلقوں اور ہمسایوں اور راہ چلتوں کو ہوا ہے، اُس کا بیان کرنا مشکل ہے اور سمجھتا ہوں کہ انکی اولاد کو سب سے زیادہ صدمہ ہوا ہے اور ہوگا۔ مگر میری جان! والدین کا اولاد کے سامنے گزر جانا والدین کی خوش نصیبی اور اولاد کا قدیم ورثہ ہے۔ تمھاری والدہ کی جیسی عمدہ زندگی اور عمدہ موت ہوئی ہے اس کی ہر شخص کو تمنا ہونی چاہیے۔ خدا کا شکر ہے کہ انھوں نے سعادت مند اولاد چھوڑی ہے اور ان کو بفضلہ تعالیٰ اچھی حالت میں چھوڑا ہے۔ ایک زمانے کو اپنا مداح اور ثنا خواں اور شکر گزار چھوڑا ہے۔ وہ اپنی حقیقی اور اصلی

نیکیوں کی تمام عشیرہ میں ایک عمدہ مثال تھیں۔انھوں نے ہرادنیٰ
اوراعلیٰ کی خدمت گزاری سے مخدومیت کا درجہ حاصل کیا تھا۔
آخر وقت میں جب تک اُن کو ہوش رہا برابر خدا کی یاد اُن کے
وردِ زبان رہی۔جس شخص کی ایسی عمدہ زندگی اور ایسی عمدہ موت
ہو اُس سے زیادہ کون خوش نصیب ہوسکتا ہے''۔[20]

اولاد: حالی کے چھ بچے ہوئے ان میں چار لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ان میں سے دو لڑکے ایک لڑکی بچپن ہی میں وفات پا گئے۔ایک لڑکا چند مہینے زندہ رہ کر خدا کو پیارا ہو گیا۔دوسرا لڑکا سات آٹھ سال کی عمر میں داغِ مفارقت دے گیا۔اس لڑکے کا نام اعتقاد حسین تھا۔ایک لڑکی رقیہ بیگم کا دس گیارہ برس کی عمر میں انتقال ہو گیا۔جو بچے حیات رہے،اُن میں دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔

خواجہ اخلاق حسین بڑے صاحبزادے تھے۔حالی کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے انھیں گود لے لیا تھا۔یہ حالی کی شرافت تھی کہ وہ اپنے اس لڑکے کو زندگی بھر برادر زادہ کہتے رہے۔اخلاق صاحب،شاہ عبدالصمد سہسوانی کے مرید ہو گئے تھے ان کا ۲ر فروری ۱۹۲۴ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔خواجہ اخلاق حسین کی چار اولادیں تھیں۔دو لڑکیاں اور دو لڑکے۔سب سے بڑی صاحبزادی تھیں مشتاق فاطمہ۔ان کی شادی خواجہ غلام الثقلین سے ہوئی۔اردو کے مشہور ادیب خواجہ غلام السیدین اور بیگم صالحہ عابد حسین ان ہی کی اولاد تھے ان کے بعد دو صاحبزادے ہوئے۔احتاق حسین اور اکرام حسین۔احتاق حسین رہتک کے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں اسٹینوگرافر تھے۔اکرام حسین کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا۔چوتھی صاحبزادی تھیں صدیقۃ النساء ان کی شادی محمد حسین سے ہوئی۔۹ر فروری ۱۹۳۵ء کو صدیقۃ النساء کا انتقال ہو گیا۔

حالی کی سب سے چھوٹی صاحبزادی کا نام عنایت فاطمہ تھا۔۱۸۵۹ء میں ان کی

ولادت ہوئی ان کے شوہر کا نام تھا خواجہ عبدالعلی۔ عنایت فاطمہ کا ۱۹۱۵ء میں انتقال ہو گیا۔ ان کے دو لڑکے خواجہ فرزند علی اور خواجہ عبدالولی تھے۔ ایک صاحبزادی تھیں سعیدہ بیگم۔ اُن کی شادی منشی حامد علی تحصیل دار سے ہوئی۔

حالؔی کے سب سے چھوٹے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین تھے۔ ۱۸۶۱ء میں ان کی ولادت ہوئی۔ خواجہ احمد عباس نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ اینگلو اورینٹل کالج کے جو پہلے چار گریجویٹ تھے۔ اُن میں سجاد حسین بھی تھے۔ اس وقت یہ کالج کلکتہ کالج سے ملحق تھا۔ جب امتحان کا ریزلٹ آیا تو United Provinces کے گورنر نے ان چاروں کو بلا کر پوچھا کہ وہ کیا ملازمت چاہتے ہیں ایک نے I.A.S بننے کی خواہش ظاہر کی۔ اسے انگلینڈ بھیج دیا گیا۔ دوسرے نے عدلیہ میں ملازمت کے لیے کہا، اسے سیشن جج کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ تیسرے نے پولس کے محکمے کو ترجیح دی۔ اسے پولس سپرنٹنڈینٹ بنا دیا گیا۔ خواجہ سجاد حسین نے تعلیم کے میدان کو ترجیح دی۔ گورنر نے کہا تم نے سب سے خراب ملازمت کی خواہش کیوں کی ہے۔ اس ملازمت میں تو تنخواہ بھی بہت کم ہے۔ سجاد صاحب نے جواب دیا کہ میری قوم کو تعلیم کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، اس لیے میں تعلیمی میدان میں جانا چاہتا ہوں۔ انھیں اسکولوں کا انسپکٹر جنرل کا عہدہ دے دیا گیا۔[۱۲]

خواجہ سجاد کو اپنے والد سے بہت محبت تھی۔ بقول شجاعت علی۔ حالؔی کی تصانیف کی اشاعت کا اہتمام انھوں نے ہی کیا تھا اور ان ہی کی وجہ سے حالؔی کے بہت سے قیمتی مسودات ضائع ہونے سے بچ گئے۔

حصار سے واپسی پر پانی پت میں حالؔی کا قیام: حالؔی کو حصار سے ملازمت ترک کر کے پانی پت آئے ہوئے چار سال کی مدت ہو چکی تھی۔ انھوں نے پانی پت میں ملازمت حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد پانی پت سے نکلتے ہوئے ڈر لگتا تھا اس لیے حالی کا قیام پانی پت ہی میں رہا۔ حالی نے چار سال ضائع کرنے کے بجائے کتابوں کے مطالعے میں وقت گزارا۔ بقول حالی

> "اس عرصے میں پانی پت کے مشہور فضلا مولوی عبدالرحمٰن، مولوی محب اللہ اور مولوی قلندر علی مرحومان سے بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ کبھی حدیث کبھی تفسیر پڑھتا رہا اور جب ان صاحبوں میں سے کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا اور خاص کر علم و ادب کی کتابیں شروع اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھا کرتا تھا اور کبھی کبھی عربی نظم و نثر بغیر کسی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا۔ میری عربی اور فارسی کا منتہا صرف اسی قدر ہے جس قدر راوپر ذکر کیا گیا" [۲۴]

دلّی کی شعری محفلوں میں شرکت: حالی پہلی بار جب دلّی آئے تھے تو بہت کم عمر طالب علم تھے سترہ اٹھارہ سال عمر تھی اور چوں کہ انھیں علم حاصل کرنے کی لگن تھی اس لیے دلّی کی ادبی محفلوں اور مشاعروں سے دور رہے یا بہت کم ان میں شرکت کی۔ لیکن دوسری بار یعنی ۱۸۵۷ء کے بعد ۱۸۶۱ء میں ملازمت کی تلاش میں جب حالی دلّی آئے تو ان کی عمر تقریباً ۲۴ سال تھی۔ اب وہ صاحب علم تھے۔ فارسی اور عربی اور اس عہد کے دیگر مروّجہ علوم پر خاصی قدرت حاصل کر چکے تھے اس لیے انھیں خود پر اعتماد حاصل ہو چکا تھا۔ اور اب ان میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔

محمد اکرم خاں شیدا کا دیوان خانہ: دہلی میں محمد اکرم خاں شیدا کا دیوان خانہ ادبی مرکز بنا ہوا تھا۔ جہاں شعر و سخن کی محفلیں ہوتی تھیں۔ حالی بھی ان محفلوں میں

شریک ہونے لگے۔ حالؔی نے سید شجاع انور عرف امراؤ مرزا کے دیوان کا دیباچہ تحریر کیا تھا۔ جس میں لکھا ہے

''اتفاق یہ ہے کہ محبت نے جس قید خانے میں لے جا کر مقید کیا، سید انور بھی اسی قید خانے کے اسیر نکلے۔ مخدومی محمد کرم اللہ خاں شیدؔا کا دیوان خانہ جو دوستی اور صداقت کا مرکز اور آزادوں کا ملجا و ماویٰ اور زندہ دلی کا جنم بھوم ہے۔ سالہا سال وہاں شعر و سخن کی صحبتیں گرم رہیں اور ان صحبتوں میں سید انور، سید ظہیؔر اور مرزا سالکؔ اکثر شریک ہوتے تھے اور تھوڑی دیر کے لیے دنیا سے دستبردار ہو کر ہر شخص زبانِ حال سے اس شعر کا مضمون ادا کرتا تھا۔

بزمِ مے اچھی ہے گو دنیا ہے اے میخوار ہیچ
یاں سمجھ لیتے تو ہیں دنیا کو دم بھر یار ہیچ [۲۳]

اسی دیباچے میں آگے چل کر حالؔی لکھتے ہیں۔

''اس دیوان نے وہ قدیم کوچہ ہم کو پھر یاد دلایا ہے جس کی تیس برس خاک چھاننے کے بعد زمانے کی زبردستی سے اس کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ چکے تھے۔ اس میں بہت سی غزلیں ان مشاعروں کی ہیں جن پر دلّی کی شاعری کا خاتمہ ہونے والا تھا، اور جن میں بارہا سید انور، سید ظہیؔر اور مرزا سالکؔ کے ساتھ شریک ہو کر ہم نے ان کی ہم طرحی کی عزت حاصل کی تھی۔ کبھی کبھی نواب مرزا خاں داغؔ بھی رام پور سے آ کر ان مشاعروں میں مشتاقوں کی سامعہ نوازی کرتے تھے۔ اور شہر کے اکثر

شریف زادے اور امیر زادے، جن میں سے بہت سے چل بسے اور خال خال باقی ہیں، ہر طرح کی زمینوں میں زورِ طبع دکھاتے تھے۔ مرزا غالب مرحوم و مغفور کا اخیر زمانہ تھا۔ غالباً وہ خود کبھی ان جلسوں میں نہیں آئے مگر ان کی دیکھی ہوئی اور اصلاح دی ہوئی غزلیں برابر آتی تھیں اور پڑھی جاتی تھیں'' [۲۴]

رقص و سرود کی محفلوں میں شرکت: حبیب الرحمٰن شروانی کے نام حالی کے ایک خط مورخہ ۲۳/ اپریل ۱۹۰۴ء سے پتا چلتا ہے کہ حالی بہت حد تک دلی کی سماجی اور تہذیبی زندگی میں رنگ گئے تھے۔ وہ رقص و سرود کی محفلوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ شروانی اس محفل میں حالی کو بس ایک بار نظر آئے۔ ملاقات نہیں ہوئی۔ حالی شروانی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں

''دہلی میں بھی حکیم واصل خاں صاحب کے ہاں ہنگامۂ رقص و سرود گرم تھا، ایک بجلی کی سی چمک نظر آئی تھی، پھر برابر آنکھیں ترستی رہیں'' [۲۵]

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی مصاحبت: حالی کو دلی میں تلاشِ روزگار میں سرگرداں رہتے ہوئے تقریباً دو سال کی مدت گزر چکی تھی کہ ایک دن جہانگیر آباد کے نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے انھیں اپنی مصاحبت کی پیش کش کی جسے حالی نے منظور کرلیا۔ اس طرح حالی کی ملازمت کا مسئلہ طے ہوگیا۔

مالک رام کا بیان ہے کہ

''شیفتہ اپنے چھوٹے صاحب زادے نقش بند خاں کی اتالیقی کے لیے بہت فکر مند رہتے تھے کہ اُن کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہو جائے۔ اچانک خواجہ الطاف حسین حالی کی ملاقات کا

خیال اُن کے ذہن میں آیا اور انھوں نے سوچا کہ حالؔی جیسا علم و
فضل میں یکتا اتالیق بیٹے کی تعلیم کے لیے بہتر رہے گا، چناں
چہ انھوں نے حالؔی کو جہاں گیر آباد بیٹے کی اتالیقی کے لیے بلا لیا۔
حالی شیفتہ کے یہاں سات سال تک مقیم رہے'' [۲۶]

شیفتہؔ نے حالؔی کے بارے میں، تحریری طور پر کہیں بھی اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔ مالک رام صاحب نے حالؔی کے بارے میں شیفتہؔ کی جو رائے نقل کی ہے، مجھے اس کا علم نہیں کہ اُس کا مآخذ کیا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ مالک رام صاحب کے بیان کی بنیاد حالؔی سے اُن کی عقیدت اور حالؔی کے خاندان کے لوگوں سے اُن کے ذاتی تعلقات ہیں۔

صالحہ عابد حسین نے ''یادگارِ حالی'' میں حالؔی اور اس خاندان کے لوگوں کی مدلل مداحی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ حالؔی کی شیفتہؔ کے ہاں ملازمت کا واقعہ نقل کرتے ہوئے انھوں نے مالک رام صاحب کی طرح حالؔی کی بہت تعریف کی ہے۔ حالؔی اس تعریف اور توصیف کے یقیناً مستحق ہیں۔ لیکن یہاں یہ تعریف بے وجہ اور بے موقع ہے۔ صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں

''دِلّی میں اُن کی ملاقات نواب مصطفے خاں شیفتہؔ سے ہوگئی۔
شیفتہ اس ذہین، شریف، نیک سیرت نوجوان سے، جس نے
اس کم سنی ہی میں علم و فضل میں غیر معمولی قابلیت پیدا کرلی تھی
اور جس کا ذوقِ سخن نہایت پاکیزہ تھا، بہت متاثر ہوئے۔ انھوں
نے حالؔی کو جہاں گیر آباد بلا کر اپنے بچوں کی اتالیقی اُن کے سپرد
کردی'' [۲۷]

مالک رام اور صالحہ عابد حسین نے ان اقتباسات میں حالؔی کی بے موقع مدلل مداحی کی

ہے یہ بیانات درست نہیں کہ شیفتہ نے بقول مالک رام اپنے چھوٹے صاحب زادے نقش بند خاں اور بقول صالحہ عابد حسین شیفتہ نے حالی کو جہانگیر آباد بلا کر اپنے بچوں کی اتالیقی پر مقرر کیا۔ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے، اس کی بنیاد خود حالی کا اپنا بیان ہے۔ حالی لکھتے ہیں کہ آٹھ سات سال تک بطور مصاحبت اُن (شیفتہ) کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا اور یہی بات درست ہے۔ مالک رام صاحب اور صالحہ عابد حسین کو یہ محسوس ہوا کہ اگر حالی کو شیفتہ کا مصاحب بتایا جائے تو اردو ادب میں حالی کی قدر و قیمت کم ہو جائے گی حالاں کہ حالی یہ نہیں سوچتے تھے۔ انھوں نے خود کہا ہے کہ وہ شیفتہ کے مصاحب تھے۔ اگر وہ شیفتہ کے چھوٹے بیٹے نقش بند خاں یا اُن کے بچوں کے اتالیق ہوتے تو اس کا ذکر ضرور کرتے۔ شیفتہ کا مصاحب ہونا حالی کے لیے نہیں مالک رام اور صالحہ عابد حسین کے لیے شرم کی بات تھی۔

اپنے مختصر سوانح میں حالی نے لکھا ہے کہ

> ''حسن اتفاق سے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے جو فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے اور شاعری کا اعلیٰ درجے کا مذاق رکھتے تھے، شناسائی ہوگئی اور آٹھ سات سال تک بطور مصاحبت اُن کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا''[۲۸]

حالی نے ''ضمیمہ کلیاتِ ''نظمِ حالی اردو'' کے مقدمے میں شیفتہ سے ملاقات کے بارے میں لکھا ہے کہ حسن اتفاق سے ۱۸۶۳ء میں دہلی میں اُن کی ملاقات شیفتہ سے ہوگئی''۔

حالی نواب شیفتہ کے ادبی ذوق سے بہت متاثر تھے۔ شیفتہ کے بارے میں لکھتے ہیں

''نواب صاحب جس درجے کے فارسی اور اردو زبان کے شاعر تھے، اُس کی بہ نسبت اُن کا مذاقِ شاعری بمراتب بلند تر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا۔ انھوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اردو کلام مومن خاں کو دکھایا تھا مگر اُن کے مرنے کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورۂ سخن کرنے لگے تھے۔ میرے وہاں جانے سے اُن کا پرانا شعر و سخن کا شوق جو مدّت سے افسردہ ہو رہا تھا، تازہ ہو گیا اور ان کی صحبت میں میرا طبعی میلان بھی جو اب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا، چمک اُٹھا۔ اسی زمانے میں اردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب صاحب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انھیں کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا مگر در حقیقت مرزا کے مشورے و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا جو نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغے کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانا، اسی کو منتہائے کمالِ شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے۔

- نواب شیفتہ کے مذاق کا اندازہ اس ایک واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ایک روز انیس کے مرثیے کا ذکر ہو رہا تھا۔ انھوں نے انیس کے مرثیے کا یہ پہلا مصرعہ پڑھا۔

آج شبیر پہ کیا عالمِ تنہائی ہے

اور کہا کہ انیسؔ نے ناحق مرثیہ لکھا، یہی ایک مصرعہ بجائے خود ایک مرثیہ کے برابر تھا۔

ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہو گیا۔"[۲۹]

حالیؔ، شیفتہؔ کی مصاحبت میں بہت آرام سے زندگی گزار رہے تھے کہ ستمبر/اکتوبر ۱۸۶۹ء میں شیفتہؔ کا انتقال ہو گیا اور حالیؔ بے روزگار ہو گئے۔

لاہور میں گورنمنٹ بک ڈپو تھی، جس کا نام "پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو" تھا، اُس میں ایک جگہ خالی تھی۔ حالیؔ نے اس اسامی کے لیے درخواست دی، انھیں، ملازمت مل گئی۔ ہری چند اخترؔ اور موہن سنگھ دیوانہ نے لکھا ہے کہ حالیؔ کو یہ ملازمت پیارے لال آشوب کی سفارش پر ملی تھی۔[۳۰] عین ممکن ہے کہ ہری چند اخترؔ کا یہ بیان درست ہو۔ ایک تو اس لیے کہ بے وجہ دروغ گوئی کی کوئی وجہ نہیں ہے، دوسرے برطانوی حکومت میں ملازم ہونے کی وجہ سے آشوبؔ کے انگریز افسروں سے تعلقات اچھے تھے۔ بہر حال پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازم ہو کر حالیؔ لاہور چلے گئے۔

اس ملازمت کے بارے میں حالیؔ نے لکھا ہے۔

"نواب شیفتہؔ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں ایک اسامی مجھ کو مل گئی جس میں مجھ کو یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوتے تھے اُن کی اردو عبارت درست کرنے کو مجھ کو ملتی تھی۔ تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا۔ اُس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔"[۳۱]

حالؔی کا لاہور میں بالکل دل نہیں لگا، انھیں دلّی یاد آتی رہی۔ وہ چاہتے تھے کہ جس طرح ممکن ہو دلّی واپس چلے جائیں، لیکن ملازمت کی مجبوری نے اُن کے پیروں میں بیڑیاں ڈال رکھی تھیں۔ لاہور میں اُن کا کوئی ایسا دوست آشنا نہیں تھا جس پر وہ اعتماد کر سکتے۔ اس لیے تنہائی کے شدید احساس سے انھیں بہت تکلیف تھی۔ ستم بالائے ستم وہ وبائی امراض کا شکار ہو گئے۔ حالؔی نے اپنی اس بے بسی اور ذہنی پریشانی و کرب پر ایک غزل کہی تھی۔ غزل میں لاہور سے کبیدہ خاطری اور دلّی سے اپنی ذہنی وابستگی کا بیان غریب الوطنی اور پردیس میں تنہائی کے شدید احساس کا بھی حالؔی نے ذکر کیا ہے۔ یہ غزل دیوانِ حالؔی میں موجود ہے۔ اس غزل کے بارے میں حالؔی لکھتے ہیں۔

> "یہ غزل تقریباً ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء میں اُس وقت لکھی تھی جب کہ اوّل ہی اوّل بہ تقریبِ ملازمت دلّی چھوڑ کر لاہور جانا پڑا تھا، اُس وقت اوّل تو دلّی سے جدا ہونا ہی سخت شاق گزرا تھا، دوسرے لاہور میں کسی سے جان پہچان نہ تھی۔ وہاں پہنچتے ہی نہایت سخت وبا آئی اور وبائے ہیضہ کے بعد مدّت تک چیچک اور بخار کا زور شور رہا۔ آخر کار راقم بھی سخت بیمار ہو گیا، اس تنہائی اور سراسیمگی، غم و اندوہ کی حالت میں یہ اشعار لکھے گئے تھے"۔

دلاتی ہے صبا کس کو چمن یاد ... نہ میں بلبل نہ گھر میرا چمن ہے

کروں تجھ سے بیاں کچھ دردِ غربت ... مگر جوشِ سخن مُہرِ دہن ہے

رہے لاہور میں آکر سو جانے ... یہی دنیا ہے جو دارالمحن ہے

نہیں آتی کہیں یاں بوئے یوسف ... مگر جو گھر ہے وہ بیت الحزن ہے

یہاں بیگانگی ہے اس قدر عام — کہ بلبل ناشناسائے چمن ہے
نہ کچھ مجنوں کو ہے پروائے لیلیٰ — نہ کچھ شیریں کو دردِ کوہ کن ہے
مجھے تنہا نہ سمجھیں اہلِ لاہور — تصور میں مرے اک انجمن ہے
مری خلوت میں ہے ہنگامۂ بزم — خوشی میں مری ذوقِ سخن ہے
بتاؤں تم کو ہوں کس باغ کا پھول — جہاں ہر گل بجائے خود چمن ہے
بتاؤں تم کو ہوں کس مصر کی بُو — جہاں غربت وطن پر خندہ زن ہے
عدم کی راہ کٹ جاتی کبھی کی — مگر یادِ عزیز راہزن ہے
نہ لینے دے گا جنت میں بھی آرام — یہی گر جذبۂ مہرِ وطن ہے
گریں نظروں سے سب باتیں پرانی — مگر الفت کہ اک رسمِ کہن ہے
بھلا حالؔی اور الفت سے ہو خالی! — یہ سب تم صاحبوں کا حسنِ ظن ہے

کیا ہے اُس نے کہتے ہیں سخن ترک
مگر ہم کو ابھی اس میں سخن ہے

لاہور میں محکمۂ تعلیم کی طرف سے ''اتالیقِ پنجاب'' نام سے ایک رسالہ جاری ہوا۔ اس کے اڈیٹر پیارے لال آشوب تھے۔ حالی کچھ مہینوں اس رسالے کے سب اڈیٹر رہے مولانا محمد حسین آزاد نے بھی کچھ دنوں تک اس رسالے کے سب اڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ کچھ عرصے بعد ''اتالیقِ پنجاب'' بند ہو گیا اور پنجاب میگزین کے نام سے ایک اور رسالہ جاری ہوا۔ پہلے کچھ دن مولانا محمد حسین آزاد اور پھر حالی نے رسالے میں سب اڈیٹر کے طور پر کام کیا۔

حالی کے قیام لاہور کے دوران کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کے مشورے سے مولوی محمد حسین آزاد نے ۱۸۷۴ء میں ایک ایسے مشاعرے کی بنیاد ڈالی جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہندوستان میں بالکل نئی چیز تھی۔ اب تک مشاعروں میں طرحی مصرعے دیے جاتے تھے۔ لیکن پہلی بار محمد حسین آزاد نے مشاعروں کے لیے کسی عنوان کے تحت شاعروں کو مدعو کرنا شروع کیا۔ شاعر اس مضمون پر نظم میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ انھیں مشاعروں میں حالی نے چار مثنویاں لکھیں۔ مثنویوں کے عنوانات ہیں۔ برکھا رُت، حب وطن، نشاطِ اُمید اور مناظرۂ رحم و انصاف۔

لاہور میں چار سال رہنے کے باوجود، حالی کا اس شہر میں دل نہیں لگا۔ اس کی غالباً بڑی وجہ یہ تھی کہ لاہور کا سماجی ماحول دلّی کے ماحول سے بہت مختلف تھا۔ حسنِ اتفاق سے دہلی کے اینگلو عربک اسکول میں عربی کے مدرّس کی اسامی خالی ہوئی حالی نے اس اسامی کے لیے درخواست دی اور عربی کے مدرّس اول کی حیثیت سے اُن کا تقرر ہو گیا۔ چوں کہ حالی کو یہ اسکول اور کام دونوں پسند تھے، اس لیے انھوں نے بڑی محنت اور توجہ سے طلبہ کو عربی پڑھائی۔ طلبہ ان کے علم و فضل سے بہت متاثر تھے، اس لیے وہ حالی کی بہت عزت کرنے لگے۔

تیرہ چودہ سال یعنی ۱۸۷۵ء سے ۱۸۸۹ء تک حالی نے اس اسکول میں درس و تدریس کا کام کیا۔ اور اس دوران بقول ڈاکٹر وحید قریشی

> ''دلّی میں آکر شاعری کی طرف دھیان زیادہ رہا۔ اور تیرہ، چودہ سال کی مدت میں سوائے ''ناصر خسرو'' اور حیاتِ سعدی کے کوئی بڑا نثری کام نہیں کیا۔ دلّی کے اس قیام کی یاد ''مجموعہ نظم حالی کا بیشتر حصہ اور ''مسدسِ حالی'' ہے۔ ان منظومات کو اگر سنہ

وار دیکھا جائے تو ان کی صورت یہ بنتی ہے کہ مسدّس ۱۸۷۹ء
میں مثنوی ''تعصب وانصاف'' ۱۸۸۲ء میں ''مناظرۂ واعظ و
شاعر'' ۱۸۸۳ء میں۔ ''مناجاتِ بیوہ'' ۱۸۸۶ء میں اور حقوقِ
اولاد ۱۸۸۷ء میں لکھی گئیں''۔[۳۲]

ایچی سن کالج لاہور: ہری چند اختؔر اور موہن سنگھ دیوانؔہ نے لکھا ہے۔

''لاہور سے اینگلو عربک اسکول دہلی کی مدرسی پر بدل کر آنے کے
بعد اثنائے مدّرسی میں وہ لاہور کے ایچی سن کالج میں بھی آٹھ
مہینے تک اتالیق ہو کر رہے تھے''۔[۳۳]

جنوری ۱۸۸۷ء میں حالؔی کو ایچی سن کالج لاہور کے سربراہ کی طرف سے کالج کے سپرنٹنڈنٹ کی جگہ کے لیے پیش کش ہوئی۔ یہ کالج لفٹنٹ گورنر پنجاب سر چارلس کے نام پر قائم کیا گیا تھا۔ یہ حکومت ہند نے دیہی حکمرانوں اور رئیسوں کے بچوں کی تعلیم کے لیے قائم کیا تھا۔ کالج کا ایک ہوسٹل بھی تھا۔ اس کے لیے ایک سپرنٹنڈنٹ کی ضرورت تھی۔ حالؔی کے قیام لاہور کے زمانے سے وہاں کی ذمے دار شخصیتیں اور ادبی حلقہ ان کے اوصاف اور چال چلن سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہ ایک طرح کا حالؔی کے لیے سرٹیفکٹ تھا اور کالج کے ممبروں کے ذہن میں ان سے بہتر اس جگہ کے لیے کوئی دوسرا امیدوار نہیں تھا اس لیے حالؔی کو یہ اسامی پیش کی گئی۔ انھوں نے اس کو اپنے لیے اعزاز سمجھ کر سپرنٹنڈنٹ کی جگہ کے لیے منظوری بھیج دی، اور لاہور چلے گئےلیکن بقول مالک رام

حالؔی کو لاہور کی آب و ہوا پہلے بھی موافق نہ تھی اس بار بھی وہی
صورت پیش آئی اور ان کی صحت آہستہ آہستہ گرنے لگی۔ ایسی
حالت میں ان کی صحت کے مزید بگڑنے کا امکان کسی وقت بھی

ہو سکتا تھا۔

> یہاں ایچی سن کالج میں طالب علموں کے میل ملاپ اور اپنے حسن اخلاق سے ان پر اثر قائم کر دیا تھا اور دیسی ریاستوں کے رئیسوں کے لڑکے ان کی یگانگت اور محبت کی وجہ سے حالی کو بہت پیار دینے لگے تھے۔ اس طرح آہستہ آہستہ ان کی شہرت اور ہر دل عزیزی بڑھنے لگی اور وہ دنیاوی شہرت کے حق دار ہو گئے مگر حالی کے لیے لاہور میں زیادہ عرصے تک مقیم رہنا اس لیے ممکن نہ تھا کہ ان کی صحت خراب رہنے لگی تھی گھر سے باہر رہنے میں زندگی کی جو ضروریات ہوتی ہیں وہ وہاں اُن کو سب میسر تھیں۔ مستقبل بھی یہاں روشن تھا اور ان کے گزر اوقات کے لیے جو رقم ماہانہ انھیں ملتی تھی اس سے وہ مطمئن تھے مگر اپنی خرابی صحت کی وجہ سے ان کا دماغ بے اطمینان سا رہتا تھا۔ اس لیے انھوں نے چھ مہینے بعد ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور واپس دلّی آ گئے، جون ۱۸۸۷ء میں اپنی سابق ملازمت اینگلو عربک اسکول میں استاد کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔[۳۴]

لیکن حالی کی تحریر سے صالحہ عابد حسین کے بیان کی تردید ہوتی ہے۔ حالی نے لکھا ہے کہ ۱۸۷۷ء میں ان کا تبادلہ ایچی سن کالج میں لاہور کے بورڈنگ ہاؤس میں طلبہ کی اتالیقی پر ہوا، لیکن انھیں طلبہ کا رویہ پسند نہیں آیا۔ تین مہینے بعد وہ ۵ رجون ۱۸۸۷ء کو اینگلو عربک اسکول میں اپنی پرانی جگہ پر واپس آ گئے۔

۱۸۷۴ء کے اواخر یا ۱۸۷۵ء کے اوائل میں اینگلو عربک اسکول، دلّی میں عربی کے مدرسِ اوّل کی حیثیت سے حالی کا تقرر ہوا تھا۔ یہ ملازمت اُن کے مزاج کے مطابق

تھی۔ وہ بڑی محنت اور توجہ سے طلبہ کو پڑھاتے تھے، حالی تقریباً تیرہ چودہ سال تک اس اسکول میں پڑھاتے رہے۔

حیدر آباد سے وظیفہ: حالی ۱۸۸۷ء میں اینگلو عربک اسکول دہلی میں مدرّس تھے۔ حیدر آباد کے نواب سر آسمان جاہ بہادر نظام حیدر آباد کی سرکار میں مدار المہام تھے۔ وہ شملے جاتے ہوئے علی گڑھ آئے اور سر سید احمد خاں کی کوٹھی پر مقیم ہوئے۔ اس وقت حالی بھی علی گڑھ ہی میں تھے۔ سر آسمان جاہ بہادر حالی اور ان کے ادبی کارناموں سے واقف تھے جب حالی سے ملاقات ہوئی تو وہ اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے حالی کا پچھتر روپے ماہوار کا وظیفہ امدادِ مصنفین کے صیغے سے مقرر کر دیا۔ جب نواب آسمان جاہ نے حالی کو وظیفے کی پیش کش کی تو

> "سر سید نے حالی سے پوچھا تھا کہ آپ کے لیے کتنا وظیفہ مقرر کیا جائے تو انھوں نے وہی رقم بتائی جو انھیں عربک اسکول سے ملتی تھی"، [۲۵]

اگرچہ حالی کا وطنِ اصلی پانی پت تھا۔ پیدائش کے وقت ہی سے اس شہر سے اُن کا سینکڑوں سال کا ذہنی رشتہ تھا، لیکن پانی پت کے مقابلے میں انھیں دتی سے زیادہ محبت تھی اور زیادہ ذہنی لگاؤ تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ دتی علم و فن اور شعر و ادب کا گہوارہ تھا۔ حالی نے ۱۸۵۷ء سے پہلے کے اُس دتی شہر کو دیکھا تھا۔ جو اگرچہ برباد ہو چکا تھا لیکن انجمن آرائی اور بعض دوسری وجوہ سے اب بھی عالم میں انتخاب شہر تھا۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے حالی تقریباً دو سال دتی رہ کر ۱۸۵۵ء میں گھر والوں کے اصرار پر پانی پت چلے گئے۔ غدر کے بعد وہ پھر دتی آئے۔ انھوں نے ڈیڑھ دو سال یہاں قیام کیا تھا کہ نواب شیفتہ کے مصاحب بن کر جہانگیر آباد چلے گئے۔ ۱۸۷۵ء میں وہ لاہور کی ملازمت ترک کر کے اینگلو عربک اسکول میں عربی کے مدرّس کی حیثیت سے

آگئے۔اس دفعہ وہ تیرہ چودہ سال دلّی میں رہے۔پھر مستقل طور پر پانی پت چلے گئے ۔کبھی کبھار کسی کام سے دلّی آتے تو مختصر وقت کے لیے۔اس طرح زندگی کے بیس سال حاؔلی نے دلّی میں گزارے۔دلی نے حاؔلی کے ذہن پر ایسے نقش مرتب کیے جو زندگی بھر قائم رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بقول ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

"حاؔلی کے ذہنی ارتقا، ادبی نشو ونما، شعور کی پختگی، کردار کی بلندی میں سب سے زیادہ اہمیت دلّی کو ہے۔"

حاؔلی نے اس دلّی کو دیکھا جسے آسمانِ ادب کے چاند ستاروں نے منور کر رکھا تھا اس شہر میں اُس عہد کی ممتاز ترین ادبی شخصیتوں سے حاؔلی کو قربت حاصل رہی تھی۔حاؔلی کو ان لوگوں کی یاد زندگی بھر تڑپاتی رہی۔

حالات سے مجبور ہو کر جب حاؔلی کو دلّی چھوڑنی پڑی تو انھیں بہت سخت تکلیف ہوئی۔ اس تکلیف کا اظہار انھوں نے اس شعر میں کیا ہے۔

دلّی سے نکلتے ہی ہوا جینے سے دل سیر
گویا نہ رہا اب کہیں دنیا میں ٹھکانا

۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب سے متاثر ہو کر دلّی کی بربادی پر مختلف شاعروں نے خاصی بڑی تعداد میں اشعار اور مرثیے کہے ہیں۔مگر حاؔلی نے ۲۳ جو اشعار کہے ہیں، اُن کی اردو میں کوئی اور مثال نہیں ہے۔ہر شعر درد و غم کی مکمل تصویر ہے۔یہ اشعار بہت مشہور ہیں، لیکن عام طور پر چند اشعار ہی اہلِ علم کے ذہنوں میں محفوظ ہیں۔اس لیے میں تمام اشعار نقل کر رہا ہوں۔

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

داستانِ گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز

ڈھونڈتا ہے دلِ شیدا بہلانے مطرب
درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

موجزن دل میں ہیں یاں خون کے دریا اے چشم
دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز

لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانا ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی انہیں بھول گئے
ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ ہرگز

جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانا ہرگز

ہم کو گر تو نے رُلایا تو رلایا اے چرخ
ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز

یار خود روئیں گے کیا ان پہ جہاں رتا ہے
اُن کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ آنا ہرگز

آخری دور میں بھی تجھ کو قسم ہے ساقی
بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز

بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دورِ زماں
نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز

یاں سے رخصت سویرے کہیں اے عیش و نشاط
نہیں اس دور میں یاں تیرا ٹھکانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمھارا دلی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

شاعری مرچکی اب زندہ نہ ہوگی یارو
یاد کر کر کے اسے جی نہ کڑھانا ہرگز

غالبؔ و شیفتہؔ و تیرؔو آزردہؔ و ذوقؔ — اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز
مومنؔ و علویؔ وصہبائیؔ و ممنونؔ کے بعد — شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
کرو یا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو — ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانا ہرگز
داغؔ و مجروحؔ کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں — نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر — اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانا ہرگز

بزمِ ماتم تو نہیں، بزمِ سخن ہے حالیؔ
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

حالیؔ کا مکان: حالیؔ کا موروثی مکان پانی پت کے محلہ انصاریان میں تھا۔ بعض وجوہ سے حالیؔ کے لیے اس مکان میں گزارا مشکل ہو گیا۔ مکان شہر کے بیچوں بیچ تھا جہاں ملنے والوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کے علمی اور ادبی کاموں میں خلل پڑتا تھا دوسرے ان کے بڑے صاحب زادے خواجہ اخلاق حسین کے بیوی بچے اکثر یہاں آکر رہتے تھے، اس سے بھی حالیؔ کے علمی کاموں میں خلل پڑتا تھا۔ پانی پت کے ریلوے اسٹیشن سے نسبتاً دور ایک محلہ تھا، جو حالیؔ کا ننھیالی اور سسرالی محلہ تھا۔ یہاں ایک پرانا مکان تھا جو حالیؔ کی ملکیت تھا۔ خواجہ سجاد حسین کے مشورے پر طے پایا کہ پرانا مکان گرا کر اس زمین پر نیا مکان بنالیا جائے۔ خواجہ سجاد حسین کی تنخواہ بہت زیادہ نہیں تھی اور پھر وہ بہت شاہ خرچ بھی تھے۔ لیکن والد کے آرام کے خیال سے وہ مکان کی تعمیر کے لیے حالیؔ کو روپے بھیجتے رہے اور حالیؔ مکان بنواتے رہے سات سال کی مدّت میں تعمیر مکمل ہوئی۔ حالیؔ نے خواجہ تصدق حسین کے نام ایک خط مورخہ ۷؍مارچ ۱۸۹۰ء کو لکھا ہے۔

"مجھے نئے مکان میں آئے ہوئے تیرہ روز ہوئے مگر اب تک

مکان کی درستی اور خاص کر اپنے کمرے کا نہایت ضروری فرنیچر
مہیا کرنے سے آج تک فرصت نہیں"۔[۳۶]

اس کا مطلب ہے کہ حالی ۲۳ر یا ۲۴ر فروری ۱۸۹۰ء کو اپنے نئے مکان میں منتقل ہو گئے تھے۔

صالحہ عابد حسین کا کہنا ہے کہ یہ مکان ۱۸۹۶ء میں تیار ہو گیا تھا۔ صالحہ صاحبہ کا یہ بیان درست نہیں معلوم ہوتا۔ کیوں کہ حالی کا جو خط اوپر نقل کیا گیا ہے اس کے مطابق یہ مکان ۱۸۹۰ء میں تیار ہو گیا تھا اور ۱۸۹۰ء میں حالی اس مکان میں منتقل ہو گئے تھے۔ اس مکان کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے صالحہ صاحبہ نے لکھا ہے۔

"اس میں نیچے پرانے قسم کی زنانہ صحچیاں، کوٹھڑیاں اور صحن چبوترہ وغیرہ۔ اوپر ایک خاصا بڑا ہوا دار کمرہ، غسل خانہ اور دوسری طرف نسبتاً چھوٹا کمرہ تھا۔ اوپر کا حصہ دیوان خانہ تھا جس میں بڑے کمرے میں مولانا حالی رہتے تھے آنے جانے کے لیے ایک زینہ اندر گھر میں جاتا تھا۔ اور دوسرا باہر دروازے میں نکلتا تھا۔ مرد باہر سے اوپر آ جا سکتے تھے"۔[۳۷]

یہ مکان اب بھی تقریباً اصل حالت میں موجود ہے۔ دس بارہ سال پہلے ہریانہ اردو اکاڈمی نے پانی پت میں حالی پر قومی سیمنار منعقد کیا تھا۔ میں بھی اس سیمنار میں شریک ہوا تھا۔ اس موقع پر منتظمین ہمیں حالی کے اس مکان میں لے گئے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ مکان کے مالک ایک سردار صاحب تھے۔ بہت ہی مہذب اور با اخلاق۔ انھوں نے ہم لوگوں کا بہت خوش دلی سے استقبال کیا۔ ان کا اصرار تھا کہ ہم سب چائے پی کر جائیں۔ لیکن وقت کم ہونے کی وجہ سے ہم لوگ چائے نہیں پی سکے۔ ہماری فرمائش پر سردار صاحب ہمیں اندر گھر میں لے گئے اور پورا گھر دکھایا۔

حالی کی گھریلو پریشانیاں مختلف لوگوں کے نام حالی کے بعض خطوط ایسے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ اُن کے گھریلو حالات خاصے پریشان کُن تھے۔ پوری کوشش کے باوجود بھی ان حالات کے خرابی کے مکمل اسباب معلوم نہیں ہو سکے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ حالی کی صاحبزادی عنایت فاطمہ کے لڑکے عبدالولی کو مرگی کے دورے پڑتے تھے، جس کی وجہ سے حالی کو بہت زیادہ پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن یہ دورے ۱۹۰۴ء سے پڑنا شروع ہوئےتھے، جب کہ حالی نے حافظ محمد یعقوب مجدّدی کے نام ۱۷ فروری ۱۸۸۹ء کے خط میں لکھا ہے

> ''میں اُسی گھر کے جھگڑے میں ایسا غلطاں و پیچاں ہوں کہ کسی چیز کی خبر نہیں۔ اسی وجہ سے جواب بھیجنے میں دیر ہو گئی'' [۲۸]

حالی کی بیوی کا مزاج بہت تیز تھا، ممکن ہے اس کی وجہ سے گھر کا ماحول خراب ہو۔ صالحہ عابد حسین صاحبہ نے ''یادگارِ حالی'' میں اس کا اعترا ف کیا ہے کہ حالی کی بیوی سیدہ امتہ الرسول مزاج کی بہت گرم تھیں۔ لیکن انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ حالی اپنی بیوی کی گرم مزاجی کو بڑی نرمی اور محبت سے برداشت کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ جائداد کا کوئی خاندانی جھگڑا ہو، مگر ہمیں اس سلسلے میں ابھی تک کوئی شہادت نہیں ملی۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حالی کی بیٹی عنایت فاطمہ کی شادی خواجہ عبدالعلی سے ہوئی تھی۔ خواجہ عبدالعلی کچھ اچھے انسان نہیں تھے۔ انھوں نے اپنی بیوی اور حالی دونوں کو ہمیشہ پریشان رکھا۔ کئی خطوط میں حالی نے اپنے گھر کے ماحول کی خرابی کا ذکر کیا ہے عبدالعلی کسی چھوٹی جگہ پر ملازم تھے اور ملازمت کے سلسلے میں اُن کا قیام مختلف شہروں میں ہوتا تھا۔ مولوی محمد احسان اللہ خاں ثاقب کے نام ۱۰ فروری 1905 کے ایک خط میں حالی نے لکھا ہے کہ

> ''دو تین مہینے سے خود عوارضِ نزلہ میں الجھا ہوا ہوں۔ ادھر میرا ایک نوجوان نواسا مرضِ صرع میں مبتلا ہے۔ جس کے علاج کے

لیے سوا مہینے دہلی میں ٹھہر کر ابھی آیا ہوں۔ پھر اس کا باپ (عبدالعلی) سخت بیمار ہو کر رام پور سے آیا ہے۔ اِن مکروہات میں اتنی مہلت نہیں ملتی کہ اپنی تحریراتِ نظم یا نثر نقل کر کے خدمتِ شریف میں بھیج سکوں"۔[۳۹]

حالیؔ نے اپنے ایک شاگرد عبدالرحیم خاں بیدلؔ کے نام (تاریخ ندارد) خط میں لکھا ہے۔

عبدالولی، جس کے علاج کو دہلی گیا تھا، اس کے صرع کے دورے تو رک گئے مگر جنون بڑھتا جاتا ہے میرا ناک میں دم ہے۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ زندگی وبال ہو گئی ہے۔ یہ یقین ہو گیا ہے کہ زیست کے برس دو برس جو باقی ہیں بہت بری طرح سے گزریں گے"۔[۴۰]

حالیؔ نے نواب وقارالملک کو ایک خط میں عبدالولی کے بارے میں لکھا ہے۔

"میرے نواسے کو جس کی عمر ۹ سال ہے، چار برس سے صرع کا مرض عارض ہے۔ علاقہ تحصیل کرنال میں ایک زمین دار صرع کا علاج کرتا ہے، وہاں اس لڑکے کو لے جاتا ہوں۔ جلدی کا سبب یہ ہے کہ وہ ساون کے مہینے میں علاج کرتا ہے، جس کے کل پانچ چار دن رہ گئے ہیں"۔[۴۱]

حالیؔ اپنی بیٹی اور نواسے کی طرف سے بہت پریشان تھے۔ انھوں نے کئی دفعہ یہ ارادہ کیا کہ پانی پت چھوڑ کر کہیں ایسی جگہ چلے جائیں جہاں اِن ذہنی پریشانیوں سے نجات مل سکے۔ لیکن بیٹی اور نواسے کا خیال مانع رہا۔ اپنے شاگرد خواجہ لطیف احمد کو ایک خط مورخہ ۱۱رنومبر ۱۹۰۵ء کو حالیؔ لکھتے ہیں۔

"کئی دفعہ گھر سے نکلنے کا ارادہ کر چکا ہوں اور ہر وقت یہی سوچتا رہتا ہوں کہ کیوں کر اس دلدل سے نکلوں مگر عبدالولی کی بیماری جس کی کلفتوں کے سبب میں گھر سے نکلنا چاہتا ہوں، وہی مانع آتی ہے کیوں کہ میرے سوا کوئی متنفس سارے کنبے میں ایسا نہیں کہ اس کی ماں کی اس مصیبت کے وقت میں کچھ مدد کرے۔ حیران ہوں کہ کیا کروں۔ پانی پت میں رہ کر کوئی کام مجھ سے سرانجام نہیں ہو سکتا اور نہ کسی نوعیت کی یہاں آسائش میسر ہے جس کی بڑھاپے میں زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ باوجود اس کے کسی طرح کی نکاسی کی صورت نظر نہیں آتی" [۱۴۲]

حالی نے محمد احسان اللہ خاں ثاقب کو ۲؍اپریل ۱۹۰۵ء کو جو خط بھیجا تھا، اس میں لکھتے ہیں

"مجھے اپنے ایک نوجوان نواسے کی بیماری نے جو صرع اور کسی قدر جنون میں مبتلا ہے بالکل پاگل بنا دیا ہے۔ اس کا باپ مر گیا ہے [۱۴۳] اور بھائی پردیس میں ملازم ہے میں اور اس کی ماں ہر وقت اس کی فکر میں غلطاں پیچاں رہتے ہیں" [۱۴۴]

عبدالولی کی وجہ سے حالی کی دو پریشانیاں تھیں۔ ایک تو یہ کہ عبدالولی اور بیٹی عنایت فاطمہ کی اخراجات کی پوری ذمے داری حالی پر تھی۔ ایک زمانے میں عبدالولی کی دوا پر پچیس روپے ماہانہ خرچ ہوتا تھا اور پھر حالی جب بھی کسی بھی شہر کے ڈاکٹر حکیم یا وید کے بارے میں سنتے کہ وہ مرگی کا علاج کر سکتا ہے تو وہ نواسے کو لے کر اس کے پاس پہنچ جاتے۔ سفر میں عبدالولی کے علاوہ ان کے ساتھ ایک ملازم بھی ہوتا۔ سفر کے آمد و رفت اور قیام کا خرچ اتنا ہوتا تھا کہ حالی پریشان ہو جاتے۔ حالی کے مالی وسائل

خاصے محدود تھے۔ اس لیے انھیں کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی عبدالولی کو دورے میں ایسا تشدّد پیدا ہو جاتا کہ وہ ہوش و حواس کھو بیٹھتے۔ اور حالی اور اپنی والدہ کو بہت پریشان کرتے بقول صالحہ عابد حسین

''ایک دفعہ عبدالولی پر ایسی شدّت کا دورہ پڑا کہ انھوں نے حالی کو دھکا دے دیا، جس سے حالی گر پڑے۔ اس وقت خواجہ سجاد حسین موجود تھے۔ اُن سے عبدالولی کی یہ گستاخی برداشت نہ ہو سکی، انھوں نے عبدالولی کو ڈانٹا اور طمانچہ بھی مار دیا۔ یہ بات حالی کو سخت ناگوار گزری۔ جب تک سجاد حسین نے عبدالولی کو منا نہیں لیا۔ حالی نے اُن سے بات نہیں کی''۔[۱۵]

ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ حالی ۷۵۔۷۶ سال کی عمر میں سکون کی تلاش میں مختلف شہروں میں مارے مارے پھرنے لگے، کیوں کہ اگر وہ پانی پت میں رہتے تو عبدالولی کی وجہ سے کوئی علمی کام نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے وہ علی گڑھ، دہلی، فرید آباد، گوڑگاؤں جیسے شہروں میں جا کر اپنے عزیزوں اور دوستوں کے یہاں قیام کرتے اور جہاں انھیں علمی اور ادبی کام کرنے کا کچھ موقع مل جاتا۔ حالی کے ایک دوست خلیفہ سید محمد حسین، انھیں کو اپنے پاس بلانا چاہتے تھے۔ حالی خواجہ لطیف احمد کے نام ایک خط مورخہ ۶ رجون ۱۹۰۵ء میں لکھتے ہیں۔

''جناب خلیفہ سید محمد حسین صاحب مجھے شملے کے ایک مقام پر جو سری نگر یا کنڈا گھاٹ کے نام سے مشہور ہے، بلاتے ہیں۔ مگر چوں کہ وہاں ریل جاتی ہے اور کالکا سے زیادہ دور نہیں ہے اس لیے مجھے وہاں جانے میں تامل ہے۔ کیوں کہ جب گھر پر ضرورت ہوگی، فوراً آدمی وہاں پر پہنچیں گے اور مجھے چار و

ناچار پھر گھر آنا پڑے گا"[46]

پھر حالی ۶ رجون ۱۹۰۵ء کے ایک اور خط میں خواجہ لطیف احمد کو اپنی ذہنی تکلیف سے اِن الفاظ میں مطلع کرتے ہیں۔

"میری حالت اب ایسی ہے کہ گھر کے سوا جہاں جا کر رہوں گا، وہاں میرا ہونا سب برباد ہو جائے گا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ وہاں بھی چین کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ میرے حسب حال ذوق کا یہ شعر ہے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے"[47]

حالی کی پریشانی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اکثر ملاقاتی گھر آ کر اُن کا وقت ضائع کرتے تھے۔ عبدالولی کی تیمارداری سے جو وقت بچتا وہ میزبانی میں خرچ ہو جاتا۔ اس لیے حالی چاہتے تھے کہ پانی پت چھوڑ کر علی گڑھ چلے جائیں۔ انھوں نے محمود احمد عباسی کو ۲۵ رستمبر ۱۹۰۸ء کے ایک خط میں لکھا تھا۔

"میں مدت سے ارادہ کر رہا ہوں کہ علی گڑھ میں بقیہ زندگی بسر کروں۔ اگرچہ میں اب سوسائیٹی میں رہنے کے قابل نہیں رہا اور تخلیہ اور تنہائی کو زیادہ پسند کرتا ہوں اور کسی مفید کام کے کرنے کی بھی اب قابلیت نہیں رہی، لیکن اس خطے سے بالطبع موانست ہے اور گھر پر ان وجوہ کے سبب جن کو آپ خوب جانتے ہیں اب رہنا ناممکن ہو گیا ہے"[48]

حالی کو شمس العلماء کا خطاب اور انعام: حالی کے زمانے میں کسی بھی

عالم یا ادیب کے لیے سب سے بڑا اعزاز شمس العلما کا خطاب تھا۔ کرنل ہالرائیڈ کی سفارش پر حکومت نے حالؔی کو شمس العلما کے خطاب سے نوازا اور چار سو روپے نقد انعام دیا۔ حالؔی کو یہ انعام "مجالسِ النسا" پر دیا گیا تھا۔ یہ کتاب قصے کے انداز میں ہے جو حالؔی نے لڑکیوں کے لیے لکھی تھی۔ اس کتاب کو بہت مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی اور مدتوں یہ کتاب پنجاب اور اودھ میں لڑکیوں کے نصاب میں شامل رہی۔

یہ اعزاز اور انعام حالؔی کو جون ۱۹۰۴ء میں منعقد ہونے والے ایک علمی دربار میں ہندوستان کے وائسرائے نارتھ بروکؔ نے کو پیش کیا۔ حالؔی اس انعام سے خوش بھی تھے اور پریشان بھی۔ خوش اس لیے تھے کہ انھیں یہ اعزاز حاصل ہوا لیکن اپنی پریشانی کا سبب کہ انھوں نے خواجہ سجاد حسین کے نام ایک خط میں اس انعام کے بارے میں لکھا ہے کہ

> "خطاب کی تحریک جہاں تک معلوم ہوئی ہے برخوردار تصدق حسین نے معرفت ڈائرکٹر صاحب کے دربار تاجپوشی سے بہت پہلے کی تھی۔ کیوں کہ انھوں نے ڈائرکٹر صاحب کو دینے کے لیے میرے پاس سے میری سب کتابیں اس زمانے میں منگوائی تھیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر آرنلڈ نے ڈائرکٹر صاحب کو میرے حالات سے بخوبی مطلع کر دیا تھا اور اس باب میں بھی تصدّق حسین برخوردار نے بہت کچھ تائید کی تھی۔ کیوں کہ خطاب کے شائع ہونے کے بعد انھوں نے مجھے لکھا تھا کہ میں نے ڈائرکٹر صاحب کو اور آرنلڈ صاحب کو اسی معاملے کے متعلق ولایت چٹھیاں بھیجی ہیں۔ اس سے پہلے سائم صاحب کے زمانے میں ماسٹر پیارے لال صاحب نے میرے اور مولانا نذیر احمد صاحب کے لیے ضرور تحریک کی تھی۔ مگر اس

وقت معلوم نہیں کیوں التوا ہوا۔

اگر چہ گورنمنٹ کی طرف سے یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس کی ہمارے ہم چشم آموزو رکھتے ہیں۔ مگر مجھے تو ایک مصیبت معلوم ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں کسی حاکم یا افسر سے کبھی نہ ملتا تھا اور ایسے مواقع سے ہمیشہ الگ تھلگ رہتا تھا۔ مگر اب جب کوئی حاکم ضلع پانی پت میں آوے گا یا جب کوئی نیا ڈپٹی کمشنر کرنال میں بدل کر آوے گا لامحالہ وہاں جانا پڑے گا۔ آج چوتھا روز ہے کہ ٹامسن صاحب ڈپٹی کمشنر کرنال کی خدمت میں حسبِ تحریر برخوردار تصدق حسین کے گیا تھا وہ چوں کہ نہایت مہذب اور خلیق ہیں بہت اچھی طرح ملے اور یہ بھی کہہ دیا کہ میں آج ہی پانی پت جاتا ہوں وہاں تفصیلی ملاقات ہوگی۔ چناں چہ وہ تین روز سے یہاں آئے ہوئے ہیں اور کل اُن کے ملنے کو جاؤں گا۔ انھوں نے میری کتابوں کے دیکھنے کی بھی خواہش کی ہے وہ بھی اِدھر سے اُدھر سے مانگ تانگ کر لے جاؤں گا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ درگاہ قلندر صاحب اور کابل باغ وغیرہ عمارتِ قدیمہ کے دیکھتے وقت مجھے بھی بلایا جاوے گا۔ بھلا میں کہاں اور یہ دردِ سر کہاں؟" [۴۹]

حالی کو یہ اعزاز ملنے پر اُن کے مداحوں اور چاہنے والوں کے مبارک باد کے خطوط و تاروں کا تانتا بندھ گیا۔ حالی نے شروع میں تو دس بیس خطوں کا جواب دیا۔ پھر ان کے بس کا نہیں رہا۔ انھوں نے سوچا کہ اخبار کے ذریعے خطوط اور تار والوں کا شکریہ ادا کر دیں۔ ۲ر جولائی ۱۹۰۴ کے خط میں انھوں تصدق حسین کو لکھا۔

> ''برخوردار سعادت اطوار سلمہم اللہ تعالیٰ مبارکباد کے تار اور خط کا اور اس بڑی کوشش کا جو اسباب میں کی گئی ہے، شکریہ قبول ہو۔ اس خط کے اب ملنے پر جو خوشی اور دلچسپی پبلک کی طرف سے ظاہر ہوئی ہے۔ وہ بالکل توقع اور امید سے بالاتر ہے۔ مبارکباد کے تاروں اور خطوں کا اس قدر روزانہ ہجوم رہتا ہے کہ اول اول دس بیس کا جواب دینے کے بعد اب اس کے سوا کچھ چارہ نہیں معلوم ہوتا کہ بذریعہ اخبارات کے عام طور پر سب کا شکریہ ادا کر دیا جائے''۔[۵۹]

کوشش کے باوجود مجھے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ حالؔی کو شمس العلما کا خطاب اور چار سو روپے کا انعام دونوں ایک ساتھ ملے تھے یا الگ الگ۔

حالی کی سیرت : انتہائی مہذب، شریف، نیک دل، دردمند، خلوص، محبت، شفقت اور انسانی ہمدردی کا پیکر، قناعت و استغنا کی اعلاترین مثال۔ فراخ دل، روا دار، اسلامی اور ہندوستانی تہذیب کے جیتے جاگتے نمونے کا نام الطاف حسین حالؔی ہے۔ خاکساری اور عاجزی حالؔی کے مزاج میں کوٹ کوٹ کے بھری تھی۔ حالؔی بہت صابر شاکر اور درویش صفت انسان تھے وہ بہت صابر، شاکر، قانع اور درویش صفت انسان تھے۔ اگرچہ ان پر خاندان کے بعض افراد کا بہت بوجھ تھا۔ لیکن وہ پہلے پچھتر روپے ماہوار اور پھر سو روپے ماہوار کے وظیفے پر قانع رہے۔ حالاں کہ وہ معمولی سی کوشش کرتے تو حیدر آباد اسٹیٹ سے ملنے والے وظیفے میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا تھا۔ یا مزید آمدنی کا کوئی اور ذریعہ بھی پیدا ہو سکتا تھا۔

حالؔی بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت کرتے تھے۔ وہ چھوٹوں کا بھی ادب کرتے تھے۔ مولوی عبدالحق اور حمید الدین مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طالب علم تھے اس

دوران حالی علی گڑھ آئے ہوئے تھے۔ یہ دونوں ملاقات کے لیے حالی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حالی ان دونوں کے استقبال کے لیے کھڑے ہو گئے۔ حمید الدین نے مودبانہ عرض کیا کہ ہمارے استقبال کے لیے کھڑے ہو کر آپ شرمندہ کرتے ہیں۔ حالی نے جواب دیا۔ "آپ لوگوں کی تعظیم نہ کروں تو کس کی کروں، آئندہ آپ ہی تو قوم کے ناخدا ہونے والے ہیں۔

اب میں کچھ ایسے واقعات سنانا چاہتا ہوں، جس سے حالی کی انسانی عظمت کا پتا چلتا ہے۔ مولوی عبدالحق کو حالی سے بہت عقیدت تھی اور انھیں حالی سے قربت بھی حاصل تھی۔ مولوی صاحب کے نام حالی کے خطوط بھی سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی صاحب حالی کو بہت عزیز تھے۔ عبدالحق نے حالی کا بہت دلچسپ خاکہ لکھا ہے، جس میں حالی کی خوبیوں کو دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے خاکے کے شروع میں ایک ایسا واقعہ بیان کیا ہے۔ جس سے حالی کی انسان دوستی اور دردمندی کا پتا چلتا ہے۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں

> "یہ ۱۹۰۵ء کا ذکر ہے جب غفران مآب اعلیٰ حضرت مرحوم کی جوبلی بلدہ حیدر آباد اور تمام ریاست میں بڑے جوش اور شوق سے منائی جا رہی تھی۔ مولانا حالی بھی اس جوبلی میں سرکار کی طرف سے مدعو کیے گئے تھے اور نظام کلب کے ایک حصے میں ٹھہرائے گئے۔ زمانہ قیام میں اکثر لوگ صبح سے شام تک ان سے ملنے کے لیے آتے تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک صاحب جو علی گڑھ کالج کے گریجویٹ اور حیدر آباد میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے۔ مولانا سے ملنے آئے۔ ٹم ٹم پر سوار تھے، زینے کے قریب اترنا چاہتے تھے۔ سائیس کی جو شامت آئی تو اس نے گاڑی دو قدم آگے جا کر کھڑی کی۔ یہ حضرت اس

ذرا سی چوک پر آپے سے باہر ہو گئے اور ساڑ ساڑ کئی ہنٹر غریب
کے رسید کر دیے۔ مولانا یہ نظارہ اوپر برآمدے میں کھڑے دیکھ
رہے تھے اس کے بعد وہ کھٹ کھٹ سیڑھیوں پر سے چڑھ کر اوپر
آئے مولانا کا چہرہ بالکل متغیر تھا وہ برآمدے میں ٹہلتے جاتے
تھے اور کہتے تھے۔ ''ہائے ظالم نے کیا کیا''۔ اس روز کھانا بھی
اچھی طرح نہ کھا سکے کھانے کے بعد قیلولے کی عادت تھی وہ بھی
نصیب نہ ہوا۔ فرماتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ہنٹر کسی
نے میری پیٹھ پر مارے ہیں۔ اس کیفیت سے جو کرب اور درد
مولانا کو تھا وہ شاید اس بدنصیب سائیس کو بھی نہ ہوا ہوگا''۔ [۵۱]

مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ مجھے اپنے زمانے کے نامور اصحاب اور اپنی قوم کے اکثر شخصیتوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ لیکن مولانا حالؔی جیسی پاک سیرت اور خصائل کا بزرگ مجھے ابھی تک کوئی نہیں ملا۔

نواب عمادالملک نے ایک دفعہ حالؔی کی سیرت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا کہ

''سرسید کی جماعت میں بہ حیثیت انسان کے مولانا حالؔی کا پایہ
بہت بلند تھا، اس بات میں سرسید بھی انھیں نہیں پہنچتے تھے''۔ [۵۲]

حالؔی کی خاکساری اور عاجزی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے اپنی تصنیفات پر کبھی ''مصنفہ'' نہیں لکھا، بلکہ ہمیشہ ''مرتبہ'' یا مولّفہ لکھتے تھے۔

مولوی عبدالحق نے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سفیر مولوی انوار احمد مرحوم کہتے تھے کہ ایک بار وہ پانی پت گئے۔

''جاڑوں کا زمانہ تھا اندھیرا ہو چکا تھا اسٹیشن سے سیدھے مولانا

کے مکان پر پہنچے، دالان کے پردے پڑے ہوئے تھے، انھوں نے پردہ اٹھایا اور جھانک کر دیکھا، مولوی صاحب فرش پر بیٹھے تھے، اور سامنے آگ کی انگیٹھی رکھی تھی۔ انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اُٹھ کر ملے اور اپنے پاس بٹھالیا، مزاج پرسی کے بعد کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، اس کے بعد کھانا منگوایا انوار احمد مرحوم کھانے کے بہت شوقین تھے۔ پانی پت کی ملائی بہت مشہور ہے، ان کے لیے ملائی منگوائی کھانا کھانے کے بعد کچھ وقت بات چیت میں گزرا۔ پھر ان کے لیے پلنگ بچھوا کر بستر اکرا دیا اور خود آرام کرنے کے لیے اندر چلے گئے۔ یہ بھی تھکے ہوئے تھے پڑ کر سو رہے، مولوی انوار احمد کہتے تھے کہ رات کے بارہ ایک بجے انھیں ایسا محسوس ہوا کہ کوئی شخص ان کی رزائی کو آہستہ آہستہ چھو رہا ہے۔ انھوں نے چونک کر پوچھا کون؟ مولوی صاحب نے کہا میں ہوں۔ آج سوی زیادہ ہے، مجھے خیال ہوا کہ شاید آپ کے پاس اوڑھنے کا سامان کافی نہ ہو تو یہ کمبل لایا تھا اور آپ کو اوڑھا رہا تھا۔ انوار احمد صاحب کہتے تھے کہ مجھ پر ان کی شفقت کا ایسا اثر ہوا کہ عمر بھر نہیں بھول سکا۔"[۵۳]

۱۹۰۳ء میں حسرت موہانی نے علی گڑھ "اردوئے معلیٰ" نام کا ایک رسالہ جاری کیا تھا۔ اس زمانے میں "اودھ پنچ" میں حالی پر اعتراض کا سلسلہ جاری تھا۔ حسرت موہانی نے بھی حالی کی شاعری کو اپنا ہدف بنایا اور حالی کے کلام پر اعتراضات کی بوچھاڑ کردی۔ اس سلسلے کا ایک دلچسپ واقعہ سن لیجیے۔

"علی گڑھ کالج میں کوئی عظیم الشان تقریب تھی۔ نواب محسن

الملک مرحوم کے اصرار پر مولانا حالؔی نے بھی اس میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے اور حسبِ معمول سید زین العابدین مرحوم کے مکان پر فروکش ہوئے ایک صبح حسرتؔ موہانی دو دوستوں کو ساتھ لیے ہوئے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے چندے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوا کیں۔ اتنے میں سیّد صاحب موصوف نے بھی اپنے کمرے سے حسرتؔ کو دیکھا۔ ان مرحوم میں لڑکپن کی شوخی اب تک باقی تھی۔ اپنے کتب خانے میں گئے اور اردوئے معلّٰی کے دو تین پرچے اٹھا لائے۔

حسرتؔ اور ان کے دوستوں کا ماتھا ٹھنکا کہ اب خیر نہیں اور اٹھ کر جانے پر آمادہ ہوئے مگر زین العابدین کب جانے دیتے تھے۔ خود پاس بیٹھ گئے ایک پرچے کے ورق الٹنا شروع کیے اور مولانا حالؔی کو مخاطب کر کے حسرت اور اردوے معلّٰی کی تعریفوں کے پُل باندھ دیے۔ کسی کسی مضمون کی دو چار سطریں پڑھتے اور واہ خوب لکھا۔ کہہ کر داد دیتے تھے۔ حالؔی بھی ہوں ہاں سے تائید کرتے جاتے تھے۔ مگر حسرت کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

اتنے میں سیّد صاحب مصنوعی حیرت بلکہ وحشت کا اظہار کر کے بولے اے مولانا! یہ دیکھیے! آپ کی نسبت کیا لکھا ہے؟ اور کچھ اس قسم کے الفاظ شروع کیے۔ سچ تو یہ ہے کہ حالؔی سے بڑھ کر مخربِ زبان کوئی ہو نہیں سکتا، اور وہ جتنی جلدی اپنے قلم کو اردو کی خدمت سے روکیں اتنا ہی اچھا ہے"۔

فرشتہ نشیں حالی ذرا مکدر نہیں ہوئے اور مسکرا کر کہا تو یہ کہا کہ نکتہ چینی اصلاحِ زبان کا ایک بہترین ذریعہ ہے اور یہ عیب میں داخل نہیں۔ کئی روز بعد ایک دوست نے حسرت سے پوچھا کہ حالی کے خلاف اب بھی کچھ لکھو گے؟ جواب دیا کہ جو کچھ لکھ چکا ہوں اسی کا ملال اب تک دل پر ہے۔"[۵۴]

حالی کی جدید شاعری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہت سنجیدہ قسم کے بزرگ تھے۔ عام خیال ہے کہ "مسدس حالی اور "مناجاتِ بیوہ" کے شاعر کے ہونٹ کبھی مسکراہٹ سے آشنا بھی نہ ہوتے ہوں گے۔ بقول مولوی عبدالحق

"جن لوگوں نے صرف ان کا کلام پڑھا ہے، شاید وہ سمجھتے ہوں کہ مولانا ہر وقت روتے اور بسورتے رہتے ہوں گے اس میں شک نہیں کہ ان کا دل درد سے لبریز تھا اور ذرا سی ٹھیس سے چھلک اٹھتا تھا مگر وہ خوش مزاج اور خوش طبع تھے خصوصاً اپنے ہم صحبت یاروں میں بڑی ظرافت اور شوخی سے باتیں کرتے تھے۔ اُن کے کلام میں بھی کہیں کہیں ظرافت اور زیادہ تر طنز کی جھلک نظر آتی ہے۔"[۵۵]

حالی زاہد تو تھے، مگر بقول کسے زاہد خشک نہیں تھے۔ ان کے مزاج میں لطیف ظرافت تھی۔ حالی کے قطعات میں جو طنز و مزاح ہے اس سے اردو شاعری پہلے آشنا نہیں تھی۔ ان قطعات میں گہرا طنز اور اعلا درجے کا مزاح ہے۔ یہاں ان قطعات پر گفتگو کا موقع نہیں ہے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اگر حالی دوسروں پر طنز کرتے ہیں اور دوسروں کے ساتھ مزاح سے کام لیتے ہیں تو جب کوئی انھیں مزاح کا شکار بناتا ہے لیکن تہذیب کے دائرے میں رہتا ہے تو حالی اس مزاح کی کھلے دل سے درد دیتے ہیں۔
مولانا ابوالکلام آزاد نے حالی کے بارے میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہوئے

لکھا ہے۔

"خواجہ صاحب مرحوم کی ایک غزل ہے

اُن کے جاتے ہی یہ کیا ہوگئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے، نہ در کی صورت

مطلع ہے

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں!
دیکھنا آپ کی، اور آپ کے گھر کی صورت

علی گڑھ کالج کا ایک طالب علم داؤد نامی تھا۔ شاعری سے اسے طبعی مناسبت تھی۔ اس نے اس غزل کی تضمین کی اور مقطع کی تضمین کچھ ایسی چسپاں واقع ہوئی، گویا مقطع حالی کا نہیں رہا، داؤد کا ہوگیا

جب کسی کام کا کرتا ہے ارادہ انساں — دیکھ لیتا ہے کہ اس کام کے ہے بھی شایاں
سُن کے لوگوں سے کہ کل آئے تھے داؤد کے یاں — اُن کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

چند دنوں کے بعد خواجہ صاحب علی گڑھ آئے۔ چوں کہ مقطع کی تضمین میں شوخیِ طبع سے کام لیا تھا اور ایک طرح کا گستاخانہ پہلو تھا، اس لیے داؤد نے اپنے دوستوں کو تاکید کر دی تھی کہ اس تضمین کا ذکر خواجہ صاحب سے نہ کریں، لیکن کسی شخص نے کر دیا۔ خواجہ صاحب کو جونہی یہ بات معلوم ہوئی، نہایت درجہ خوش ہوئے۔ اصرار کر کے داؤد کو بلوایا اور مجبور کیا کہ پوری تضمین سنائے۔ پھر تعریف کر کے اس کا دل بڑھایا، اور "دیوانِ حالی

"درجہ اوّل کا چھپا ہوا بطور صلے کے عطا فرمایا اور کہا یہی ایک نسخہ ہے جو میں نے اپنے لیے رکھا تھا لیکن اب میں اس کا مستحق اپنے سے زیادہ تمھیں سمجھتا ہوں۔

"افسوس ہے، اس طالب علم کا جوانی میں انتقال ہو گیا" [56]

اگر چہ حالی کو شاعر کی حیثیت سے غیر معمولی اہمیت حاصل تھی، بلکہ اُن کا شمار اپنے عہد کے ممتاز ترین شاعروں میں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود حالی اپنی شاعری کے بارے میں بہت ہی انکساری سے کام لیتے تھے۔ اگر کوئی ان کی شاعری کی تعریف کرتا تو وہ بات کاٹ دیتے اکثر اردو کے بڑے بڑے شاعر کسی نہ کسی بہانے اپنی شاعری کی تعریف کا پہلو نکال لیتے ہیں، لیکن حالی ایسا نہیں کرتے تھے۔ یہ تو بیشتر شاعروں میں عیب ہوتا ہے کہ وہ اپنا کلام سنانے کے لیے موقع نکال لیتے ہیں۔ حالی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُن سے فرمائش کی جاتی تھی تب بھی وہ شعر سنانے سے گریز کرتے تھے۔

مولوی عبدالحق نے حیدر آباد کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے

"جن دنوں مولانا حالی کا قیام حیدر آباد میں تھا ایک دن گرامی مرحوم نے چائے کی دعوت کی۔ چند اور احباب کو بھی بلایا۔ چائے وغیرہ کے بعد جیسا کہ معمول ہے فرمائش ہوئی کہ کچھ اپنا کلام سنایئے مولانا نے وہی حافظے کا عذر کیا ہر چند لوگوں نے کہا کہ جو کچھ بھی یاد ہو فرمایئے، مگر مولانا عذر ہی کرتے رہے۔ اتنے میں ایک صاحب کو خوب سوجھی وہ چپکے سے اٹھے اور کہیں سے دیوان حالی لے آئے اور لا کے سامنے رکھ دیا۔ اب مجبور ہوئے، کوئی عذر نہیں چل سکتا تھا آخر انھوں نے یہ غزل سنائی جس کا مطلع تھا۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں" ۵۷

حالؔی اپنے عہد کی ممتاز ترین شخصیتوں میں ہونے کے باوجود خاکساری اور عاجزی کا مجسمہ تھے۔ بہت منکسر المزاج، وضع دار، پاک سیرت، شگفتہ مزاج اور خوش گفتار تھے۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ حالؔی اگرچہ باغیانہ دماغ رکھتے تھے اور انھوں نے مشرقی شاعری کی ساری روایتوں پر زبردست حملہ کیا تھا۔ لیکن جہاں تک ہماری تہذیب کا تعلق ہے، حالؔی اُس کی روایتوں کے مدّاح اور پاسدار تھے۔ وضع داری جاگیرداری نظام کی اہم خصوصیت ہے۔ حالی جاگیردارانہ نظام کی ادبی روایتوں کی سخت مخالفت کرتے ہیں مگر اس کی تہذیبی روایتوں کو سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔ اُن کی وضع داری کے کئی واقعات مشہور ہیں۔

مولوی محمد اسماعیل پانی پتی نے حالؔی کی وضع داری کا ایک بہت دل چسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

> "مرحوم پانی پت میں حضرت مخدوم کبیر الاولیا کا عُرس بڑی دھوم دھام کے ساتھ ہر سال ہوا کرتا تھا۔ عُرس کی دیگر رسوم کے ساتھ ایک ڈولا بھی نکلا کرتا تھا، جس میں سجادہ نشین صاحب سوار ہوتے تھے اور مزدور اسے اُٹھا کر چلتے تھے۔ معتقدین اور حاضرین ان مزدوروں کو حسبِ توفیق کچھ پیسے دے دیا کرتے تھے۔ چونکہ عُرس مولانا کے مکان کے قریب ہی ہوتا تھا، لہٰذا ایک مرتبہ عُرس کی سیر دیکھنے آپ بھی چلے گئے اور حکیم امین اللہ مرحوم کی بیٹھک میں جو لبِ سڑک (سڑک کے کنارے) تھی، جا کر بیٹھ گئے۔ جب ڈولا نکلا اور لوگوں نے ڈولا اُٹھانے والوں کو پیسے

دینے شروع کیے تو مولانا (حالیؔ) نے بھی جیب میں ہاتھ
ڈالا۔ مگر اتفاق سے اس وقت جیب میں کچھ نہ تھا۔ مولانا نے
حکیم امین سے کہا کہ حکیم صاحب ایک چوّنی بطور قرض مرحمت
ہو۔ گھر پہنچ کر بھجوا دوں گا۔ حکیم صاحب نے فوراً ایک چوّنی
نکال کر پیش کر دی جو انھوں نے ڈولے والوں کو دے دی اور گھر
واپس جا کر ملازم کے ہاتھ بھجوا دی۔ اُس روز سے مولانا کا دستور
ہو گیا۔ جب عُرس کے موقع پر پانی پت میں ہوتے تو ضرور عُرس
دیکھنے جاتے اور حکیم امین اللہ ہی کی بیٹھک میں ٹھیک اسی جگہ
مونڈھا بچھا کر بیٹھتے، جہاں پہلی مرتبہ آ کر بیٹھے تھے اور جب ڈولا
نکلتا تو حکیم صاحب سے فرماتے کہ ایک چوّنی مرحمت ہو، گھر
جا کر بھجوا دوں گا۔ چوّنی لیتے، ڈولے والے کو دیتے اور گھر جا کر
نانو خاں کے ہاتھ چوّنی بھجواتے۔

ان کے اس معمول میں آخر وقت تک کبھی فرق نہیں آیا۔ حکیم
صاحب بھی اس بات کی بڑی احتیاط رکھتے تھے کہ اس موقع پر
چوّنی ضرور اپنے پاس رکھتے اور مولانا کے طلب کرنے پر فوراً
پیش کر دیتے۔ ایک مرتبہ عُرس میں جاتے ہوئے مولانا اپنے
چھوٹے لڑکے خواجہ سجاد حسین صاحب بی، اے انسپکٹر تعلیمات
پنجاب کو بھی اپنے ہمراہ لے گئے جو رخصت پر وطن آئے ہوئے
تھے۔ ان بے چاروں کو اس عجیب قصے کا پتہ نہ تھا۔ جب مولانا
نے حکیم صاحب سے حسب معمول کہا کہ ایک چوّنی مرحمت
ہو، گھر جا کر بھجوا دوں گا تو خواجہ سجاد حسین صاحب نے فوراً ایک
چوّنی جیب سے نکالی اور عرض کیا کہ حکیم صاحب سے لینے کی

ضرورت نہیں، یہ حاضر ہے اور یہ کہہ کر بڑے ادب سے چونّی والدِ محترم کے حضور میں پیش کردی۔ اس پر مولانا فرمانے لگے کہ بھئی تم سے میرا لین دین نہیں۔ یہ چونّی تو میں حکیم صاحب ہی سے لوں گا'' ۵۸

اس طرح کا ایک اور واقعہ مشہور ہے، جسے ڈاکٹر وحید قریشی نے نقل کیا ہے

''مولانا کی عادت تھی کہ فصل آنے پر سال تمام کا (سال بھر کا) غلّہ اپنے ہاں جمع کرلیا کرتے تھے تاکہ سال کے دوران میں ضرورت نہ پڑے۔ ایک سال اتفاقاً مہمان زیادہ آتے رہے اور غلّہ کافی خرچ ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فصل آنے سے پہلے ہی غلّہ کا ذخیرہ ختم ہوگیا۔ مولانا نے حکیم امین اللہ صاحب سے کہلا بھیجا کہ ہمارے ہاں اس سال غلّہ تھڑ گیا ہے۔ آپ مہربانی فرما کر یہ کام کریں کہ دو من گیہوں بھیج دیں۔ جب فصل آئے گی اور کھیتوں پر سے غلّہ وصول ہوگا، تو اس میں سے آپ دو من گندم رکھ لیں۔ حکیم صاحب نے فوراً دو من گیہوں مولانا کے ہاں بھجوا دیے۔ بس اس کے بعد سے مولانا کا مستقل قاعدہ ہوگیا کہ فصل آنے سے پہلے ضرور دو من غلّہ حکیم صاحب کے ہاں سے منگوا لیتے اور فصل آنے پر ادا کردیتے۔ آخر عمر تک اس عادت میں فرق نہ آیا'' ۵۹

حالی کے ایک ملازم تھے عطااللہ۔ کون سا جسمانی عیب تھا جو موصوف میں نہیں تھا۔ بہرے تھے، لولے تھے، لنگڑے تھے اور اس سب کے باوجود بہت لڑے تھے۔ بقول مولانا وحیدالدین سلیم۔ حالی کے نقطۂ نظر سے اگر وہ اندھے بھی ہوتے تو ایک اور خوبی کا اضافہ ہوجاتا۔ عطااللہ سخت جاہل آدمی تھے۔ بہت تیز غصّے کے تھے۔ اگر اُن کے خلافِ مزاج کوئی بات ہوجاتی تو لڑنے مرنے کو تیار ہوجاتے۔ ذرا ذرا سی بات پر چیخ چیخ کر سارے گھر کو سر پر اُٹھا لیتے۔ وحید قریشی نے اپنے مقالے''

حالی کی شخصیت" میں اُن کا ایک ایسا واقعہ نقل کیا ہے، جس سے حآلی کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وحید قریشی لکھتے ہیں

> "عطاء اللہ بڑا اکھڑ آدمی تھا۔ وہ اکثر مولانا پر ناراض ہونے لگتا۔ مگر مولانا کبھی جواب نہ دیتے اور خاموش ہو جاتے میں نے خواجہ غلام الحسنین صاحب مرحوم سے پوچھا کہ آپ کو یاد ہے مولانا کبھی اپنے ملازم پر ناراض بھی ہوئے یا نہیں؟ فرمانے لگے ہاں ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ مولانا نے عطاء اللہ سے کسی چیز کے متعلق دریافت کیا اُس پر جھلا کر جواب دیا کہ یہ کیا رکھی ہے؟ مولانا میری طرف مخاطب ہوئے اور فرمانے لگے۔ میاں غلام الحسنین دیکھا تم نے، عطاء اللہ مجھے اندھا بنا رہا ہے کہ چیز سامنے رکھی ہے اور نہیں دکھائی دیتی۔ یہ حال ہے ہمارے نوکروں کا۔ مگر عطاء اللہ کو کوئی جواب نہ دیا اور چپکے ہو گئے" [11]

وحید قریشی نے حآلی کی خاکساری اور عاجزی اور انسان دوستی کے بارے میں ایک اور واقعہ نقل کیا ہے۔ بقول وحید قریشی منشی محمد الدین ایک کاتب تھے۔ انھوں نے حآلی کے دیوان کی کتابت کی تھی۔ منشی صاحب کا بیان تھا

> "جس زمانے میں، میں دہلی میں مولانا کا مقدمۂ شعر و شاعری لکھ رہا تھا، مولانا کے مسودہ میں ایک جگہ منبر کو ممبر لکھا تھا، جو ظاہر ہے کہ سہو سے لکھا گیا تھا۔ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ آپ نے یہ غلط لکھا ہے کہ کیا میں اسے صحیح لکھ دوں؟ مولانا نے دیکھ کر فوراً اپنی غلطی تسلیم کر لی اور اس کے بعد مولانا کا معمول ہو گیا

کہ جب بھی مولانا کے پاس کسی کام سے جاتا اوران کے پاس
آدمی بیٹھے ہوتے تو وہ ضرور لوگوں کو مخاطب کر کے یہ کہا کرتے
تھے کہ بھائی ان کا مجھ پر بڑا احسان ہے۔ انھوں نے میری ایک
غلطی مجھے بتائی تھی۔ اگر وہ غلطی رہ جاتی تو بڑی ندامت اُٹھانی
پڑتی۔ مجھے اُن کی اس بات سے بڑی شرمندگی ہوتی مگر مولانا
نے اپنی یہ عادت نہ چھوڑی‘‘[۱۲۰]

حالی کے زمانے میں ہندی اردو کا جھگڑا شروع ہو چکا تھا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ
اس زمانے کے علمائے کرام اور اردو ادیبوں اور شاعروں کے رویّے زبان کے سلسلے
میں بہت سیکولر تھے۔ وحید الدین سلیم نے اپنے بعض مضامین میں ہندی اردو کے
اختلافات سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے

’’اگر ہندی کے وہ الفاظ خاص کر اردو میں شامل کیے جائیں، جو
بلا تغیر یا کسی تغیر کے ساتھ ہندوستان کی جدید زبانوں میں شامل
ہیں تو اس سے نہ صرف ہماری زبان کا دائرہ وسیع ہوگا بلکہ
ہندوستان کے ہر صوبہ کے باشندوں کے لیے عام فہم ہو جائے
گی۔ جو حضرات بنگالی، گجراتی، مرہٹی، پنجابی وغیرہ جدید
زبانوں کا علم رکھتے ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ ایسے الفاظ کی
فہرستیں تیار کریں اور ہماری زبان کے شاعروں اور انشا پردازوں
کے سامنے رکھ دیں تاکہ حسب ضرورت وہ ان الفاظ سے کام
لیں اور ہندی زبان کے اس اہم حصّہ کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں جو
ہندوستان کی جدید زبانوں کا علم رکھتے ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ
وہ ایسے الفاظ کی فہرستیں تیار کریں اور ہماری زبان کے شاعروں
اور انشا پردازوں کے سامنے رکھ دیں تاکہ حسب ضرورت وہ ان

الفاظ سے کام لیں اور ہندی زبان کے اس اہم حصّے کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں جو ہندوستان کی جدید زبانوں میں مشترک ہے۔ اسپرنٹو جو یورپ کی ایک مصنوعی مشترک زبان ہے اور جس کا رواج یورپ کے تاجروں کے درمیان بڑھتا جاتا ہے، اس کے تیار کرنے میں اسی اصول سے کام لیا گیا ہے۔ ہندوستان کی اسپرنٹو ہماری زبان ہوسکتی ہے۔ اگر اس میں اس ملک کی جدید آریائی زبان کے مشترک الفاظ بڑھا دیے جائیں'' [۶۳]

حالؔی نے اگرچہ عمر بھر اردو کی خدمت کی اور اپنی نظم و نثر سے اردو کا مرتبہ بہت بلند کیا لیکن وہ انصاف کی بات کرنے سے کبھی نہیں چوکے۔ انھوں نے لالہ سری رام کے ''خمخانۂ جاوید'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے

''آج کل اہلِ ملک کی بدقسمتی سے جو اختلاف ہندو مسلمانوں میں اردو زبان کی مخالفت یا اس کی حمایت کی وجہ سے برپا ہے اس کی رفعداد ہوسکتی ہے تو اس طریقے سے ہوسکتی ہے کہ ہندو تعلیم یافتہ اصحاب کشادہ دلی اور فیاضی کے ساتھ اردو زبان میں جو درحقیقت برج بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت اور اس کی ایک پروان چڑھی ہوئی اولاد ہے اسی طرح تصنیف و تالیف کریں جس طرح ہمارے ہردل عزیز ہیرو (لالہ سری رام) نے اس طوفانی تذکرے کو ختم کرنے کا ارادہ کیا ہے اور مسلمان مصنفین بے ضرورت اردو میں عربی فارسی کے غیر مانوس الفاظ استعمال کرنے سے جہاں تک ہوسکے پرہیز کریں اور ان کی جگہ برج بھاشا کے مانوس اور عام فہم الفاظ سے اردو کو مالا مال کرنے کی کوشش کریں اور اس طرح دونوں قوموں میں آشتی اور صلح کی

بنیاد ڈالیں اور ایک متنازع فیہ زبان کو مقبولۂ فریقین بنائیں جیسی
کہ لکھنؤ جانے سے پہلے تقریباً اہلِ دہلی کی زبان تھی۔ مذکورہ
بالا اختلاف کے متعلق جو تعصب اور ناگواری کا الزام ہندوؤں
پر لگایا جاتا ہے اس قسم کا بلکہ اس سے زیادہ سخت الزام مسلمانوں
پر لگایا جاسکتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ مسلمان باوجودیکہ تقریباً
ایک ہزار برس سے ہندوستان میں آباد ہیں مگر اس طویل مدت
میں انھوں نے چند مستثنیات کو چھوڑ کر کبھی سنسکرت کو یا برج بھاشا
کی طرف باوجود سخت ضرورت کے آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ جس
سنسکرت کو یورپ کے محقق لاطینی و یونانی سے زیادہ فصیح، زیادہ
وسیع اور زیادہ باقاعدہ بتاتے ہیں اور جس کی تحقیقات میں عمریں
بسر کر دیتے ہیں۔ مسلمانوں نے عام طور پر کبھی اس کو قابلِ
التفات نہیں سمجھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ سنسکرت کا سیکھنا کوئی آسان
کام نہیں ہے تو برج بھاشا شاید مقابلہ سنسکرت کے نہایت سہل
الوصول ہے اور جس کی شاعری نہایت لطیف، شگفتہ اور فصاحت
بلاغت سے لبریز ہے اس کو بھی عموماً بے گانہ وار نظروں سے
دیکھتے رہے۔ حالاں کہ جو اُردو دان کو اس قدر عزیز ہے اس کی
گریمر کا دارومدار بالکل برج بھاشا یا سنسکرت کی گریمر ہے عربی
فارسی سے اس کو صرف اس قدر تعلق کہ دونوں زبانوں کے
اسما اس میں کثرت کے ساتھ شامل ہو گئے باقی تمام اجزاے
کلام جن کے بغیر کسی زبان کی نظم و نثر مفید معنی نہیں ہو سکتی۔ برج
بھاشا یا سنسکرت کی گریمر سے ماخوذ ہیں۔ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں
کا ہندوستان میں رہنا اور سنسکرت یا کم سے کم برج بھاشا سے

بے پروا یا متنفر ہونا بالکل اپنے تئیں اس مثل کا مصداق بنانا ہے
کہ ''دریا میں رہنا اور مگرمچھ سے بیر''۔[۶۴]

حالی کا یہ تبصرہ چھپا تو بعض لوگوں کو بہت ناگوار ہوا اور بعض اخباروں نے اس کی تردید بھی چھاپی۔ لیکن چوں کہ یہ حالی کا عقیدہ تھا، اس لیے وہ اپنی بات پر جمے رہے۔

یہی نہیں بلکہ حالی نے زبان کے بارے میں ''مقدمۂ شعر و شاعری'' میں ایک بڑی سچی اور کھری بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں

''اردو پر قدرت حاصل کرنے کے لیے صرف دلی یا لکھنؤ کی زبان کا متبع ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ عربی فارسی میں کم سے کم متوسط درجے کی لیاقت اور نیز ہندی بھاشا میں فی الجملہ دست گاہ بہم پہنچائی جائے۔ اردو زبان کی بنیاد جیسا کہ معلوم ہے، ہندی بھاشا پر رکھی گئی ہے، اس کے تمام افعال اور تمام حروف اور غالب حصہ اسما کا ہندی سے ماخوذ ہے اور اردو شاعری کی بنا فارسی شاعری پر جو عربی شاعری سے مستفاد ہے قائم ہوئی ہے۔ نیز اردو زبان میں بڑا حصہ اسما کے عربی اور فارسی سے ماخوذ ہے۔ بعض اردو زبان کے شاعر جو ہندی بھاشا مطلق نہیں جانتے اور محض عربی اور فارسی کی گاڑی تان چلاتے ہیں۔ وہ گویا اپنی گاڑی بغیر پہیوں کے منزلِ مقصود تک پہنچانا چاہتے ہیں اور جو عربی فارسی سے نابلد ہیں اور صرف ہندی بھاشا یا محض مادری زبان کے بھروسے پر اس بوجھ کے متحمل ہوتے ہیں، وہ ایسی گاڑی ٹھیلنا ہے، جس میں بیل نہ جوتے گئے''۔[۶۵]

مولانا حالی کا اردو لغت کے سلسلے میں بہت سائنٹفک نقطۂ نظر تھا۔ بقول مولوی عبدالحق

”ایک بار جب اردو لغت کی ترتیب کا ذکر اُن سے آیا تو فرمانے لگے کہ اردو لغات میں ہندی کے وہ الفاظ جو عام بول چال میں آتے ہیں یا جو ہماری زبان میں کھپ سکتے ہیں بلا تکلف کثرت سے داخل کرنے چاہئیں۔ خود اپنی نظم و نثر میں وہ ہندی الفاظ ایسی خوب صورتی سے لکھ جاتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ اسی موقع کے لیے وضع ہوئے تھے۔ انھوں نے بہت سے ایسے ہندی الفاظ اردو ادب میں داخل کیے جو ہماری نظروں سے اوجھل تھے اور جن کا آج تک کبھی کسی ادیب یا شاعر نے تو کیا ہندی ادیبوں اور شاعروں نے بھی استعمال نہیں کیا تھا، لفظ کا صحیح اور برمحل استعمال جس سے کلام میں جان پڑ جائے اور لفظ خود بول اُٹھے کہ لکھنے والے کے دل میں کیا چیز کھٹک رہی ہے، ادیب کا بڑا کمال ہے اور یہ کوئی حالی سے سیکھے۔ دلوں میں گھر کر لینے کے جو گُر ادب میں ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے“[۲۹]

حالؔی کو افیون، پان اور حقّے کی عادت

حالؔی گوڑ گاؤں میں تھے۔ انھوں نے وہاں سے ۲ر اکتوبر ۱۹۱۲ء کو اپنے نواسے عبدالولی کے نام جو خط لکھا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالؔی کو افیون کھانے کی عادت تھی۔ حالی نے خط میں اپنے نواسے خواجہ عبدالولی کو ہدایت دی ہے کہ وہ اپنی والدہ یعنی حالی کی صاحبزادی سے کہہ دیں کہ

”میرے واسطے افیون کی گولیاں بہت سی، جیسی کہ تم ہمیشہ میرے واسطے بنایا کرتی ہو، بنا کر رکھ لو۔ جب بھائی یہاں آنے لگیں تو اُن کے ہاتھ بھیج دینا   میں نے دانتوں کے سبب سے پان کھانا بہت کم کر دیا ہے۔ تھوڑا سا بنا ہوا پان تمبا کو مع چھالیا

کے، تیار کر کے وہ بھی بھیج دینا"۔ [۶۷]

صالحہ عابد حسین نے "یادگارِ حالی" میں پانی پت میں حالی کے نئے مکان کی اوپر کی اس منزل کا ذکر کرتے ہوئے، جس میں حالی رہتے تھے، لکھا ہے کہ

"وہیں ان کا حقہ بھرنے اور چائے بنانے کا انتظام تھا"۔ [۶۸]

ان تمام اقتباسات سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ حالی کو افیون، پان، تمباکو اور حقے کی عادت تھی۔ وہ چائے بھی پیتے تھے۔

حالی کی بیماریاں اور وفات

حالی ابتدائے جوانی ہی سے مختلف قسم کی بیماریوں کا شکار رہے۔ جون ۱۸۹۱ء میں انھیں کو ایک خاص بیماری کا سامنا کرنا پڑا۔ ہوا یہ کہ اُن کے بازو میں خلش شروع ہوگئی جو کچھ دن بعد ناقابلِ برداشت ہوگئی۔

حالی نے اس بیماری کے بارے میں اپنے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین کو ۷ر جون ۱۸۹۱ء کے ایک خط میں لکھا ہے۔

> "بازو میں وہ خلش چلی جاتی ہے۔ کل رات کو ڈاکٹر نے پلستر لگایا تھا۔ اس سے آبلہ پڑا۔ زخمِ آبلہ خشک ہونے کے بعد معلوم ہوگا کہ کچھ فائدہ ہوا یا نہیں"۔ [۶۹]

خواجہ سجاد حسین نے حالی کو اپنی بیماری کا حال لکھا تھا۔ حالی اُن کے خط کا جواب دیتے ہوئے ۷ر جنوری ۱۸۹۴ء لکھتے ہیں

> "تمھارا کارڈ جو اسی وقت پہنچا ہے، اس کو پڑھ کر نہایت تردّد ہوا۔ مجھے اس قسم کی شکایتیں چالیس برس کی عمر میں پیدا ہوئی تھیں۔ تم کو دور از حال ابھی سے زکام، کھانسی اور خدانخواستہ

دردِ سینہ کی شکایت ہونے لگی۔ میں نے اپنی غفلت اور بے پروائی سے، ان امراض کو بڑھالیا، کبھی باقاعدہ علاج نہیں کیا۔ فصدیں متواتر کھلوا کر خون کی مقدار بہت کم کرلی۔ غذا وغیرہ کا کبھی اہتمام نہیں کیا۔ مگر تم کو مجھ سے عبرت اور نصیحت لینی چاہیے''۔[۷۰]

حالی ۴ر نومبر ۱۸۹۴ء کے ایک خط میں خواجہ سجاد حسین کو لکھتے ہیں

''میں بھی بہت دن سے تندرست نہیں ہوں، نیند بہت کم آتی ہے۔ دماغ کچھ کام نہیں دیتا۔ دماغ میں نہایت خشکی اور ضعف پیدا ہوگیا ہے''۔[۷۱]

حالی طرح طرح کی بیماریوں کے شکار رہنے لگے۔ اُن کے دانتوں میں درد شروع ہوگیا اور ڈاڑھیں ہلنے لگیں۔ ۲۱ر اکتوبر ۱۸۹۵ء کے خط میں خواجہ سجاد حسین کو لکھتے ہیں

''میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ اوپر کی ڈاڑھ جو ہلتی تھی، آج چار روز ہوئے اُکھڑوا ڈالی۔ مگر اس کے اکھڑوانے سے کچھ آرام نہیں ہوا۔ اب اور ڈاڑھوں میں درد معلوم ہوتا ہے۔ اور چوں کہ ڈاڑھ کے اکھڑوانے میں خون بہت نکل گیا اس لیے ضعف اور خاص کر ضعفِ دماغ بہت ہوگیا ہے''۔[۷۲]

۱۴ر دسمبر ۱۸۹۵ء کے خط میں خواجہ سجاد حسن کو حالی لکھتے ہیں

''ڈاڑھ میں پھر درد کی شکایت ہوگئی ہے اور اس کے ساتھ سر میں بھی بہت درد ہے تمام جبڑا پھوڑے کی طرح دُکھتا ہے''۔[۷۳]

حالی کو اکثر نزلے اور کھانسی کی شکایت رہتی تھی اور بلغم بہت نکلتا تھا۔ ۲۰ر فروری

۱۸۹۶ء کے خط بنام خواجہ سجاد حسین میں حالی لکھتے ہیں

"میں اچھا ہوں مگر جب سے کہ ناک اور حلق سے رطوبت اور بلغم بکثرت نکلنے لگا ہے، ضعف روز بروز زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ کچھ طاقت بخار نے سلب کی تھی۔ کچھ رہی سہی زکام کی نذر ہوئی۔ دماغ بالکل کھوکھلا ہو گیا ہے"[۴۲]

ایک دفعہ حالی کو سانس کی تکلیف ہوگئی۔ معمولی سے جسمانی مشقت سے اُن کا سانس پھول جاتا۔ انھوں نے اپنی اس بیماری کی اطلاع خواجہ سجاد حسین کو ان الفاظ میں دی تھی

"بعد دعا کہ مدعا یہ ہے کہ تمھارا خط عرصہ ہوا پہنچا تھا۔ مجھے زکام اور کھانسی کی معمولی شکایت کے سوا جو ہمیشہ جاڑوں میں ہوا کرتی ہے اب کی دفعہ تقریباً ڈیڑھ مہینے سے ایک نئی شکایت پیدا ہوگئی ہے یعنی ذرا سی حرکت یا مشقت سے فوراً سانس چڑھ جاتا ہے اور اِس کے ساتھ سینے میں ایک سوزش پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات کھانا کھانے کے بعد یا اجابت کے بعد یہ سوزش ایسی سخت ہوتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ سینہ پھٹ جائے گا۔ بعض کا خیال تھا کہ چائے کے پینے سے یہ مرض پیدا ہوا ہے۔ اگرچہ مجھے اس کا یقین نہیں ہے مگر میں نے احتیاطاً چار روز سے چائے پینا چھوڑ دیا ہے۔ اور صبح کو غازی کے باغ میں جا کر، قریب ایک گھنٹے کے، آہستہ آہستہ ہوں۔ پھر گھر چلا آتا ہوں۔ اس سے قدرے فائدہ معلوم ہوتا ہے"۔ (۸ر نومبر ۱۹۰۲ء)

حالی کو سردیوں میں کھانسی اور نزلے کی شکایت اکثر رہتی تھی۔ تصدق حسین کے نام ایک خط مورخہ ۲۱ر جنوری ۱۸۹۴ء میں لکھتے ہیں

"میں اچھا ہوں مگر کھانسی کم و بیش چلی جاتی ہے۔انشاء اللہ یہ بھی
سردی کم ہونے کے بعد جاتی رہے گی"۔

۸/اپریل ۱۸۹۹ء کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ حالی کو انفلوئنزا کی سخت شکایت ہوگئی تھی۔انھوں نے خواجہ سجاد حسین کو لکھا ہے۔

"مجھے بخار کی تکلیف کس قدر زیادہ رہی۔ پانچ روز تک پلنگ
سے نہیں اُٹھ سکا"۔[۵]

۲۶/دسمبر ۱۹۰۸ء کے خط بنام خواجہ سجاد حسین سے معلوم ہوتا ہے کہ حالی کو سخت دردِ سر کی شکایت ہوگئی تھی۔جس کے بارے میں انھوں نے سجاد حسین کو لکھا ہے۔

"مجھے دورانِ سر کی شکایت زیادہ ہوگئی ہے۔اسی واسطے علاج
کے لیے یہاں آیا تھا اس شکایت کے سبب لکھنؤ بھی
نہیں جا سکا"۔[۶]

حالی کی یہ بیماریاں تو چلتی رہیں۔ان کے ساتھ ایک اور بیماری نے گھیر لیا۔وہ بیماری تھی داہنی آنکھ میں موتیا بند کا اترنا۔

آنکھوں میں موتیا بند کی شکایت:

آنکھوں کی تکلیف کے بارے میں حالی کی سب سے پہلی جو تحریر میری نظر سے گزری ہے وہ خواجہ سجاد حسین کے نام وہ خط ہے جو حالی نے یکم ستمبر ۱۹۹۸ء کو لکھا تھا۔[۷] اس کا مطلب ہے کہ حالی کی آنکھوں میں تکلیف کا آغاز ستمبر ۱۸۹۸ء سے کچھ دن قبل ہی ہوا ہوگا۔یہ تکلیف زندگی کے آخری دنوں تک رہی۔گویا حالی سولہ سترہ سال تک آنکھوں میں موتیا بند اترنے کی وجہ سے پریشان رہے۔

موتیا بند کی شکایت شروع ہوگئی تھی۔لیکن حالی کو اس کا اندازہ اس وقت ہوا۔جب وہ حیدرآباد میں تھے۔انھوں نے حیدرآباد سے پانی پت کی واپسی پر ۱۶/جون ۱۹۰۶ء کو

خواجہ سجاد حسین کو جو خط لکھا اس میں اطلاع دی تھی۔

"میں حیدر آباد سے تندرست نہیں آیا۔ دائیں آنکھ میں پانی اترتا معلوم ہوتا ہے۔ اس میں برائے نام روشنی باقی رہ گئی ہے اور روز بروز کم ہوتی جارہی ہے"۔ [۸]

خواجہ سجاد کے نام خط مورخہ ۲۲/جولائی ۱۹۰۶ء میں حالی لکھتے ہیں۔

"آخر اکتوبر یا شروع نومبر میں آنکھ بنوانے کا ارادہ ہے" [۹]

آنکھ کے آپریشن کے بارے میں حالی نے خواجہ سجاد حسین کے نام خط مورخہ ۲۷/ فروری ۱۹۰۷ء میں لکھا "(قصور کے) ڈاکٹر سری رام کی نسبت بھی مشہور ہے کہ آنکھ کا قدح کرنے میں نہایت مشاق ہیں۔ میں نے امراؤ راجا لال سے بذریعہ خط کے پوچھا تھا، انھوں نے بہت اطمینان دلایا ہے اور (قصور کے) ڈاکٹر سری رام کی بہت تعریف لکھی ہے اور صلاح دی ہے کہ اُن سے آنکھ بنواؤ۔ مولوی شبلی، مولوی عبدالحلیم اور منشی رحمت اللہ رعد کی یہ رائے ہے کہ لکھنؤ میں ڈاکٹر عبدالرحیم سے آنکھ بنواؤ"۔ [۸]

خواجہ سجاد کے نام کئی خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ حالی کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا ہوگیا تھا کہ وہ کس ڈاکٹر سے آپریشن کروائیں۔

مختلف لوگوں کے مختلف مشورے تھے۔ حالی فیصلہ نہیں کر پارہے تھے کہ لکھنؤ میں آپریشن کرائیں یا قصور میں۔ اس مقصد کے لیے لاہور جائیں یا آگرہ۔

نہ جانے کس کے مشورے پر حالی پٹیالے کے راجندر ہاسپٹل میں داخل ہوگئے۔ ۶/ مئی ۱۹۰۷ء کو ڈاکٹر نے آنکھ کا معائنہ کر کے اطمینان دلایا کہ آنکھ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ جس کی اطلاع حالی نے خواجہ سجاد کو ۷/مئی ۱۹۰۷ء کے خط میں دی۔ ۸/ یا ۹/مئی کو آپریشن ہوا خواجہ سجاد حسین کے نام ۱۰/مئی کے خط میں حالی نے راجندر ہاسپٹل،

پٹیالہ سے خط لکھا۔

"آنکھ کی حالت بدستور ہے۔ غالباً اگر ایک دو روز میں آنکھ کی روشنی ترقی نہ ہوئی تو ڈاکٹر صاحب ایک مختصر آپریشن پھر کریں گے۔ ابھی تک حروف موٹے یا باریک بالکل نظر نہیں آتے۔ جیسا حال تم چھوڑ گئے تھے ویسا ہی اب تک چلا جاتا ہے"۔[۸۱]

خط کے آخری حصے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپریشن کے وقت خواجہ سجاد حسین حالی کے ساتھ قصور میں تھے اور آپریشن کے فوراً بعد وہاں سے چلے آئے۔

خواجہ سجاد حسین کے نام ۲۸؍جولائی ۱۹۰۷ء کے خط سے پتا چلتا ہے کہ آپریشن کے بعد حالی چشمہ حاصل کرنے کی کوشش میں تھے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ

"ڈاکٹر جیمز نے چائل سے آکر آنکھ پر مختلف گلاس لگائے۔ آخر ایک گلاس ٹھیک لگ گیا۔ اسی کے موافق انھوں نے کلکتے سے عینک منگوائی ہے لیکن ہنوز وصول نہیں ہوئی۔ ایک عمدہ عینک انھوں نے پہلے بھی کلکتہ سے خاص میرے لیے منگوائی تھی اور میرے پاس پانی پت ہی میں بھجوادی تھی مگر وہ بنی ہوئی آنکھ پر ٹھیک نہیں لگی تھی۔ دیکھیے جو عینک اب منگوائی گئی ہے وہ بھی ٹھیک لگتی ہے یا نہیں؟ بڑی مشکل یہ ہے کہ جب تک ٹھیک عینک نہ لگے لکھنے پڑھنے سے پرہیز کرنا لازم ہے اور یہ امر ناممکن ہے۔ کم سے کم پانچ چار ضروری خطوں کے جواب ہر روز لکھنے پڑتے ہیں۔ اخبار بھی دیکھے بغیر طبیعت نہیں مانتی"۔[۸۲]

حالی نے ایک ایک کر کے تین عینکیں کلکتے سے منگوائیں، مگر کسی عینک سے بات نہیں بنی اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ حالی کا لکھنا پڑھنا بقول اُن کے تقریباً بند ہو گیا۔ (۱۹؍ستمبر ۱۹۰۷ء)

دراصل یہ آپریشن کامیاب نہیں ہوا تھا۔ اس لیے ۹ یا ۱۰ مئی ۱۹۱۱ء کو حالی کو لکھنؤ کے کنگز ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ ۱۱ مئی کو آپریشن کے بعد دونوں آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی،"[۴۳]

۱۵ مئی ۱۹۱۱ء کو حالی نے خواجہ سجاد حسین کو خط میں لکھا

"آج ۱۵ مئی ۱۹۱۱ء روز دوشنبہ پٹی کھل گئی۔ ابھی تک یہ نہیں معلوم ہوا کہ نگاہ میں کچھ ترقی ہوئی ہے یا نہیں۔ آپریشن سے پہلے جو حال تھا، اب بھی وہی حال ہے۔ لیکن اصل حال تین چار روز میں معلوم ہوگا"[۴۴]

۱۷ مئی ۱۹۱۱ء کو حالی نے حافظ محمد یعقوب کو خط کے ذریعے اطلاع دی۔

"۱۱ مئی کو آنکھ پر عمل جراحی ہوا تھا، پرسوں پانچویں دن پٹی کھل گئی ہے۔ ابھی تک کافی اطمینان نہیں ہوا۔ اس لیے غالباً کم از کم ایک ہفتہ یہاں اور ٹھہرنا پڑے گا"۔

لکھنؤ میں بھی حالی کی آنکھ کا آپریشن اطمینان بخش نہیں ہوا۔ انھوں نے احسان اللہ خاں ثاقب کے نام لکھنؤ سے ۱۹۱۱/۲۶ء کے خط میں لکھا ہے

"میں نے کئی برس ہوئے پٹیالہ میں آنکھ بنوائی تھی۔ اس میں کچھ کسر باقی رہ گئی تھی۔ اس کی درستی کے لیے یہاں آیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالرحیم صاحب نے دوبارہ آپریشن کیا۔ مگر جیسی امید تھی ویسی کامیابی نہیں ہوئی۔ جو حالت پہلے تھی اس کے قریب قریب اب بھی ہے"۔

غرض یہ ہے کہ حالی کی آنکھ کا آپریشن کامیاب تو نہیں ہوا لیکن بس اتنا ہو گیا کہ چشمے کی مدد سے وہ تھوڑا بہت لکھنے پڑھنے کا کام کرنے لگے۔

آخری عمر میں صحت کی خرابی کے باوجود حالؔی کی کوشش تھی کہ اُن کا زیادہ سے زیادہ وقت علمی اور ادبی کاموں میں گزرے۔ مگر پانی پت میں یہ ممکن نہیں تھا کیوں کہ اتنے لوگ ملنے آتے تھے کہ حالؔی کو ان سے ملاقات ہی سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ جو وقت بچتا تھا وہ عبدالولی کی تیمارداری پر صرف ہوجاتا۔ اس لیے حالؔی اپنے ادبی کام مکمل کرنے کے لیے فرید آباد چلے جاتے تھے۔ حالؔی ایک دفعہ دلّی میں مقیم تھے۔ وہاں سے فرید آباد چلے گئے اور ۲۰/ اکتوبر ۱۹۱۲ء سے وسط دسمبر ۱۹۱۲ء تک فرید آباد میں رہے۔ اس شہر میں اپنی مصروفیات کے بارے میں خواجہ سجاد حسین کے نام ایک خط مورخہ ۲۱/ اکتوبر ۱۹۱۲ء میں لکھتے ہیں

> ''میں کل یہاں آگیا ہوں، دلّی میں میری طبیعت زیادہ بگڑنے لگی تھی۔ یہاں تبدیل آب و ہوا کے لیے دو چار دن کو آیا تھا مگر یہاں لوگوں کی محبت کی وجہ سے زیادہ ٹھہرنے کا ارادہ ہوگیا ہے۔ مکان اچھا مل گیا ہے۔ آب و ہوا اچھی ہے۔ مجھے اپنا اردو کلام مرتّب کرنا ہے۔ چوں کہ یہاں تنہائی و تخلیہ ہے۔ اس لیے امید ہے کہ دو ڈھائی مہینے میں مرتّب ہوجائے گا''۔

۲۱/ اکتوبر ۱۹۱۲ء فرید آباد

جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ جوانی ہی میں اُن کی صحت خراب ہوگئی تھی۔ انھیں اکثر نزلہ ہوجاتا تھا۔ دمے کی شکایت برابر رہتی تھی۔ بواسیر کے مریض تھے۔ دانت کمزور ہوگئے تھے اور اکثر دانتوں میں تکلیف کی شکایت رہتی۔ آخری عمر میں آنکھوں میں موتیابند اتر آیا تھا۔

جنوری ۱۹۱۳ء میں حالی پانی پت میں تھے۔ اُن کی صحت بدستور خراب تھی، لیکن وہ اپنے ادبی کاموں میں مصروف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جو کام ادھورے رہ گئے ہیں۔

انھیں پورا کردیں۔ چناں چہ انھوں نے صحت کی خرابی کے باوجود اپنا عربی اور فارسی کلام مرتب کیا اور اس کا مسودہ طباعت کے لیے پریس بھیج دیا۔ مولانا اسماعیل پانی پتی کے قول کے مطابق حالؔی کا عربی فارسی کلام اگست ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا۔ بالکل آخری وقت میں حالؔی کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ اُن کے دماغی اعصاب پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ وہ بات نہیں کر سکتے تھے۔ اگر کوئی اُن سے بات کرتا تو ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آجاتی وہ بولنے کی کوشش کرتے لیکن بول نہیں پاتے تھے۔ بقول صالحہ عابد حسین

> ''کوئی بات کرتا تو سمجھ جاتے، چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں ادراک کی چمک نظر آتی۔ لیکن جب تک جواب دماغ سے زبان تک آئے، اعصاب جواب دے دیتے اور مسکراہٹ بے بسی میں بدل جاتی تھی''۔

حالؔی کو علاج کے لیے دہلی لے جایا گیا۔ ابھی تک ان کی قوتِ گویائی بالکل مفقود نہیں ہوئی تھی۔ دو چار لفظ بول کر اپنا مفہوم ادا کر لیتے تھے۔ دہلی میں ان کی حالت بیان کرتے ہوئے خواجہ عبدالمجید نے لکھا ہے

> ''پہلی مرتبہ جب سول سرجن معائنہ کو آیا۔ میں حاضر تھا وہ کرسی پر بیٹھے تھے اور میز سامنے رکھی تھی۔ میز پر سے قلم اُٹھا کر سول سرجن نے ان کے سامنے کی اور پوچھا یہ کیا ہے؟ یہ امتحان کے طور پر تھا، ۔ حالؔی صاحب کی عادت تھی جب ان سے سوال کیا جاتا تو سلسلہٴ کلام خیر کے لفظ سے شروع کرتے اور یہ ایک خاص لہجہ میں ہوتا تھا۔ پھر ایک تبسم کی کیفیت چہرے پر نمایاں ہوتی جس کا لطف دیکھنے ہی پر منحصر ہے۔ چنانچہ اس وقت بھی خیر کا لفظ عادت کے

موافق آہستہ سے کہا اور مسکرائے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سول سرجن
کے اس سوال پر ہنستے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں ایسا بے ہوش نہیں
ہوں، پھر قلم کا لفظ مُنھ سے نکلا۔ اس کے بعد حالؔی پانی پت چلے
گئے اور میرے ذمّہ یہ خدمت سپرد ہوئی کہ وہاں سے جو کیفیت
مریض کی لکھی ہوئی آئے۔ سول سرجن سے کہہ دیا کروں، جو
جواب ملے لکھ بھیجا کروں، یہ کام چند ماہ تک جاری رہا جس
دن میں اُن کو چُپ دیکھ کر آیا تھا دل ملول اور خاطر متاثر تھی، اس
حالت میں یہ چند شعر موزوں ہوئے

یہ احوال حالؔی کا خواجہ سے کہہ دو
ہے زندہ مگر اس کو چُپ لگ گئی ہے

یہ حالؔی نہیں اس کا بت ہو تو ہو مگر کس بلا کی یہ کاریگری ہے

سکوت مجسم، تعجب کی جا ہے
خموشی تو ضرب المثل موت کی ہے"

ناامید ہو کر حالؔی کو پانی پت واپس لے آیا گیا۔ پوری کوشش کے باوجود دہلی کے ڈاکٹر
حالؔی کا ایسا علاج نہیں کر سکے، جس سے انھیں افاقہ ہوتا۔ ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء اور پہلی
جنوری ۱۹۱۵ء کی درمیانی رات کو دو بجے دنیائے ادب کو روشن کرنے والا یہ خورشید
عالم تاب ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

یکم جنوری کو دن کے دو بجے حالؔی کو پانی پت میں حضرت شاہ شرف الدین بو علی قلندر کی
درگاہ میں مدفون کر دیا گیا۔

حالؔی کی وفات سے کچھ ہی دن پہلے علامہ شبلی خدا کو پیارے ہو گئے تھے۔ ابھی ان کی

جدائی کا غم تازہ تھا کہ حالی بھی ہم سے جدا ہو گئے۔ ان دونوں کی وفات پر علامہ اقبال نے کہا

شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہلِ گلستاں
حالی بھی ہوگیا سوے فردوس رہ نورد

حالی کی طرح مزار پر علامہ اقبال کا فارسی کا ایک مشہور شعر کندہ ہے

طوافِ مرقدِ حالی سزد اربابِ معنی را
نوائے او بجاں ہا افگند شورے کہ من دانم

حامد حسن قادری نے کلامِ پاک سے درج ذیل عیسوی اور ہجری تاریخوں نکالیں۔

حسن العاقبۃ عند ربک للمتقین۔
۱۳۳۳ھ

تاریخ از کلام پاک
۱۳۳۳ھ

فبشرہ بمغرۃ
۱۹۱۴ء

حواشی حالی کے سوانح :

۱۔ مکتوبات حالی، ص ص ۴۱۔۴۲

۲۔ Khawaja Ahmed Abbas, I AM NOT AN ISLAND, DELHI, 1977, PP 11-12

۳۔ مقالات حالی، حصہ اوّل، ص ۲۶۳

۴۔ نذیر احمد خطبۂ استقبالیہ، نئی دہلی، ۲۰۰۱، ص ص ۱۳۔۱۴

۵۔ خطبۂ استقبالیہ، ص ۱۴

۶ خطبۂ استقبالیہ۔ ص ص ۱۳۔۱۴
۷ مقالاتِ حالی حصہ اوّل، ص ۲۲
۸ صالحہ عابد حسین، یادگارِ حالی، دہلی ۔ ۱۹۸۶ ص ۲۴

9 I am not an Island, pp.12

۱۰ تذکرۂ حالی ۔ اسماعیل پانی پتی۔

۱۱ حالی کی کہانی خود ان کی زبانی' مشمولہ ماہنامہ ''فروغ اُردو، لکھنؤ، فروری ۱۹۵۹ء،
ص ۔۴

۱۲ حالی کی کہانی خود اُن کی زبانی، ص ۵
۱۳ حالی کی کہانی خود ان کی زبانی، مشمولہ ماہنامہ فروغ اُردو، لکھنؤ، فروری ۱۹۵۹ء، حالی نمبر۔ ص ۵
۱۴ مولوی نوازش علی ضلع کرنال کے رہنے والے تھے۔ کتب متدرولہ کے فاضل اور علم الفرائض میں بے مثل تھے۔ مولوی محمد اسحق دہلوی کے شاگرد تھے۔ سرسید اور حالی دونوں کا ان کا شاگرد ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔
۱۵ ''یادگارِ حالی''، ص
۱۶ حالی کی کہانی خود اُن کی زبانی، ص ص ۵۔۶

۱۷ حالی کی کہانی خود ان کی زبانی، ۶

۱۸ صالحہ عابد حسین، یادگارِ حالی، دہلی، ۱۹۸۶ء ص ۔۲۹

۱۹ یادگارِ حالی، ص ۔۳۰

۲۰ یادگارِ حالی، ص ص ۴۶۔۴۷

۲۱ حالی، خطوطِ حالی، ص ۔۲۹۶

۲۲ I am not an Island, p 19

۲۳ حالی کی کہانی خود حالی کی زبانی، ص ۔۶۔۷

۲۴ حالیؔ، مقالاتِ حالی، جلد اول، اورنگ آباد، ۱۹۳۶ء، ص ۱۷۴
۲۵ کلیاتِ نثرِ حالی، جلد ۔۲، مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، لاہور، ۱۹۶۸ء

۲۶۔ مقالاتِ حالی، ص ص ۱۷۵۔۱۷۶

۲۷۔ مالک رام، حالی، مترجمہ ایم، حبیب خاں، نئی دہلی ۱۹۹۵ء، ص۔ ۲۰

۲۸۔ صالحہ عابد حسین، یادگارِ حالی، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء، ص۔ ۳۲

۲۹۔ حالی کی کہانی خود اُن کی زبانی، ص ص ۷۔۸

۳۰۔ حالی کی کہانی، خود اُن کی زبانی، مشمولہ نقشِ اول حصہ اوّل، لکھنؤ۔

۳۱۔ حالی پانی پتی، ص ص ۶۔۷

۳۲۔ حالی کی کہانی خود حالی کی زبانی ص ص ۹۔۱۰

۳۳۔ وحید قریشی، مطالعہ حالی، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ص ۳۶

۳۴۔ حالی پانی پتی، ص۔ ۷

۳۵۔ یادگارِ حالی، ص ص ۳۹۔۴۰

۳۶۔ یادگارِ حالی، ص ۴۳

۳۷۔ خطوطِ حالی، ص۔ ۹

۳۸۔ یادگارِ حالی، ص ص ۴۴۔۴۵

۳۹۔ مکتوباتِ حالی، حصہ اوّل، ص۔ ۱۲۳

۴۰۔ مکتوباتِ حالی، ص۔ ۱۱۲

۴۱۔ مکتوباتِ حالی، حصہ اوّل، ص۔ ۲۶

۴۲۔ مکتوباتِ حالی، حصہ اوّل، مورخہ ۷ر اپریل ۱۹۰۸ء

۴۳۔ مکتوباتِ حالی، حصہ اول، ص۔ ۱۹۶

۴۴۔ حالی کے داماد عبدالعلی کا انتقال ۲ر اپریل ۱۹۰۵ء کو ہوا تھا۔

۴۵۔ مکتوباتِ حالی، حصہ اوّل، ص۔ ۱۱۲

۴۶۔ یادگارِ حالی، ص۔ ۸۱

۴۷۔ مکتوباتِ حالی، حصہ اوّل، ص۔ ۱۹۴

۴۸۔ مکتوباتِ حالی، ص۔ ۱۹۴

۴۹۔ مکتوباتِ حالی، حصہ اوّل، ص۔ ۱۱۸

۵۰۔ خطوطِ حالی، ص ص ۳۶۰۔۳۶۱

۵۱ خطوطِ حالی، ص۔۱۷

۵۲ عبدالحق، چند ہم عصر، حیدر آباد، ۱۹۷۲ء ص ص ۱۵۴۔۱۵۵

۵۳ چند ہم عصر، ص۔ ۱۵۵

۵۴ ص ص ۱۵۶۔۱۵۷

۵۵ اسماعیل پانی پتی، تذکرہ حالی، پانی پت، ۱۹۳۵ء ص ص ۱۹۵ تا ۱۹۸ بحوالہ چند ہم عصر

۵۶ چند ہم عصر، ص۔۱۰۳

۵۷ یادگارِ حالی، ص ص ۲۰۔۲۱

۵۸ چندِ ہم عصر، ص۔۱۶۴

۵۹ اسماعیل پانی پتی، تذکرۂ حالی۔ ۱۹۳۵ء بحوالہ، مطالعہ حالی، مرتبہ ساحل احمد، الہ آباد، ۱۹۹۷ء، ص۔۱۵

۶۰ وحید قریشی، حالی کی شخصیت، مشمولہ مطالعہ حالی۔ ص۔۱۶

۶۱ مطالعۂ حالی، مرتبہ ساحل احمد، ص ۱۸

۶۲ وحید قریشی، مطالعہ حالی، مرتبہ ساحل احمد، ص ۱۸

۶۳ وحید قریشی

۶۴ وحید الدین سلیم، افاداتِ سلیم، مرتبہ خلیق انجم، دہلی، ۱۹۷۲ء، ص ص ۱۶۔۱۷

۶۵ مقالاتِ حالی، ص ۲۱۔۲۱۱

۶۶ مقدمہ شعروشاعری، ص ص ۲۵۔۲۶

۶۷ چند ہم عصر، ص ص۔۱۶۱۔۱۶۲

۶۸ خطوطِ حالی، ص۔۱۳۹

۶۹ خطوطِ حالی، ص۔۱۷۱

۷۰ خطوطِ حالی، ص۔۱۸۵

۷۱ خطوطِ حالی، ص ص۔۲۰۴۔۲۰۵

۷۲۔ خطوطِ حالی، ص ص۔ ۲۱۰

۷۳۔ خطوطِ حالی، ص۔ ۲۱۹

۷۴۔ خطوطِ حالی، ص۔ ۲۶۶

۷۵۔ خطوطِ حالی، ص۔ ۴۳۰

۷۶۔ خطوطِ حالی، ص۔ ۲۵۲

۷۷۔ خطوطِ حالی، ص۔ ۳۷۸

۷۸۔ خطوطِ حالی، ص۔ ۳۸۰

۷۹۔ خطوطِ حالی، ص۔ ۳۹۲

۸۰۔ خطوطِ حالی، ص۔ ۳۹۸

۸۱۔ خطوطِ حالی، ص۔ ۴۰۴

۸۲۔ خطوطِ حالی، ص۔ ۴۳۱

۸۳۔ خطوطِ حالی، ص۔ ۲

کمال احمد صدیقی

دیوانِ حالی کا مقدّمہ: ایک مطالعہ

تغیر کائنات، اور کائنات کی ہر چیز کا خاصہ ہے۔ مادّے کی شکل میں ہو، یا قوت کے روپ میں۔ ٹھوس، رقیق، یا گیس۔ یا چوتھے روپ میں، جسے plasma کہتے ہیں۔ کائنات اور اس میں تغیرات، اور اُس کے تصورات علم، مذہب، فلسفے اور تصوّف میں بنیادی اہمیت کے مقام رکھتے ہیں۔ شاعری میں بھی یہ اہم موضوعات رہے ہیں۔ تغیرات بھی موٹے طور سے دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جنھیں دوری یا ایک مشق وضع کرنے کی اجازت دیں تو دائرائی (cyclic) کہہ سکتے ہیں۔ جیسے موسم۔ اماوس سے اماوس تک یا چاندرات سے چاندرات تک یا نوچندی سے نوچندی تک۔ جسے پہلے sun spots کہتے تھے، اور اب solar winds کہتے ہیں، اس کی گیارہ سالہ سائیکل۔ دوسرے وہ تغیر، جن کو بظاہر کسی دور یا دائرہ کا حصّہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی مثالیں اتنی عام ہیں کہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔

معاشرے میں نوعی تبدیلی آتی ہے، تو نہ صرف سماجی ادارے بدلتے ہیں، بلکہ تصورات بھی بدلتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ آنے والے تغیر سے پہلے ہی، اس کے ساتھ آنے والی قدروں کی پیش بینی دانشوروں اور شاعروں کو ہو جاتی ہے۔ دانشوروں کے ساتھ

شاعروں کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ شعر، شاعری، شاعر اور شعور کا مادّہ مشترک ہے۔ شاعری جزویست از پیغمبری اسی لیے کہا گیا۔

شاعری میں یہ دور، عہدِ غالب، ذوقؔ و مومنؔ و ظفرؔ مانا گیا، لیکن دانشوری میں یہ دور سرسید احمد خان، ڈپٹی نذیر احمدؔ، خواجہ الطاف حسین حالیؔ، شبلی نعمانی اور محمد حسین آزاد کا دور ہے۔

سرسیّد، حالیؔ اور ڈپٹی نذیر احمدؔ نے نئے نظریات اور نئی اقدار کو فروغ دیا۔ جب ایک سے زیادہ فرقوں کے لوگ ساتھ ساتھ رہتے ہوں، تو سماج کی اصلاح کا بیڑا اٹھانے والے سب سے پہلے اپنے فرقے میں رائج اُن مذہبی امور پر توجہ دیتے ہیں، جو مذہبی نظریات یا صحیفے کی ایسی تفسیروں کی وجہ، جو تفسیر بالرائے کے زمرے میں آتی ہیں، اور مذہبی احکامات کو مسخ کرتی ہیں۔ عربی کا رواج ختم ہوا تو قرآن کا ترجمہ فارسی میں ہوا۔ فارسی کا چلن ختم ہوا تو اردو میں ترجمہ ہوا۔ سرسیّد عربی اور فارسی کے جیّد عالم تھے۔ عربی میں وہ ایک رسالہ لکھ چکے تھے، جس میں زمین کی گردش کا بطلان کیا تھا۔ لیکن آدمی تھے کھلے دماغ کے۔ اپنے بیٹے کی تعلیم کے سلسلے میں ولایت گئے تو وہاں کے کتاب خانوں سے سیرت سے متعلق وہ کتابیں دیکھیں اور حوالے جمع کیے، جن سے اُن اعتراضوں کو دفع کیا، جو مغربی مصنفین نے پیغمبرِ اسلام پہ کیے تھے۔ لندن کے کتاب خانوں نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا، اور نئے سائنسی نظریوں سے روشناس کرایا۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد زمین کے ساکت ہونے کے بارے میں اپنے خیالات سے نہ صرف رجوع کیا، بلکہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے، اس کے بارے میں تفصیلی مضمون لکھا۔

قرآن کا اردو میں ترجمہ ہو چکا تھا۔ لیکن وہ شاید اس سے مطمئن نہیں تھے۔ چنانچہ انہوں نے قرآن کا اردو میں ترجمہ کیا۔ (تفسیر القرآن) ڈپٹی نذیر احمد نے بھی قرآن کا ترجمہ عام بول چال کی زبان میں کیا، لیکن مسخ شدہ مذہبی احکام اور رائج خیالات میں جن کا

مفادِ خصوصی تھا، انہوں نے اس ترجمے پر ہنگامہ کرایا، اور بالآخر نذیر احمد کو چھاپے کی کتابوں کا ذخیرہ تلف کرنا پڑا، مجمع عام کے سامنے۔ لیکن اطلاع یہ ہے کہ اس کی ایک کاپی بچ گئی، جو جامعہ ملیہ کی لائبریری میں ہے۔ کوشش کے باوجود یہ بھی نہ دیکھ سکا، جس کا افسوس ہے۔ اس ترجمے کے تلف کیے جانے کے بعد انہوں نے افسانے کی راہ پکڑی۔ نہ صرف ڈپٹی نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں بلکہ اس کے یہ ناول ادب کے افادی پہلو کا نمونہ ہیں۔

ولیؔ دکنی/ولی اورنگ آبادی سے لے کر غالبؔ تک اردو شاعروں کا ایک ایسا سلسلہ ہے جن کے یہاں فارسی شاعری کی روایات کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کی مستحکم روایات ملتی ہیں۔ دلی اور لکھنؤ کی شاعری میں مشترک خصوصیات زیادہ ہیں اور ایک کو دوسری سے ممیّز کرنے والی خصوصیات کم۔ اردو کے، بلکہ دنیا کے پہلے ماہرِ لسانیات، جنہوں نے فارسی اور سنسکرت زبانوں کو ایک خاندان کی زبانیں بتایا، جو خود بھی شاعر تھے، اور ان کے عہد کے بیشتر قابلِ ذکر شعرا نے اُن سے استفادہ کیا، اور ان کے آگے زانوے ادب تہہ کیا، مثمر اور سراج اللغۃ کے مصنف، سراج الدین علی خانِ آرزو، لکھنؤ آ کر رہے، اور آخری سانس یہیں لی۔ سوداؔ، میرؔ، انشاؔ، مصحفیؔ، میر ضاحک، میر حسن سبھی تو دلی سے اودھ گئے۔ میر حسن ہی کے خانوادے سے میر انیسؔ تھے۔ خالص لکھنوی شاعر ناسخؔ کو لیں۔ نہ صرف ان کی زمینوں میں غالبؔ نے غزلیں کہیں، بلکہ جب اپنا ابتدائی اسلوب بدلا، جس کے بارے میں ان کا ایک مقطع ہے

طرزِ بیدلؔ میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

تو جو اسلوب انہوں نے اپنایا اُس میں میرؔ، سوداؔ اور ناسخؔ کے طرزوں کی دھاریاں ہیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ رنگِ شاعری بدلتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وقت کے

ساتھ ساتھ معاشرے میں بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ یہ زندگی کے مسائل پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں، اور شاعری کے مذاق پر بھی۔ اجتماعی مذاق اور شاعر کے انفرادی مذاق، دونوں پر۔ لفظ بذاتہٖ جادو نہیں، ان مفاہیم اور معانی کی وجہ سے جادو ہو جاتا ہے، جو اس کے صحیح صرف کی وجہ سے اجاگر ہوتے ہیں، اپنی پرتیں کھولتے ہیں۔ اردو شاعری کی پہلی بوطیقا حالؔی نے لکھی (اگرچہ مثالوں میں فارسی شعر بھی لائے)۔ حالؔی نے اپنے دیوان کا مقدمہ لکھا، جو ۱۸۹۳ء میں چھپا۔ کچھ نے اس مقدمے کو حالی کی شاعری کے افادی رنگ کا جواز، کچھ نے معذرت سمجھا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس مقدمہ کو دیوان سے الگ کر کے، ایک کتاب کی صورت میں چھاپا گیا، اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس کا شمار اردو کی سب سے زیادہ شائع ہونے والی کتابوں میں کیا جاتا ہے۔ شعر کی ماہیت سے شبلؔی نے بھی شعر العجم میں بحث کی ہے، محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" اور "سخندانِ فارس" میں نکات کی وضاحت کی ہے۔ مگر حالؔی نے جو کچھ لکھا ہے، اس کی بنیاد پر بیسویں صدی میں پوری ایک تحریک، اور بہت طاقتور تحریک ابھری۔ یہ ترقی پسندی کی تحریک ہے۔ یہ ایک نہایت سنجیدہ تحریک تھی۔ ایک اشتعالی دور سے بھی گذری، اور اب اس کے اثرات محسوس یا غیر محسوس طور پر ہر اس شاعر اور ناقد کے ذہن کا حصہ ہیں، جو شاعری کو صرف تفننِ طبع کا ذریعہ نہیں سمجھتے، بلکہ انفرادی اور سماجی زندگی، اور اس کی حقیقتوں سے اس کے رشتے کو مانتے ہیں۔ لفظ اپنے مفاہیم اور معانی کی وجہ سے ہے۔ حالؔی نے دو جملوں میں ایک بہت گہری اور اہم بات کہی ہے

> "لفظ جادو کی فوج سامنے کھڑی کر دیتا ہے۔ اور کبھی وہ ایک ایسے خیال کو، جو کئی جلدوں میں بیان ہو سکے، ایک لفظ میں ادا کر دیتا ہے۔"

مناسب لفظ کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے اس مبالغے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

حالیؔ سے پہلے لفظ کی مرصّع کاری کی بات ہوتی تھی۔ یہ تصوّر اُس سے مختلف ہے

۲۔ ”تخیّل یا امیجینشن کی تعریف کرنی بھی ایسی ہی مشکل ہے، جیسی کہ شعر کی تعریف۔ مگر من وجہ اس کی ماہیت کا خیال ان لفظوں سے دل میں پیدا ہوسکتا ہے، یعنی وہ ایک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا ذخیرہ جو تجربے یا مشاہدے کے ذریعے سے ذہن میں پہلے سے مہیّا ہوتا ہے، یہ مکرّر اس کو ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشتی ہے، اور پھر اس کو الفاظ کے ایسے دلکش پیرایہ میں جلوہ گر کرتی ہے، جو معمولی پیرایوں سے بالکل یا کسی قدر الگ ہوتا ہے۔ اس تقریر سے ظاہر ہے کہ تخیّل کا عمل اور تصرّف جس طرح خیالات میں ہوتا ہے، اسی طرح الفاظ میں بھی ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات شاعر کا طریقۂ بیان ایسا نرالا اور عجیب ہوتا ہے کہ غیر شاعر کا ذہن کبھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہی ایک چیز ہے جو کبھی تصرّفات اور خیالات میں تصرّف کرتی ہے اور کبھی الفاظ وعبارت میں۔ اگرچہ اس قوت کا ہر ایک شاعر کی ذات میں موجود ہونا نہایت ضروری ہے، لیکن ہمارے نزدیک اس کا عمل شاعر کے ہر ایک کلام میں یکساں نہیں ہوتا، بلکہ کہیں زیادہ ہوتا ہے، کہیں کم ہوتا ہے، اور کہیں محض خیالات میں ہوتا ہے، کہیں محض الفاظ میں“

حالیؔ نے جس نکتے پر توجہ دلائی ہے، وہ یہ ہے کہ شعر کی تخلیق ایک شعوری عمل ہے، تخیل خود کار یا بے لگام نہیں ہوتا، اور خواب کے عمل سے یکسر مختلف ہوتا ہے، اور شعری تخلیق چونکہ الفاظ کے وسیلے یا ذریعے سے ہوتی ہے، اس لیے الفاظ کا استعمال تخلیقی عمل کا ایک اہم حصہ ہے۔

۳۔ "اگرچہ قوتِ متخیلہ، اُس حالت میں بھی، جب کہ شاعر کی معلومات کا دائرہ نہایت تنگ اور محدود ہو، اسی معمولی ذخیرے سے کچھ نہ کچھ نتائج نکال سکتی ہے، لیکن شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ نسخۂ کائنات، اور اُس میں سے خاص کر نسخۂ فطرۃ انسانی کا مطالعہ نہایت غور سے کیا جائے۔ انسان کی مختلف حالتیں، جو زندگی میں اس کو پیش آتی ہیں، ان کو تعمق کی نگاہ سے دیکھنا۔ جو امور مشاہدے میں آئیں، ان کے ترتیب دینے کی عادت ڈالنی۔ کائنات میں گہری نظر سے، وہ خواص اور کیفیات مشاہدہ کرنے، جو عام آنکھوں سے مخفی ہوں، اور فکر میں مشق و مہارت سے یہ طاقت پیدا کرنی، کہ وہ مختلف چیزوں سے مختلف خاصیتیں، فوراً اخذ کر سکے، اور اس سرمایہ کو اپنی یاد کے خزانے میں محفوظ رکھے۔"

حالیؔ نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ صرف مشاہدہ، سرسری مشاہدہ کافی نہیں ہے۔ مشاہدہ کو سمجھنا ضروری ہے، اور مشاہدے کو استعدادِ علمی کے بغیر نہ سمجھا جا سکتا ہے، اور نہ کوئی بامعنی استنباط کیا جا سکتا ہے۔ مشاہدات کو سمجھنا ذہنی تربیت کا حصہ ہے، اور یہ ایک علمی عمل ہے۔ علم اور معلومات کا جو ذخیرہ ذہن کے خزانے میں جمع ہوتا ہے، وہ آگے بھی حقیقتوں

کو سمجھنے میں معاون ہوتا ہے، اور اس سے شاعری کو جلا ملتی ہے۔

داخلی دنیا، خارجی دنیا سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتی۔ اس نکتے کو حالی نے یوں بیان کیا ہے

۴۔ "قوتِ متخیلہ، کوئی شے بغیر مادّہ پیدا نہیں کرسکتی۔ بلکہ جو مصالح اس کو خارج سے ملتا ہے، وہ اس میں اپنا تصرّف کر کے ایک نئی شکل تراش لیتی ہے، جتنے بڑے بڑے نامور شاعر دنیا میں گزرے ہیں، وہ کائنات، یا فطرتِ انسانی کے مطالعہ میں ضرور مستغرق رہے ہیں۔ جب رفتہ رفتہ اس مطالعہ کی عادت ہو جاتی ہے، تو ہر ایک چیز کو غور سے دیکھنے کا ملکہ ہو جاتا ہے، اور مشاہدوں کے خزانے، گنجینۂ خیال میں خود بخود جمع ہونے لگتے ہیں۔"

الفاظ کی سحر کاری پر حالی نے ایک بار اور زور دیا ہے

۵۔ "شعر کی ترتیب کے وقت اوّل، متناسب الفاظ کا انتخاب کرنا، اور پھر ان کو ایسے طور پر ترتیب دینا کہ شعر سے معنیِ مقصود کے سمجھنے میں مخاطب کو کچھ تردد باقی نہ رہے، اور خیال کی تصویر ہو بہو آنکھوں کے سامنے پھر جائے، اور باوجود اس کے، اُس ترتیب میں ایک جادو مخفی ہو، جو مخاطب کو مُسخر کر لے۔ اس مرحلے کا طے کرنا جس قدر دشوار ہے، اُسی قدر ضروری بھی ہے، کیونکہ شعر میں اگر یہ بات نہیں ہے، تو اس کے کہنے سے نہ کہنا بہتر ہے "

لفظ کے جادو کی بات حالی پہلے بھی لکھ چکے تھے۔ یہاں انہوں نے صرف خود کو

دہرایا نہیں، اس نکتے کو خط کشیدہ کرنے کے لیے۔ لفظ کے جادو کی بات یہاں ضمنی اہمیت کی نہیں ہے۔ اہمیت اس کی ہے کہ کوئی ایہامی کیفیت نہ ہو۔ اہمیت معنی مقصود کی ہے، کہ وہ ادا بھی ہو، اور اس کے سمجھنے میں مخاطب کو کوئی تردد باقی نہ رہے۔ شعر کے مفہوم کا کچھ حصّہ مقدر تو ہوسکتا ہے۔ اور یہ ایجاز کی خوبی کے تحت آتا ہے۔ شعر کی زحمت کرنے کی ضرورت ہوسکتی ہے، اگر شعر، شعر ہے، الفاظ درست اور معنی چست ہوں۔ حالی نے بامعنی اور قابلِ فہم شاعری کی بوطیقا لکھی ہے، معلّق مفاہیم والی شاعری کی نہیں۔ حالی نے واضح کیا ہے

۶۔ ''جن لوگوں کو یہ قدرت ہوتی ہے کہ شعر کے ذریعہ سے اپنے ہم جنسوں کے دل میں اثر پیدا کرسکتے ہیں، ان کو ایک ایک لفظ کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ فلاں لفظ جمہور کے جذبات پر کیا اثر رکھتا ہے، اور اس کے اختیار کرنے پر یا ترک کرنے سے کیا خاصیت بیان میں پیدا ہوتی ہے۔ نظمِ الفاظ میں اگر بال برابر بھی کمی رہ جاتی ہے، تو وہ فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ ہمارے شعر میں کون کسی بات کی کسر ہے۔ جس طرح ناقص سانچے میں ڈھلی ہوئی چیز فوراً کھٹکی کھاتی ہے، اسی طرح اُن کے شعر میں اگر تاو بھاو بھی فرق رہ جاتا ہے، معاً ان کی نظر میں کھٹک جاتا ہے ''

ہم یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ شاعری کا مدار جس قدر الفاظ پر ہے، اُس قدر معانی پر نہیں، معنی کیسے ہی بلند اور لطیف ہوں، اگر عمدہ الفاظ میں بیان نہ کیے جائیں گے، ہرگز دلوں میں گھر نہیں کرسکتے، اور ایک مبتذل مضمون

پاکیزہ الفاظ میں ادا ہونے سے قابلِ تحسین ہوسکتا ہے۔"

لفظ و معنی کی بحث میں حالی کی یہ تحریر اُلجھن میں ڈالنے والی ہوتی، اگر فوراً ہی انہوں نے وضاحت نہ کی ہوتی

> ۷۔ اگر شاعر کے ذہن میں صرف وہی محدود خیالات جمع ہیں، جن کو اگلے شعرا باندھ گئے ہیں، یا صرف وہی معمولی باتیں اُس کو بھی معلوم ہیں، جیسی کہ عام لوگوں کو معلوم ہوتی ہیں، اور اُس نے شاعری کی تکمیل کے لیے اپنی معلومات کو وسعت نہیں دی، اور صحیفۂ فطرت کے مطالعہ کی عادت نہیں ڈالی، اور قوت متخیلہ کے لیے زیادہ مصالح جمع نہیں کیا، گو زبان پر اس کو کیسی ہی قدرت اور الفاظ پر کیسا ہی قبضہ حاصل ہو، اس کو دو شکلوں میں سے ایک شکل ضرور پیش آئے گی۔ یا تو اس کو وہی خیالات جو اگلے شعرا باندھ چکے ہیں، تھوڑے تغیر کے ساتھ، انہیں کے اسلوب پر بار بار باندھنے پڑیں گے، یا ایک ایک مبتذل اور پامال مضمون کے لیے نئے نئے اسلوب بیان ڈھونڈھنے پڑیں گے، جن کا مقبول ہونا نہایت مشتبہ ہے اور نامقبول ہونا قرینِ قیاس۔"

لفظ و معنی، مشاہدہ، اور اپنے، اپنے سے پہلے کے لوگوں کے مشاہدوں کا نچوڑ، یعنی علم اور مطالعہ ہی کافی نہیں، اور جو کچھ مشاہدے میں آیا، اس کو جوں کا توں نظم کر دینا، ہمیشہ اچھی شاعری کی طرف رہنمائی نہیں کرتے۔ شعر کے لیے کچھ اور بھی ضروری ہے۔ حالی کے لفظوں میں

۸۔ صرف نیچر کا مطالعہ اور معلومات کا ذخیرہ جمع کر لینا ہی شاعر کا کام نہیں ہے، بلکہ ہر ایک شے کی روح میں، انکا انتخاب کرنا اور ان کی تصویر کھینچنا شاعر کا کام ہے۔ شاعر، مثلاً نباتات اور پھول پھل کو اس نظر سے نہیں دیکھتا، جس نظر سے کہ ایک محقق علم نباتات کو دیکھتا ہے۔ یا وہ ایک واقعہ تاریخی پر اس حیثیت سے نظر نہیں ڈالتا، جس حیثیت سے کہ مورخ نظر ڈالتا ہے۔ وہ ہر ایک شے سے وہ خاصیتیں چن لیتا ہے، جن پر قوتِ متخیلہ کا عمل چل سکے، اور جو عام نظروں سے مخفی ہوں شاعر ہر ایک چیز اور ہر ایک واقعہ میں سے صرف ذوقیات لے لیتا ہے، جن میں اس کے سوا کسی کا حصہ نہیں، اور باقی کو چھوڑ دیتا ہے۔"

ذوقیات کی اصطلاح اردو کو حالیؔ کی دین ہے۔ ایسی بامعنی اور خوبصورت اصطلاح کا چلن نہیں ہوا، یہ حیرت کی بات ہے۔ نیچر، حقیقت، واقعات، مشاہدات وغیرہ کا تاثر جو لذت، نشاط حسیات، سے متعلق ہے، ذوقیات ہے۔ ایک صدی سے زیادہ زمانہ مقدمہ پر گزرا، حالیؔ سے زیادہ جامع طریقے سے اس نکتے پر نہیں لکھا گیا۔ بلکہ شاید اس نکتے سے بحث بھی نہیں کی گئی۔

بحث کو حالی نے یوں سمیٹا ہے

۹۔ "شاعر کی ذات میں تین وصف متحقق ہونے ضرور ہیں۔ ایک وہبی، یعنی تخیل یا امیجینیشن اور دو کسبی یعنی صحیفۂ فطرت کے مطالعہ کی عادت اور الفاظ پر قدرت۔

اب تخیل کی نسبت اتنا جان لینا اور ضرور ہے کہ اس کو،

جہاں تک ممکن ہو، اعتدال پر رکھنااور غالب نہ ہونے
دیناچاہیے، کیونکہ جب اس کا غلبہ طبیعت پر زیادہ
ہوجاتا ہےاور وہ قوت ممیّزہ کے قابو سے، جواس کی روک
ٹوک کرنے والی ہے، باہر ہوجاتا ہےتواس کی یہ حالت
شاعر کے حق میں نہایت خطرناک ہے۔قوت متخیلہ ہمیشہ
خلاّقی اور بلند پروازی کی طرف مائل رہتی ہے، مگر قوتِ
ممیزہ،اس کی پرواز کومحدود کرتی ہے،اس کی خلاّقی کی مزاحم
ہوتی ہےاوراس کوایک قدم بےقاعدہ نہیں چلنے دیتی۔قوت
متخیلہ کیسی ہی دلیراور بلند پرواز ہو، جب تک کہ وہ قوتِ
ممیزہ کی محکوم ہے،شاعری کواس سے کچھ نقصان نہیں پہنچتا،
بلکہ جس قدراس کی پرواز بلند ہوگی، اسی قدرشاعری اعلیٰ
درجے کو پہنچے گی۔''

سادگی اور دوسرے اوصاف پر بھی گفتگو ہے،لیکن میں اسی مقام پر اجازت
چاہوں گا کہ اس مطالعہ کوختم کروں۔

یادگارِ غالب

خواجہ الطاف حسین حالی

اپنے موضوع پر ایک منفرد، مستند اور بنیادی کتاب جو غالب شناسی کا نقطۂ آغاز بھی ہے اور تحقیق کا بے مثال کارنامہ بھی۔ مرزا غالب کی عہد آفریں شخصیت اور شاعری سے متعلق کوئی بھی مطالعہ اس کتاب کے بغیر مکمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اردو زبان میں اس کتاب نے سوانح نگاری اور ادبی تنقید کے میدان میں کئی نسلوں کی رہنمائی کی ہے۔

"یادگارِ غالب" پہلی بار ۱۸۹۷ء میں نامی پریس کانپور سے چھپی تھی۔ اس مستند اولین ایڈیشن کو، جو اب کم یاب بلکہ نایاب ہے، غالب انسٹی ٹیوٹ نے نہایت اہتمام سے فوٹو آفسیٹ کے ذریعہ چھاپا ہے۔
عمدہ سفید کاغذ پر مضبوط جلد، دلکش سرِ ورق کے ساتھ۔

صفحات ۴۳۸

قیمت ۱۲۰ روپے

شمیم حنفی

حالؔی اور نشاۃ ثانیہ

تاریخ کی تعبیر اور اُس کی سمتوں کے تعین کا کام جب سے سیاست دانوں نے اپنے ہاتھ میں لیا ہے، ہندوستان (یا برصغیر) کی تہذیبی نشاۃ ثانیہ کے مسئلے نے ایک عجیب و غریب شکل اختیار کرلی ہے، خاصی پیچیدہ، پریشان کن بلکہ ہیبت ناک شکل اور اس کی گرفت نے آرٹ، ادب اور کلچر سب کے لیے مشکلات پیدا کردی ہیں۔ ہمارے سماجی مفکروں اور دانشوروں کا ایک بہت بڑا حلقہ برطانوی تسلّط کے دور یعنی کولونیل دور کو ہماری آج کی تمام آفاتِ ارضی و سماوی کا ذمّے دار سمجھتا ہے۔ کولونیل شعور کی اصطلاح ایک گالی بن چکی ہے اور اپنے موجودہ شعور کو ڈی کولونائز کرنے کا منصوبہ ایک قومی دستورالعمل۔ مجھے اس نیک اندیشی سے کوئی شکایت نہیں۔ قومی غیرت اور حمیّت کا احساس، محروم اور پسماندہ اقوام کے لیے داخلی توانائی کے ایک خزانے کی حیثیت رکھتا ہے۔ پھر ہم تو ایک عظیم الشان اور طویل تہذیبی روایت کے امین اور وارث ہیں۔ اپنی تاریخ کے حساب کو درست کرنے کا عمل جسے وی۔ ایونا ٹپال نے "Balancing act of history" کہا ہے، اُس کی حدیں بتدریج ہمارے تہذیبی تشخص اور موجودہ سیاست کے گرد بھی پھیلتی جارہی ہیں۔ اس کا اثر اجتماعی زندگی کے

تمام شعبوں پر دکھائی دیتا ہے۔ ایسی صورت میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کی تہذیبی نشاۃ ثانیہ کے مفہوم اور اس کے مجموعی رول کی بابت، ایک نئی سطح پر غور وفکر کا سلسلہ شروع ہو جانا فطری ہے۔ لیکن تشویش کی بات یہ ہے کہ اس بحث نے ایک بہت جذباتی رُخ اختیار کر لیا ہے۔

اس جذباتی رُخ کا نشانہ، اور یہ بڑے افسوس کی بات ہے، صرف برطانوی حکومت، زبانِ انگریزی اور مغربی تہذیب نہیں بنتی۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کی اصلاحی انجمنوں اور ہمارے اُن بزرگوں پر بھی اس کی ضرب پڑتی ہے جنھوں نے ہندوستان کی مختلف زبانوں کے واسطے سے ایک نئے شعور کی روایت قائم کی۔ تہذیبی نشاۃ ثانیہ کے مفہوم کی بابت بھی اسی لیے ہم سب ایک زبردست کنفیوژن اور ژولیدہ فکری کے شکار ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر ہندوستان اور پاکستان کی احیا پرست جماعتوں کی فکری اساس پر غور فرمائیے۔ ان سب میں یہ تصور عام ہے کہ علاحدگی پسندی اور اپنے اپنے تہذیبی تشخص پر ان کی طرف سے جو اصرار کیا جاتا ہے اُس کی تہہ میں دراصل ایک نئی بیداری، ہندوستانی یا اسلامی فکر کی ایک نئی تشکیل کا میلان پوشیدہ ہے۔ سرسید، حالؔی، آزاؔد (محمد حسین)، نذیر احمد کے تہذیبی اور معاشرتی تصورات کو سمجھنے میں عام طور پر جس غلطی اور زیادتی کا ارتکاب کیا جاتا ہے اُس کی ذمہ داری بھی دراصل اسی رویے پر عاید ہوتی ہے۔

اصل مسئلے یا حالؔی کے توسط سے جدید تہذیبی نشاۃ ثانیہ کے انتہائی الجھے ہوئے تصور کی طرف بڑھنے سے پہلے بہتر یہ ہوگا کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کی ذہنی بیداری کے مضمرات پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ حوالے اور اقتباسات مندرجہ ذیل ہیں

۱۔ پنڈت جواہر لال نہرو جو تاریخ کا ایک روشن اور ترقی پسندانہ شعور رکھتے تھے اور انگریزوں کو دورِ جدید میں ارتقا اور تبدیلی کی علامت کے طور بھی دیکھتے تھے لکھتے ہیں

انگریزی تعلیم نے ہندوستانی افق کو وسیع تر کیا، انگریزی ادب اور مغربی اقدار کے لیے یہاں (ہندوستان میں) قبولیت اور پسندیدگی کے جذبات پیدا ہوئے، ہندوستانی زندگی کے چند پہلوؤں اور بعض روایات سے انحراف کیا گیا اور سیاسی اصلاحات کے مطالبے میں تیزی آگئی۔

(ڈسکوری آف انڈیا، ص ۳۱۹)

۲۔ ماسٹر رام چندر نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا

یہ بھی ناظرین پر منکشف ہونا چاہیے کہ علم اور عقل کے زور سے کیا کیا انسان کر سکتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ نے کچھ انگریزوں کو ہی طاقت بخشی ہے کہ بہ سبب فضیلت کے کیا کیا کام کرتے ہیں اور کچھ انگریزوں ہی پر یہ مدار نہیں ہے بلکہ جو شخص علوم اور فنون پر بخوبی توجہ کرے گا وہی بہرۂ وافی اٹھاوے گا۔

۳۔ ایک اقتباس اسی سلسلے میں کارل مارکس کا بھی دیکھتے چلیں جس نے ہندوستان سے متعلق اپنے خطوط میں برطانوی تسلط اور نوآبادیاتی فکر کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا ہے۔ یہ الفاظ مارکس کے ایک مراسلے سے ماخوذ ہیں جو اس نے نیویارک ڈیلی ٹریبون کے نام ۱۰ر جون ۱۸۵۳ء کو لکھا تھا۔ مارکس نے اس مراسلے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مظالم پر تفصیلی اظہار خیال کیا ہے کمپنی کے ہاتھوں ہندوستان کے معاشی استحصال کی مذمت کے باوجود مارکس یہ سمجھتا تھا کہ "انگریزوں نے ہندوستان میں ایک سماجی انقلاب کی داغ بیل ڈالی گو کہ اُن کا طریق کار بہت غلط تھا اور اس کے پیچھے ان کے اپنے مفاد کا جذبہ کارفرما تھا۔"

اس نوع کے تاثر کی بازگشت ہمیں انیسویں صدی کے کئی مورخوں اور سماجی مفکروں کے یہاں سنائی دیتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض اصحاب ہندوستان پر انگریزی حکومت کے قیام یا مغربی تہذیب کے تسلط اور مغلیہ اقتدار کے خاتمے کو ایک دوررس قومی المیے سے تعبیر کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ مغلوب کا سیاسی زوال ایک عظیم الشان تہذیب کے خاتمے کا اعلانیہ بھی تھا۔ ہندوستانی علوم اور طریق تعلیم پر لارڈ میکالے کے اعتراضات کا سلسلہ ۱۸۳۴ء میں اس کی ہندوستان میں آمد کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ ۱۸۱۳ء کے تعلیمی چارٹر کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میکالے نے کہا تھا کہ ''کمپنی نے ابھی تک سنسکرت، عربی اور فارسی کے ''پس ماندہ'' علوم پر جو رقم صرف کی ہے اس سے کسی تعمیری مقصد کی تکمیل ممکن نہیں۔ ہندوستانی معاشرے کی اصلاح کا واحد ذریعہ انگریزی تعلیم اور طرزِ فکر ہے'' ۱۸۳۵ء میں کمپنی نے ہندوستان میں اپنی تعلیمی پالیسی کا ایک نیا خاکہ ترتیب دیا اور اسی سال ۷ر مارچ کو لارڈ ولیم بینٹنگ نے ایک تجویز کے ذریعے مشرقی علوم و فنون کی تدریس ختم کر دی۔ اس تجویز کے مطابق حکومت برطانیہ کا سب سے بڑا مقصد اہلِ ہند میں یورپین لٹریچر اور سائنس کی اشاعت تھا'' چنانچہ ''جس قدر رقوم مقاصدِ تعلیم کے لیے مخصوص تھیں انہیں صرف انگریزی تعلیم پر صرف کرنے کی سفارش کی گئی''۔ اسی کے ساتھ فارسی کے اقتدار کی جگہ انگریزی نے لے لی اور سرکاری ملازمتیں انگریزی تعلیم سے بہرہ ور اشخاص کے لیے مخصوص کر دی گئیں۔ اس واقعے کو مولوی عبدالحق نے مشرقی روایات اور علوم کی بنیادیں اکھاڑنے کی کوشش سے تعبیر کیا ہے۔ (مرحوم دلّی کالج، ص ۱۷)۔ ہمایوں کبیر کے خیال میں مغربی عقلیت کے ہاتھوں یہ ہندوستان کی روحانی شکست تھی۔ (دَ انڈین ہیریٹیج۔ ص ۱۲۸) خواجہ احمد فاروقی نے ۱۸۳۵ء کو ہندوستان کی ثقافتی غلامی کا پہلا سال قرار دیا ہے (بحوالہ صدیق الرحمٰن قدوائی، ماسٹر رام چندر، ص ۲۳)۔ مغلیہ تہذیب کے زوال اور ہندوستان پر برطانوی تہذیب کے تسلّط کی

مذمت کرنے والوں میں کئی مغربی مورخین بھی پیش پیش ہیں۔ مثال کے طور پر "ٹوائلائٹ آف دَ مغلس" "(twilight of the Mughals) کے مصنف پرسیول اسپئیر جن کا خیال تھا کہ انگریزوں کی آمد کے ساتھ ہندوستان میں ایک عظیم ثقافتی ورثے کی شاندار تاریخ کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ غرض کہ ہماری اجتماعی تاریخ میں جدید تہذیبی نشاۃ ثانیہ کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے اور رواروی میں اس کے مفہوم کو طے کرنا غلط ہوگا۔ ایک ایسا مسئلہ جس کے بارے میں کوئی فیصلہ کن رائے ابھی تک قائم نہیں کی جاسکی ہے اور نہ حالیہ برسوں میں قومیت اور قومی تشخص کی طرف ایک جذباتی رویے نے جس مسئلے کو مزید الجھادیا ہے، حالی اسکی بابت کیا موقف رکھتے تھے، اس سوال کا دوٹوک جواب نہیں دیا جاسکتا۔ تاریخ اور سیاست کے رشتے کی اپنی جدلیات ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں تہذیبی آویزش کے ایک مشکل دور میں سیاسی تاریخ کی مخصوص منطق یا dynamics کو سمجھے بغیر جدید تہذیبی نشاۃ ثانیہ کے سلسلے میں حالی کے نقطۂ نظر کا تعین آسان نہیں ہے۔ لیکن قومی شعور کے ڈی کولونائزیشن کے عمل کو جذباتی انتہاپسندی کی گرفت سے بچائے رکھنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ جدید تہذیبی نشاۃ ثانیہ پوری طرح ایک ساتھ ردّ وقبول کے مراحل سے گزری تھی۔ خود ہندوستانیوں میں ایسے منتخب افراد جو قومی سطح پر ذہنی قیادت کا بیڑا اٹھائے ہوئے تھے، انہیں نشاۃ ثانیہ کے معترضین میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ ہندوؤں میں راجہ رام موہن رائے اور مسلمانوں میں سرسید کی مثال سامنے ہے۔ دونوں کی قومی دردمندی اور خلوص مسلّم ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی طے ہے کہ نشاۃ ثانیہ کے قدروں کو دونوں نے سوچ سمجھ کر قبول کیا تھا۔ اس قبولیت کی تہہ میں تاریخ کے فیصلوں کے علاوہ، ان دونوں کے اپنے حقیقت پسندانہ تصور کی تائید بھی شامل ہے۔ یہاں تفصیل میں جانے کا موقعہ نہیں ہے۔ تاہم راجہ رام موہن رائے اور سرسید کے دو اقتباسات کی نشاندہی اس نکتے کی وضاحت کے لیے ضروری ہے۔ ۱۸۱۳ء میں برطانوی پارلیمنٹ کے توسط سے ہندوستانی علوم وادبیات کی توسیع وترقی کے لیے ایک لاکھ روپے کی

امدادی رقم منظور کی گئی۔ اس واقعے پر اپنے ردِ عمل کا اظہار راجہ رام موہن رائے نے جن لفظوں میں کیا وہ حسب ذیل ہیں

ہمیں پوری امید تھی کہ یہ روپیہ ہندوستانیوں کو مختلف علومِ جدیدہ سے روشناس کرانے کے لیے ذہین اور قابل یورپین اساتذہ پر خرچ کیا جائے گا۔ لیکن اب ہمیں معلوم ہوا کہ ہندو پنڈتوں کی نگرانی میں ایک سنسکرت مدرسے کے قیام پر کمپنی یہ رقم خرچ کر رہی ہے۔ ایسی تعلیم پر جو پہلے ہی سے ہندوستان میں رائج ہے سنسکرت زبان جو اتنی مشکل اور دقیق ہے کہ اس کو سیکھنے میں پوری زندگی صرف ہو جاتی ہے اور سبھی جانتے ہیں کہ اسی زبان نے صدیوں تک صحیح علم کے حصول کی راہ میں ہندوستانیوں کے لیے رکاوٹیں پیدا کی ہیں، افسوس ناک حد تک۔ اس زبان کے ذریعے جو علم حاصل ہو سکتا ہے، اُس کی قیمت اُس کوشش اور ریاضت کے مقابلے میں بہت کم ہے جو اس زبان کو سیکھنے کے لیے درکار ہوتی ہے۔

(بہ حوالہ پرسیول گریفتھس موڈرن انڈیا، ص ۴۶)

اسی طرح سرسید نے ۱۵/ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو علی گڑھ سائنٹیفک سوسائٹی کے نام ایک خط میں جس عقیدت مندانہ غلو کے ساتھ انگریزی تہذیب و تعلیم کی برکتوں کا اعتراف کیا تھا اُس سے سرسید کے تہذیبی تصور اور نشاۃ ثانیہ کے سلسلے میں اُن کے موقف کی نشاندہی بھی ہو جاتی ہے۔ اس خط کا یہ اقتباس دیکھیے

ہم جو ہندوستان میں انگریزوں کو بد اخلاقی کا ملزم ٹھہرا

کر (اگرچہ اب بھی میں اس الزام سے ان کو بری نہیں کرتا) یہ کہتے تھے کہ انگریز ہندوستانیوں کو بالکل جانور سمجھتے ہیں اور نہایت حقیر جانتے ہیں، یہ ہماری غلطی تھی۔ وہ ہم کو سمجھتے ہی نہ تھے بلکہ درحقیقت ہم ایسے ہی ہیں۔ میں بلا مبالغہ نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ تمام ہندوستانیوں کو اعلیٰ سے ادنیٰ تک، امیر سے لے کر غریب تک، عالم فاضل سے لے کر جاہل تک، انگریزوں کی تعلیم و تربیت اور شائستگی کے مقابلے میں درحقیقت ایسی ہی نسبت ہے جیسی نہایت لائق اور خوبصورت آدمی کے سامنے نہایت میلے کچیلے جانور کو

اسی خط میں آگے چل کر سر سید نے انگریزی زبان کے بارے میں لکھا تھا

تمام ترقی کا باعث انگلستان میں صرف یہ ہے کہ تمام چیزیں، تمام علوم، تمام فن جو کچھ ہے، اسی قوم کی زبان میں ہے

(مکاتیب سر سید احمد خاں، مرتبہ مشتاق حسین، ص ۱۸)

راجہ رام موہن رائے اور سر سید، دونوں کا بڑے سے بڑا معترض بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان کی شخصیت ماضی کے احساس سے خالی تھی یا یہ کہ ماضی کی تاریخ سے یہ نابلد تھے۔ ''آئین اکبری'' کی تدوین سے لے کر ''آثار الصنادید'' کے محققانہ مطالعے اور ترتیب تک، سر سید کا شعور اپنی تاریخ کے دائرے میں ہمیشہ سرگرم رہا۔ راجہ رام موہن رائے اور سر سید، دونوں کے ساتھ، واقعہ یہ ہے کہ اپنی تاریخ کے سیاق میں ہی یہ اپنے عہد کے شعور تک پہنچے۔ دونوں کو تاریخ کے جبر کا اندازہ تھا۔ اسی لیے اپنی اپنی قوم کی فکری معذوریوں اور

جذباتی حدود سے بھی دونوں اچھی طرح آگاہ تھے۔ انہیں اس حقیقت کا احساس بھی تھا کہ تاریخ اپنے آپ میں ایک سخت اور وقت طلب مظہر کی حیثیت رکھتی ہے اور تاوقتیکہ ہمار شعور اُس پر غالب نہ آئے، ہم کسی نئی روایت اور اسلوبِ زندگی کے قیام میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ سر سید کے مخالفین اپنی تاریخ کے زندانی تھے، اسی لیے اپنے عہد کی ضرورتوں کے مطابق وہ کسی نئی روایت کی تشکیل نہیں کر سکے۔ اس کے برعکس سر سید اپنی تاریخ کے جبر سے آزاد ایک ایسا ذہن رکھتے تھے جو انقلابِ زمانہ کے ہاتھوں مرتب ہوتی ہوئی ایک نئی تاریخ کی مجبوریوں اور اُس کے مطالبات کو بھی سمجھ سکے۔ حالؔی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ان کی شخصیت روایتی خطوط پر مرتب ہونے کے باوجود اپنے معاشرے کی عام معذوریوں کا شکار نہیں ہو سکی۔ اپنی ذہنی قیادت اور احساسات کی رہنمائی کے لیے انہوں نے سر سید اور غالب کا انتخاب کیا جو تاریخ کا ایک متحرک، جاذب اور بیدار شعور نیز دور بینی کی صلاحیت سے مالا مال ذہن رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے روحانی مسئلوں سے بھی آگاہ تھے۔
حالؔی اور ان کے وہ تمام معاصرین جو سر سید کے حلقۂ اثر میں شامل ہوئے، مثلاً نذیر احمد، آزاد، شبلی، محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی اور ذکاء اللہ، ذہنی مراتب اور سطحوں کے فرق کے باوجود، سر سید کے قومی نصب العین اور مقاصد کے خلوص میں یکساں یقین رکھتے تھے۔ مغرب تک حالی کی رسائی کا اصل وسیلہ بھی سر سید کی شخصیت تھی۔ انگریزی سے اپنے اثر قبول کرنے کا قصہ خود حالی نے اس طرح بیان کیا ہے کہ

> اگرچہ مغربی شاعری کا کوئی عمدہ نمونہ اس وقت اردو زبان میں موجود نہ تھا، نہ اب تک موجود ہے۔ لیکن وہ جو مشہور ہے کہ "دیوانہ را ہوے بس است" جدت پسند طبیعتوں پر جس قدر مغربی انشا پردازی کی لے اب تک کھلی تھی وہی اُنکو لے اڑی۔ بہت سے موزوں طبع اور بعضے کہنہ مشق بھی جن پر

قدیم شاعری کا رنگ چڑھ چکا تھا۔اس مشاعرے میں
(کرنل ہالرائیڈ کے مشاعرے، ۱۸۷۴ء سے) شریک
ہونے لگے۔ اگرچہ یہ صحبت مدّت تک جمی رہی، لیکن راقم
صرف چار جلسوں میں شریک ہونے پایا تھا کہ بہ سبب
ناموافقت آب وہوا لاہور سے تبدیل ہوکر دلّی چلا آیا۔ مجھ
کو مغربی شاعری سے نہ اُس وقت کچھ آگاہی تھی اور نہ اب
ہے۔ نیز میرے نزدیک مغربی شاعری کا پورا پورا تتبع ایک
ایسی نامکمل زبان میں جیسی اردو ہے، ہو بھی نہیں سکتا۔ البتہ
کچھ تو میری طبیعت مبالغہ اور اغراق سے بالطبع نفور تھی اور
کچھ اس نئے چرچے نے اس نفرت کو زیادہ مستحکم کر دیا۔
اس بات کے سوا میرے کلام میں کوئی ایسی چیز نہیں جس
سے انگریزی شاعری کے تتبع کا دعویٰ کیا جا سکے، یا اپنے
قدیم طریقے کے ترک کرنے کا الزام عائد ہو۔

(دیباچہ مجموعۂ نظم حالی)

وحید قریشی کا خیال ہے کہ حالی چونکہ خود انگریزی نہیں جانتے تھے اس لیے 'وقتاً فوقتاً' دوسروں سے انگریزی کتابوں کے ترجمے کرا کے یا صرف مفہوم سن کر اپنے تنقیدی نظام میں فٹ کر لیتے تھے۔ اس لیے حالؔی نے انگریزی کے جو اقتباسات لیے، ان کے سیاق وسباق کا خیال نہیں رکھا اور بعض مقامات پر انگریزی مصنف نے کچھ اور کہا تھا، حالؔی نے کچھ اور سمجھ لیا۔" علاوہ بریں، "انگریزی کے اعلیٰ درجے کی کتابوں کے ساتھ ساتھ گھٹیا درجے کی کتابوں سے مواد اصل کر کے حالی نے نہ صرف انگریزی تنقید کو اُس کے صحیح تناظر میں نہیں دیکھا بلکہ اپنے تنقیدی نظام میں بھی انہوں نے بعض جگہ بے ڈھنگا پن پیدا کر لیا ہے جس

کا اظہار مقدمے کے پہلے ثلث میں بہت زیادہ ہے۔" (وحید قریشی) مقدمۂ شعرو شاعری کی فکری اور نظریاتی اساس میں جو خامیاں اور کمزوریاں نظر آتی ہیں، ان کا بنیادی سبب یہی ہے کہ حالؔی اپنی روایتی قدروں اور معاشرتی نظام میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت کا احساس رکھنے کے باوجود مغربی معیاروں کی حقیقت سے تقریباً ناواقف اور مغربی فکر کے اندرونی تضادات کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ مقدمہ لکھنے سے تقریباً دس برس پہلے کے اپنے ایک خط میں حالؔی نے اپنے اصل مقصد کی نشاندہی اس طرح کی ہے کہ

> میں ایک لمبا چوڑا مضمون مسلمانوں کی شاعری پر لکھتا ہوں جس میں زمانۂ جاہلیت سے لے کر آج تک اردو شاعری کی حقیقت لکھی جائے گی۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ اردو شاعری جو نہایت خراب اور مضر ہوگئی ہے اسکی اصلاح کے طریقے بیان کیے جائیں۔ اور یہ ظاہر کیا جائے کہ شاعری اگر عمدہ اصول پر مبنی ہو تو کس قدر قوم اور فن کو فائدہ پہنچا سکتی ہے۔
>
> (بحوالہ وحید قریشی، مقدمۂ شعرو شاعری ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۷ء، ص ۲۷)

حالؔی کی پیروئ مغربی کا مسئلہ جس نے ان کے ایک شعر
(حالؔی اب آؤ پیروئ مغربی کریں)

کی بنیاد پر ایک غیر ضروری بلکہ لایعنی بحث (مابین سید احتشام حسین اور سید اختر علی تلہری) کی شکل اختیار کر لی تھی، اُلجھا اسی لیے کہ حالی کو جدید تہذیبی نشاۃ ثانیہ کے مضمرات پر غور کرنے کی مہلت بہت کم ملی۔ مغربی فکر سے شناسائی کے وسائل حالؔی کے پاس بہت محدود تھے۔ اس فکر کا جو بھی عنصر حالی کی گرفت میں آسکا، اپنے عہد کے مجموعی ماحول، بدلتی ہوئی

زندگی کے مزاج اور بعض اشخاص کے واسطے سے۔ سرسید، غالب اور انجمن پنجاب سے وابستگی نے ایک راستہ ان کے لیے بنایا۔ اسی سے گزر کر حالی مغربی اسالیب زندگی اور نئی فکر تک پہنچے۔ حالی کی طبیعت میں قومی ہمدردی کا احساس اور مسلمانوں کی اجتماعی ترقی کا شعور بے پایاں تھا۔

دیوان حالی کے اندرونی سرورق (اشاعت نامی پریس، کان پور ۱۸۹۳ء) کی پیشانی پر حالی نے سُرخی جمائی تھی (دُرمعٔ الذہرکیف ما دَار) یعنی کہ "جس رُخ زمانہ پھرے اوسی رُخ پھر جاؤ" میں چھپا ہوا اُن کا خلوص اور قومی مقاصد سے وابستگی کا جذبہ بے شک بہت قابلِ قدر ہے لیکن اس سے تاریخ کے جبر اور ایک طرح کی نفسیاتی عجلت پسندی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں مسدس مدوجزر اسلام کے پہلے دیباچے (۱۲۹۶ھ) سے حالی کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں

> زمانے کا نیا ٹھاٹھ دیکھ کر پرانی شاعری سے دل سیر ہو گیا تھا اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے شرم آنے لگی تھی۔ نہ یاروں کے ابھاروں سے دل بڑھتا تھا، نہ ساتھیوں کی ریس سے کچھ جوش آتا تھا۔ مگر یہ ایک ناسور کا منہ بند کرنا تھا جو کسی نہ کسی راہ سے تراوش کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے بخاراتِ درونی جن کے رُکنے سے دم گھٹا جاتا تھا، دل و دماغ میں تلاطم کر رہے تھے اور کوئی رخنہ ڈھونڈتے تھے۔ قوم کے ایک سچے خیر خواہ نے (جو اپنی قوم کے سوا تمام ملک میں اسی نام سے پکارا جاتا ہے اور جس طرح خود اپنے پُر زور ہاتھ اور قومی بازو سے بھائیوں کی خدمت کر رہا ہے، اسی طرح ہر اپاہج اور نکمے کو اسی کام میں لگانا چاہتا ہے) اگر

> ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوان ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا، بڑے شرم کی بات ہے۔
>
> (مسدس حالؔی، ناز پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص ۳-۴)

اُس زمانے کے زیادہ تر سماجی مصلحین اپنے ماضی سے شرمندہ اور حال سے خوف زدہ تھے۔ ماضی اور حال کے اس جنجال سے نکلنے کی طلب اُن میں مشترک تھی۔ چنانچہ اس زمانے کی تمام معروف اصلاحی انجمنوں کی توجہ کا واحد مرکز ایک نئے مستقبل کی تعمیر تھی۔ آریہ سماج، برہمو سماج، پرارتھنا سماج، رام کرشن مشن، علی گڑھ تحریک۔ سب کا غالب میلان اسی نصب العین کی حصولیابی پر مرکوز تھا۔ سرسید نے اپنے لیے جو دستور العمل ترتیب دیا، حالی نے اسی کو اپنے ایمان کا جزو بنالیا۔ آزادانہ فکر کے معاملے میں کچھ سرسید سے انتہا کو پہنچی ہوئی عقیدت کی وجہ سے، کچھ اپنی افتادِ طبع کے باعث، حالؔی اپنے معاصرین میں محمد حسین آزاد، نذیر احمد اور شبلی، سب سے پیچھے رہے۔ اپنی تقلیدی روش پر حالی قانع بھی تھے اور مطمئن بھی۔ اسی لیے حالی کی ادبی فکر میں سرسید کے معاشرتی مقاصد کی بازگشت اس عہد کے تمام لکھنے والوں سے زیادہ نمایاں ہے۔ طبّاعی، جدت طرازی اور انفرادیت کے عنصر پر اصرار کے جن اوصاف سے غالب کا وجود مزیّن تھا، غالب سے ارادت اور محبت کے باوجود حالی ان سے تقریباً محروم رہے۔ ان کی غزلیہ شاعری میں روایتی محاسن کی موجودگی کا سبب حالی کے ابتدائی ماحول کا اثر اور ان کی لسانی عادات تھیں۔ سرسید سے قربت اور انجمن پنجاب سے وابستگی نے حالؔی کے شعور میں جو تبدیلیاں پیدا کیں، ان کا اظہار حالی کی ان چار نظموں میں صاف دیکھا جاسکتا ہے جو انجمن پنجاب کے مناظموں میں پڑھی گئیں (برکھا رت ۱۸۷۴، نشاط امید، حب وطن ۱۸۷۴، مناظرۂ رحم و انصاف ۱۸۷۶)۔ شاعری کے لحاظ سے یہ نظمیں معمولی ہی کہی جائیں گی۔ خود حالؔی نے اپنی ''روایتی'' غزلوں میں، مرثیۂ غالب میں اور

مسدس کے بعض حصّوں میں ان سے بدرجہا بہتر شعری کمال اور استعداد کا ثبوت دیا ہے۔ جیسی خوش مذاقی اور فنّی چابک دستی یا تاثیر کلام کے پہلو حالی کی اصلاح کے دور سے پہلے کی غزلوں میں، مسدس میں اور مرثیۂ غالب میں ملتی ہیں اور اُن سے جیسی ہُنر مند تخلیقی شخصیت ابھرتی ہے اس کا سراغ حالؔی کی اصلاحی شاعری میں دور دور نہیں ملتا۔ اپنے آپ سے متصادم رہنے اور اپنے حقیقی میلانِ طبع سے بچتے رہنے کی بھی کوئی حد تو ہوتی ہے۔ حالؔی کی اہمیت اور معنویت اس واقعے میں پیوست ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے اور اپنی قوم کی خاطر اپنے اصل مزاج کو دبانے اور ایک نیا، نامانوس رنگ اختیار کرنے سے بھی گریز نہیں کیا، لیکن ان کا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنی داخلی آویزش کے حصار سے نکل نہیں سکے۔ یہ ایک نیک نفس، دردمند، مخلص اور بے لوث انسان کا المیہ تھا جس کا شکار حالی کے بہت سے معاصرین ہوئے۔ ایک طرف اپنی تاریخ کا جبر تھا، دوسری طرف نئے حالات کا۔ اندر سے اپنے آپ کو بدلنا کسی نئے اور اجنبی اسلوب زیست کو قبول کر لینے سے کہیں زیادہ مشکل اور پیچیدہ کام ہے۔ اس کوشش میں حالی (اور آزادؔ) کبھی کامیاب ہوتے ہیں، کبھی ناکام رہ جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں فراق صاحب نے بہت معقول بات کہی تھی کہ ''حالؔی ایک حسّاس عقلیت کا پیغمبر ہے اور اُس میں عقلیت کا تمام زور اور عقلیت کی کمزوریاں موجود ہیں۔ حالؔی پر کلیم الدین احمد کی تنقید اپنے مقدمات سے زیادہ اپنے لہجے کے پھوہڑ پن اور اپنی جارحیت کی وجہ سے بری لگتی ہے۔ عسکری نے مقدمۂ شعر و شاعری کی بابت فراق صاحب اور کلیم الدین احمد کے موقف پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''آج اس کتاب کو قبول کرنے کی ضرورت ہے نہ رد کرنے کی۔ اب تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یہ کتاب ایک خاص زمانے میں کس غرض سے لکھی گئی تھی''۔ اسی کے ساتھ ساتھ عسکری کا یہ خیال بھی بہت اہم اور توجہ طلب ہے کہ اس کتاب نے ہماری گزشتہ ادبی اور ذہنی تاریخ میں ایک خاص حیثیت حاصل کر لی ہے اور اس تاریخ کو سمجھنا ضروری ہے۔

اصل میں تاریخ کے ساتھ بدلتی ہوئی اجتماعی حقیقتوں کا رشتہ ایک عجیب و غریب نوعیت کا حامل ہوتا ہے، کبھی لاگ کا کبھی لگاؤ کا۔ برطانوی تسلط کے قیام اور استحکام کے ساتھ جس تہذیبی نشاۃ ثانیہ کا خاکہ رونما ہوا، وہ بڑی حد تک ہمارے لیے ایک اجنبی منظر کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کا ظہور تاریخ کی ایک ایسی واردات کے پس منظر میں ہوا تھا جو اپنی ایک خاص سیاسی جہت بھی رکھتی تھی۔ ہمارے زمانے کے سیاست داں اپنے مفادات اور مقاصد کی حصولیابی کے لیے تاریخ کو کتر بیونت کے ذریعے ایک من مانی شکل دینا چاہتے ہیں۔ لیکن تاریخی صداقت میں ایک طرح کی اندرونی توانائی بھی ہوتی ہے جو اس طرح کی ہر کوشش کے مقابلے میں اپنا دفاع کرنا چاہتی ہے۔ جدید تہذیبی نشاۃ ثانیہ کے بعض مفسّروں نے بھی اپنی تعبیرات کو ایک سیاسی رنگ دینے کی کوشش کی اور یہ ثابت کرنا چاہا کہ انگریزوں کے واسطے سے افکار و اقدار کے جو اسالیب ہم تک پہنچے، ہمارے لیے نئے نہیں تھے اور قدیم ہندوستان کی تاریخ میں ایسے کئی عناصر روپوش تھے جنہیں اب نئی بیداری کا نام دیا جاتا ہے۔ شعور کو ڈی کولونائز (decolonize) کرنے کی ضرورت پر احیاء پسند جماعتیں (اور افراد) کبھی کبھی اس لیے بھی زور دیتے ہیں کہ ان کے نزدیک ہماری اجتماعی بیداری کی تمام حقیقتوں پر کولونیل مقاصد کی ترویج کرنے والوں نے مصلحت کے پردے ڈال دیے تھے۔ یہ صورت حال تشویش کا باعث ہے کہ آزاد کی آب حیات اور حالی کے مقدمے کا جائزہ لیتے وقت بھی کچھ لوگ اس طرح کی خام خیالی کے شکار ہوئے ہیں۔ حالی کا شعور اس قسم کے لوگوں سے کہیں زیادہ دیانت دارانہ تھا کہ انہوں نے اپنے احساسات کی تبدیلی کا کوئی موہوم جواب مہیا کرنے سے دامن بچایا۔ اسی لیے جدید تہذیبی نشاۃ ثانیہ کے سیاق میں حالی کی نثر و نظم کا تجزیہ کیا جائے تو قدم قدم پر حالی کی مجبوریوں کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن اتنا طے ہے کہ حالی نے بساط بھر ایک معروضی سطح پر اس نشاۃ ثانیہ کی حقیقت کو سمجھنے اور اس کے تقاضوں کے مطابق خود کو تیار کرنے کی کوشش کی۔ اس عمل میں وہ شروع سے اخیر تک

دیانت دارر ہے۔ کبھی کبھی تو اس حد تک کہ ایک اجتماعی فریضے کی ادائیگی کے لیے انہیں ادبی اقدار کو سماجی اقدار کی خاطر پس پشت ڈالنا پڑا۔ حالی نے ماضی کی روایات اور اپنی تہذیبی و ادبی اقدار سے بے اطمینانی کا جو اظہار کیا ہے، اُس کی تہہ میں بھی ان کی دردمندی کارفرما ہے۔ عہد وسطیٰ کی غروب ہوتی ہوئی تہذیب کے ساتھ مشرق و مغرب کا جو تصادم سامنے آیا، اس کے انجام سے سرسید اور حالیؔ، دونوں اچھی طرح آگاہ تھے۔ انہیں خوب اندازہ تھا کہ عہد وسطیٰ کا ہندوستانی سماج ایک ٹوٹتی اور بکھرتی ہوئی تہذیبی قدر کو بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں چلا رہا ہے۔ ایسی صورت میں ماضی کی ادبی اور تہذیبی روایتوں کو ڈھال بنانے یا ادب کے پرانے تصورات کا مورچہ جمانے کا مقصد ہے جدید تہذیبی نشاۃ ثانیہ سے ایک ہاری ہوئی جنگ کا محاذ پھر سے کھولنا اور نئی روشنی کے فیوض سے ہمیشہ کے لیے خود کو محروم کر لینا۔ تاریخ کے جبر اور نئی حقیقتوں کی یورش کے سامنے اس طرح کی کسی بھی جذباتی مدافعت کا حشر جو بھی ہونا تھا اسے سمجھنے کے لیے ۱۸۵۷ء کے بعد کا غم آلود قصہ سامنے تھا۔ ایک بات جو ایسی صورت میں ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے، یہ ہے کہ ادب تاریخ کے بوجھ کو اٹھانے کی طاقت میں کسی قدر اضافے کا سبب تو بن سکتا ہے لیکن ادب میں تاریخ کا رُخ موڑ دینے کی طاقت بہر حال نہیں ہوتی تاوقتیکہ اسے سیاست کی مدد نہ مل جائے۔ اسی وجہ سے حالیؔ نے زبان و ادب کو ایک ہمہ گیر اصلاحی جدوجہد کا حصّہ بنایا اور اپنے ادبی معاشرے کو شیشے کے گھر سے باہر لانے کی جستجو میں مصروف رہے۔ مقصد اس سرگرمی کا یہی تھا کہ زمانے کے آشوب کا سامنا کیا جا سکے اور زوال کی لذت سے آشنا ایک روایت اپنے آپ کو نئی ذمے داریاں نبھانے کے قابل بنا سکے۔ بہ قول عُرفی

زمنجنیقِ فلک سنگ فتنہ می بارد
من ابلہانہ گریزم بہ آبگینہ حصار

غالبؔ کے خطوط

مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم

جدید اردو نثر کا گنج گراں مایہ، اردادب کا سدابہار سرمایہ، عہد غالبؔ کی ادبی تہذیبی اور تاریخی دستاویز، ذہین غالبؔ کا بے مثال عکس ریز جس میں عود "ہندی" اردوئے معلی، خطوطِ غالب، مکاتیب غالب اور نادرات غالب کے علاوہ مرزا غالب کے اب تک دریافت شدہ، ۸۷۰ خطوط شامل ہیں جو اس عہد آفریں عظیم شاعر کی شاعری کا مکمل اشاریہ قرار دیے جاسکتے ہیں۔

جدید اصول تدوین کی روشنی میں خطوط غالب کے صحیح متن کے ماخذات کی نشان دہی، اختلاف نسخ، زمانۂ تحریر کا تعین، ضروری اور مفید حواشی کے ساتھ، غالب انسٹی ٹیوٹ کی فخریہ پیشکش ۲۲۰ صفحات پر مشتمل مبسوط مقدمہ۔

اردو کے معروف وممتاز محقق ڈاکٹر خلیق انجم کے مرتبہ اس مکمل مجموعے کو چار جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔

چار جلدوں کی قیمت ۴۳۵ روپے

وہاب اشرفی

حالی کا تنقیدی شعور: چند امور

الطاف حسین حالی کے شعری تصورات پر گفتگو کرنے سے پہلے کچھ ایسے نقادوں کے نام از خود ذہن میں آجاتے ہیں جنہوں نے ان کے فہم و ادراک پر سوالیہ نشان لگائے ہیں۔ اگر کہیں تعریف کا پہلو آیا ہے تو وہ بہت ضمنی طور پر اور بہت سارے تحفظات کے ساتھ، حالی پر منفی تنقیدات کے باوجود یہی کہا کہا جا سکتا ہے کہ اپنی حدوں میں وہ اتنے با کمال ثابت ہوئے ہیں کہ ان کی تعبیرات کے بغیر شعریات کا ایک لقمہ بھی توڑنا مشکل ہے، یہیں ٹھہر کر دو تین آرا پر ایک نگاہ ڈال لینی چاہئے جو فوری طور پر ذہن میں آرہی ہیں، میری مراد کلیم الدین احمد، احسن فاروقی اور وحید قریشی سے ہے۔ کلیم الدین احمد کا مشہور جملہ ہے

"خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم و ادراک معمولی غور و فکر نا کافی، تمیز ادنیٰ، دماغ و شخصیت اوسط، یہ تھی حالی کی کل کائنات"

احسن فاروقی کا انداز دیکھیے

" ایسی باتیں تو پڑھ کر یہ کہنے کا دل چاہتا ہے کے ایسا

شخص کسی طرح شاعری پر تنقید کرنے کا اہل نہیں ہو سکتا "
وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ " کم علم کس قدر خطرناک ہو سکتا ہے
اندازہ لگایا جا سکتا ہے "

وحید قریشی کا بھی انداز دیکھیے

ادبی مسائل میں جہاں کہیں بھی دو بزرگوں میں اختلاف
کا موقع آیا حالی اپنی اعتدال کا ترازو لے کر آ گئے، حالی کی
دوکانداری کا یہ انداز ان کی صلح جوئی کا ترجمان اور ان کی
شخصیت پرستی کا آئینہ ہے "

ایسا محسوس ہوتا ہے کے یہ سارے خیالات رواروی میں پیش کیے گئے ہیں اور حالی پر لکھتے وقت ایک طرح کا منفی تیور اپنانا ہی مدعا رہا ہے، تحلیل و تجزیہ سے عاری یہ تنقیدی جملے حالی کا المیہ ثابت نہیں کرتے بلکہ ان کے ناقدین کے اکھرے اور متعصبانہ ذہن کے عکاس ہیں۔ سب سے پہلے حالی کی بوطیقا سمجھنے کے لیے ایک ایسے شائستہ ذہن کی ضرورت ہے جو حالی کے زمانے کو بھی دیکھ رہا ہوں اور اپنے زمانے کو بھی اور اس درمیان اس کی نگاہ شعریات کے مسلسل بدلتے ہوئے تیور پہ ہو۔ آج کا باشعور نقاد جب کلیم الدین احمد کی بحث جو لفظ و معنی سے متعلق ہے، پڑھتا ہے تو اسے ہنسی آتی ہے اور وہ بہت اطمینان سے یہ کہہ سکتا ہے کہ بے چارے کلیم الدین احمد کو چومسکی کی خبر نہ تھی، وہ سوسیور سے واقف نہ تھے، حد تو یہ ہے کہ وہ تاراپور والا سے بھی آگاہی نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے لفظ و معنی کی بحث ان کے یہاں بے جان ہے۔ حالانکہ یہ بات کہنا گہرائی اور گیرائی سے خالی ہوگی۔ مہذب اور شائستہ ذہن ان امور کا ابطال کرتا ہے اور ہر چیز کو سیاق و سباق میں دیکھنا اس کا رویہ ہوتا ہے۔

سب سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ حالی کے یہاں ہر معاملے میں

شائستگی کا پہلو مقدم رہا ہے۔ ان کے یہاں افراط و تفریط نہیں ہے۔ لہٰذا ان کی بوطیقا میں (اگر ان کی کوئی بوطیقا ہو سکتی ہے) توازن کی بڑی اہمیت ہے اور یہ توازن یوں پیدا ہوتا ہے کہ وہ تمام انسانی عوامل کو اخلاقی رویے کے پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ اور فلسفے سے ان کی گہری واقفیت ان کے اپنے اخلاقی رویے پر حاوی نہیں ہوتی اور وہ ایک ایسے شعور کے علمبردار بن جاتے ہیں جس کی ضرورت انسانی زندگی میں ہمیشہ رہتی ہے۔

اس بات پہ بڑا زور دیا گیا ہے کہ حالی جس طرح تخیل کی بحث کرتے ہیں، وہ اپنی تمام تر کمزوریوں کا گویا بھید کھولتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کی واقفیت کولرج سے نہیں تھی اور ان کا علم لارڈ میکالے تک محدود تھا۔ لیکن حالی نے تخیل کی جس طرح بحث کی ہے وہ اپنے دائرے میں اہم ہے۔ ٹھیک ہے کہ وہ Imagination کے خانے نہیں رکھتے اور ان کی باریکیوں پر نگاہ نہیں ڈالتے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ آج ان اصطلاحوں پر جس طرح بحث ہوری ہے یا ہو سکتی ہے وہ کلیم الدین احمد کے زمانے کی تنقید کے بہت آگے ہے۔ اس لیے کہ تخیل، جن امور سے عبارت ہے ان کی تفصیل تو کولرج کے یہاں بھی نہیں ملتی۔ نئے علوم نے اس تصور کا دائرہ بہت وسیع کر دیا ہے اور جیسے جیسے بحث آگے بڑھتی جاتی ہے حالی کے ابتدائی تصورات کا استحکام باقی رہتا ہے۔

حالی نے جہاں اخلاقی پہلوؤں پر زور دیا ہے وہاں زندگی سے ان کی وابستگی کا اتنی ہی شدت سے اظہار کیا ہے۔ اس سے ایک نتیجہ یہ اخذ کیا گیا کہ حالی تو ادب و شعر کو زندگی سے اس طرح جوڑتے ہیں جیسے ادب ادب نہ ہو، صحافت ہو لیکن صحافت کے اکھرے پن سے حالی کے نقطۂ نظر کا کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے کہ حالی اچھے اور برے شعر کی نہ صرف تمیز کر سکتے تھے بلکہ یہ جانتے تھے کے زندگی کا دخل عمل شعر و ادب میں کس حد تک نافع ہے اور کہاں نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ ان کے خیالات کی ایک جھلک دیکھیے

"صدر اسلام کی شاعری میں جب تک غلامانہ تملق اور

خوشامد نے اس میں راہ نہیں پائی تمام سچے جوش اور ولولے
موجود تھے۔ جو لوگ مدح کے مستحق ہوتے تھے ان کی مدح
اور جو ذم کے مستحق ہوتے تھے ان کی مذمت کی جاتی تھی
احباب کی صحبتیں جو انقلاب روزگار سے برہم ہو جاتی
تھیں، ان پر دردناک اشعار لکھے جاتے تھے۔ پارسا بیویاں
شوہروں کے اور شوہر بیویوں کے فراق میں درد انگیز
شعر انشا کرتے تھے۔ چراگاہوں، چشموں اور وادیوں کی
گذشتہ صحبتوں اور جمگھٹوں کی ہو بہو تصویر کھینچتے تھے۔ اپنی
اونٹنیوں کی جفاکشی اور تیز رفتار گھوڑوں کی رفاقت اور
وفاداری کا بیان کرتے تھے عالم سفر کے مقامات اور
مواضع شہر اور قریے، ندیاں اور چشمے سب نام بہ نام جو بری
یا بھلی کیفیتیں وہاں پیش آئی تھیں ان کو موثر طریقے پر
ادا کرتے تھے اس طرح تمام نیچرل جذبات جو ایک
جوشیلے شاعر کے دل میں پیدا ہو سکتے ہیں، سب ان کے
کلام میں پائے جاتے تھے"۔

اس اقتباس سے اتنا اندازہ تو لگایا ہی جا سکتا ہے کہ وہ شاعری کو حقائق کا ایک آئینہ سمجھتے ہیں اور یہ بحث بہت دور تک جاتی ہے۔ ہم بلا جھجک ارسطو تک پہنچ سکتے ہیں اور اس کی بوطیقا کا عکس بھی تلاش کر سکتے ہیں لیکن کیا ایسا نہیں ہے کہ حالی واردات کو تجربے کی سطح پر دیکھنے کے حامی نظر آتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے یہاں پر خیال تجربے کی سی اہمیت نہ رکھتا ہو لیکن جس طرح انہوں نے موضوعات گنوائے ہیں ان سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک موقع کی شاعری کو دوسرے موقع کی شاعری سے ہم آمیز نہیں کرتے بلکہ واقعات و حالات کے دائرے میں شعری تخلیق کا جواز پیش کرتے ہیں۔ ایسا جواز جو پیروڈی کی سی

کیفیت نہ رکھتا ہو بلکہ موقع کے عین مطابق ہو۔ جہاں وہ صدر اسلام کی شاعری کی طرف راغب ہوئے ہیں وہاں نہ صرف انہیں شعری تنوع کا احساس ہوا ہے بلکہ سچے جوش اور ولولے کا بھی۔ جدید شعری رویے میں جوش اور ولولے کو contain کرنے کی تلقین کی جاتی ہے لیکن یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ ان عناصر کے بغیر شعری آہنگ ہمیشہ بے نمک معلوم ہوتا ہے۔ جہاں حالی ہو بہو تصویر کھینچنے کی بات کرتے ہیں وہاں creativity سے انحراف کا سبق نہیں دیتے بلکہ فطری انداز اختیار کرنے کی طرف راغب کرتے ہیں اور یہ انداز ہر زمانے میں پسند کیا جاسکتا ہے۔ جدید ترین تنقید بتاتی ہے کہ الفاظ اور خیال سے جو بھی شاعری تخلیق ہوگی اس میں اتنے gaps ہوں گے کے نئی تفہیم کی صورت پیدا ہوتی رہے گی، بہر طور حالی نے جن نکات پر شاعری کی بوطیقا تشکیل کی وہ مغرب کا چربہ نہیں ہے۔ ہاں مغرب سے انہیں روشنی ملتی رہی ہے چاہے روشنی جتنی بھی مدھم رہی ہو، لیکن انسانیت، اخلاق اور سماجی احوال جو ان کے ذہن کی بنیادی لکیریں ہیں کہیں بھی متاثر نہیں ہوتیں، لہٰذا مغرب کی بھرپور علمی کیف وکم سے ان کی حاشیائی واقفیت پر طنز زن ہونا اپنی ہی تجزیاتی صلاحیت کو مشکوک بنانا ہے۔

حالی بڑی وضاحت سے کہتے ہیں کہ شاعری کا ملکہ بیکار نہیں ہے، اسکی تاثیر مسلّم ہے، سیاسی معاملات میں بھی اس سے مدد لی جاسکتی ہے۔ شاعری اور سیاست کا کیا تعلق ہے یا ہوسکتا ہے۔ بحث طلب امر ہے لیکن حالی کے نقطۂ نظر کی تفہیم کے لئے موصوف کے ان تصورات کی طرف توجہ کرنی چاہیئے جو شعر کی عظمت کے باب میں ہیں، وہ لکھتے ہیں

> "وہ (شاعری) ہم کو محسوسات کے دائرہ سے نکال کر گذشتہ اور آئندہ حالتوں کو ہماری موجودہ حالت پر غالب کردیتا ہے۔ شعر کا اثر محض عقل کے ذریعہ نہیں بلکہ زیادہ تر ذہن اور ادراک کے ذریعہ اخلاق پر ہوتا ہے، بس ہر قوم

اپنے ذہن کی جودت اور ادراک کی بلندی کے موافق شعر
سے اخلاق فاضل اکتساب کر سکتی ہے"

حالی نے شاعری کے حوالے سے سادگی، اہلیت اور جوش کی باتیں کی ہیں، ان کی وضاحت بہت سے مخالف رویے کا باعث بنی ہے، لیکن ان کی حقیقی معنویت کا احساس کرنا ہے تو وارث علوی کا طویل مضمون 'حالی، مقدمہ اور ہم' کی طرف رجوع کیجئے موصوف کا یہ عالمانہ مضمون اب کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ حالی کے بارے میں وارث کا مطالعہ تجزیاتی، تحلیلی اور عملی ہے جس میں حالی کے تمام تر تصورات کمر بستہ بن گئے ہیں۔ انہوں نے حالی کے بارے جارحانے بیانات کو علمی انداز میں دیکھنے کی کوشش کی ہے اور وہ تناظر پیش کیا ہے جس سے حالی کا چہرہ مسخ نہیں ہوتا بلکہ پوری تابانی سے سامنے آتا ہے، یہاں اقتباسات درج کر کے اپنے اس مضمون کو بوجھل نہیں بنانا چاہتا لیکن یہ کہتا چلوں کے پورا مضمون نہ صرف قابل مطالعہ ہے بلکہ تفہیم حالی کے لئے وقیع ترین سرمایہ ہے، وارث نے حالی کے ان تصورات کو بھی ابھارنے کی کوشش کی ہے جو اصناف کے باب میں 'مقدمہ' کی زینت ہیں جن کے تفصیل میں جانا طوالت سے خالی نہیں ہے اور باریک تجزیہ کا متقاضی ہے جسکا یہاں موقع نہیں۔ جن پر دوسرے نقاد نکتہ چینی کرتے رہے ہیں۔ بہرطور اپنے تجزیے کے آخری مرحلے میں دوسری باتوں کے علاوہ وہ رقم طراز ہیں

"حالی کے مقدمہ پر اس طول طویل مقدمہ بازی کے لئے
معذرت خواہ ہوں، لیکن کیا کیا جائے لے دے کر ہماری
تنقید ہی حالی کا مقدمہ ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے
ہمارے قد کو ناپا جائے، میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ حالی کے
سامنے ہم سب بونے نظر آتے ہیں لیکن اتنا ضرور کہوں
گا کہ حالی کے آئینے میں ہم جب اپنا عکس دیکھتے ہیں تو کافی

ٹوٹے پھوٹے لوگ دکھائی دیتے ہیں حالی انسان کو اس
کی حیوانی، انسانی اور روحانی تینوں سطحوں پر قبول کرتے
تھے۔انسان کو انھوں نے ٹکڑے ٹکڑے نہیں دیکھا اس لیے
ادب کو بھی انھوں نے ٹکڑے ٹکڑے نہیں دیکھا، حالی کی
باتیں ایک مربوط اور سالم ذہن کی باتیں تھیں"۔

چلئے حالی کے تصور شعر کا نیا رخ سامنے آیا ہے تو ان کی مکمل تفہیم کے نئے دروازے بھی وا ہو گے۔ اور آج اس امر پر زور دیا جا رہا ہے کہ ادب کو اپنی جڑوں سے وابستہ رہنا ہے، اپنی تہذیب اور ثقافت کا اسے امین بننا ہے اور اپنی وراثتوں کا اسے تحفظ کرنا ہے تو پھر حالی کی تنقید تو جدید ترین شعریات کے لئے بیج کا کام سرانجام دے رہی ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے زمانے کے لئے بھی اتنے ہی اہم ہیں۔

مثنویاتِ غالبؔ

ترتیب و ترجمہ

ڈاکٹر ظ۔ انصاری

غالب کا فارسی کلام جو ضخامت میں اردو دیوان سے تقریباً پانچ گنا ہے۔ مکمل ترجمے کی صورت میں ہنوز سامنے نہیں آیا۔ صاحبِ طرز ادیب اور غالب شناس ظ۔ انصاری کی اس کتاب میں وہ گیارہ مثنویاں اور ان کا اردو ترجمہ شامل ہے۔ جن مثنویوں کو خود مرزا غالبؔ نے اپنے فارسی دیوان میں غزلوں سے پہلے جگہ دی تھی۔ ان میں کل اٹھارہ سو پینتالیس اشعار ہیں جو تعداد میں دیوانِ غالب کے اردو اشعار سے کم نہیں۔

شاندار گٹ اپ، خوب صورت طباعت۔

صفحات ۲۸۴

قیمت ۶۰ روپے

ابوالکلام قاسمی

غزل کی تنقید اور الطاف حسین حالی

الطاف حسین حالی کو اردو کی نظری تنقید کی تاریخ میں بھی بنیاد گزار کی حیثیت حاصل ہے اور عملی یا اخلاقی تنقید کی تاریخ میں بھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے برخلاف اردو میں مربوط نظریاتی مباحث اور تجزیاتی طریق کار کے استعمال کا آغاز کم و بیش ایک ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ مقدمہ شعر و شاعری کے نصف اول میں حالی نے تنقید کی مشرقی روایت اور بعض مغربی تصورات کی آمیزش سے، اپنی بعض حد بندیوں کے باوجود، جس منطقی اور معروضی انداز میں اردو شعریات کی ضابطہ بندی کی کوشش کی اس کی دوسری مثال ایک صدی گزرنے کے بعد بھی مشکل سے ہی تلاش کی جاسکتی ہے۔ پھر یہ کہ انہوں نے مقدمہ کے نصف آخر میں شعری اصناف کے عملی جائزے اور حیات سعدی اور یادگار غالب میں اخلاقی تنقید کے جو نمونے چھوڑے، ان کو عملی تنقید کے نمائندہ ترین حوالوں کی حیثیت حاصل ہے۔ اختلاف رائے کی گنجائش کے باوجود حالی کے تصور شعر کو مثالی اہمیت کا حامل قرار دیا جاسکتا ہے، جب کہ اردو کی اطلاقی تنقید نے گذشتہ برسوں میں بعض ایسے مراحل طے کیے ہیں جن کو یقیناً حالی کی عملی تنقید سے آگے کی منزلوں

کا نام دیا جانا چاہیے۔

مقدمہ شعر و شاعری کے اطلاقی حصے میں غزل، قصیدہ اور مثنوی جیسی اصناف کی معنویت اور ان اصناف میں موجود شعری سرمایے کے جائزے میں حالی کے مرتب کردہ نظریۂ شعر اور تنقیدی اصولوں کی خوبیاں اور خامیاں چھن کر سامنے آگئی ہیں۔ غزل کی صنف کے حوالے سے یہ جائزہ بالخصوص قابل توجہ ہے کہ اس تحریر میں اردو غزل سے متعلق مباحث کو شعریات کی صورت میں ڈھالنے کی پہلی مربوط کوشش ملتی ہے۔ اس ضمن میں غزل کے دائرۂ کار، ہیئتی اور معنوی حد بندی اور اظہار کے مختلف اسالیب کی شناخت کے ساتھ اردو غزل کے متقدمین اور متاخرین شعراء کے مابین مابہ الامتیاز عناصر کو پہلی بار نشان زد کیا گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعد کے زمانے میں دہلی اور لکھنؤ اسکول کی تفریق، داخلیت اور خارجیت کے تصور، صنعتوں کے استعمال کی نوعیت کے بارے میں بیش تر مباحث، الطاف حسین حالی کے قائم کردہ سوالات کی بازگشت ہیں۔ غزل کے موضوع پر امداد امام اثر، شبلی نعمانی، مولوی عبدالسلام، حسرت موہانی اور عندلیب شادانی کے خیالات میں حالی کے ان تصورات کی گونج آسانی سے محسوس کی جاسکتی ہے۔ تاہم غزل پر وارد ہونے والے اعتراضات کا تجزیہ کرنے سے پہلے یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ حالی کے تصورات کے باعث غزل کے بارے میں منفی سوچ کا سلسلہ کیوں کر شروع ہوا؟۔

اس بات میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ عربی قصائد کی تشبیب سے لے کر فارسی غزل کے ایرانی اور ہندوستانی اسالیب اور اردو غزل کی روایت اور روح کو اپنے معاصرین اور بعد کے تنقید نگاروں کے مقابلے میں حالی نے کم گہرائی کے ساتھ نہیں سمجھا اور جذب نہیں کیا تھا۔ لیکن اردو غزل کا ماضی قریب ان کے لیے اس طرح غیر اطمینان بخش تھا جس طرح محمد حسین آزاد کے لیے، آخری زمانے کی پوری اردو شاعری نارسائیوں کا شکار تھی۔ اردو شعریات کو مرتب کرنے اور اردو شاعری کی روایت کا عرفان رکھنے کے باوجود ان کے اس

رویے کی مضمرات بڑی حد تک نوآبادیاتی مرعوبیت میں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ یہ تہذیبی غلبے کی وہی دہشت تھی جس کے زیر اثر محمد حسین آزاد کو نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات، سے معنون لکچر میں اردو کے شعری سرمایے پر خط تنسیخ کھینچنے اور اپنے زمانے کے حاکموں سے نئی شاعری اور جدید نظم کی کلید حاصل کرنے کی تلقین کرنے کی طرف مائل ہونا پڑا تھا۔ لیکن آزاد اور حالی کے مابین نمایاں فرق تھا۔ محمد حسین آزاد نظریہ ساز اور مرتب شعریات نہیں تھے، جب کہ الطاف حسین حالی اردو شعریات کی شیرازہ بندی بھی کر رہے تھے اور تنقیدی تصورات کی معیار بندی بھی۔ شاید اسی سبب سے آزاد کے اس نوع کے بیانات میں استدلال کی کوشش نہیں ملتی جب کہ حالی اپنی ہر بات کو دلائل اور اسباب وعلل سے مبرہن کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ اس صورت حال میں جب حالی یہ کہتے ہیں کہ ''غزل کی حالت فی زمانہ نہایت ابتر ہے، وہ محض بے سود اور دور از کار صنف معلوم ہوتی ہے'' یا یہ کہ ''غزل کی اصلاح عام اصناف سخن میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے'' یا یہ کہ ''زمانہ بہ آواز بلند کہہ رہا ہے کہ یا عمارت کی ترمیم ہوگی یا عمارت خود نہ رہے گی'' تو ہم بجا طور پر یہ توقع کرتے ہیں کہ حالی کی نگاہ اپنے مشوروں اور اعتراضات کے عواقب پر بھی ہوگی۔ چنانچہ چند سطریں بھی نہیں گزرتیں کہ ہم حالی کو یہ کہتے سنتے ہیں کہ ''لیکن غزل کی اصلاح جس قدر ضروری ہے اسی قدر دشوار بھی۔ غزل میں جو عام دل فریبی ہے، اصلاح کے بعد اس کا قائم رہنا نہایت مشکل ہے''۔ تاہم حالی اس دشوار کام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور بعض ایسی اصلاحات تجویز کرتے ہیں جن کے نتیجے میں ایک بار پھر (ان کے خیال میں) غزل کی جامعیت اور ارتکاز کی صفت لوٹ کر واپس آسکتی ہے۔ یوں تو حالی، غزل کی جامعیت کو معشوق کی اطلاقی حالت اور مجازی وحقیقی محبت، دونوں کے امکانات کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن غزل کے بارے میں ان کے منفی ردِ عمل کا سبب وہ سرمایہ ہے جو ان کے الفاظ میں ''دور آخر کی غزل گوئی'' سے عبارت ہے۔ غزل کی فارسی روایت میں

دنیا کی بے ثباتی اور روحانیت کو نقطۂ عروج تک پہنچائے جانے کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں

> ''اردو میں یہ رنگ تو عام طور پر، ایک آدھ کے سوا کسی کی غزل میں کبھی پیدا نہیں ہوا، لیکن عاشقانہ خیالات کو نیچرل اور سادہ طور پر ادا کرنے والے اردو غزل گویوں کے ہر طبقے میں کم وبیش ہوتے رہے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اب یہ رنگ بھی روز بہ روز مٹتا جاتا ہے۔ الفاظ میں صنعت اور خیالات میں رکاکت وسخافت یوماً فیوماً بڑھتی جاتی ہے۔''

سردست یہ بحث تو خارج از بیان ہے کہ اس ردِ عمل میں حالی نے، میر درد اور ان کے قبیل کے شاعروں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ حالی کے نزدیک اعتراض کا محور کیا ہے؟۔ انہیں الفاظ میں استعمال ہونے والی صنعتوں پر بھی اعتراض ہے اور خیالات میں روا رکھی جانے والی رکاکت وسخاوت پر بھی۔ یہاں صنائع لفظی پر حالی کے اعتراضات اس وقت ایک عجیب مرحلے میں داخل ہو جاتے ہیں جب وہ غزل کے ڈکشن کی جامعیت پر اصرار کرتے ہیں اور استعارہ اور تمثیل جیسے لفظی طریق کار کو بہ نظرِ استحسان دیکھتے ہیں۔ اِس کی تاویل سوائے اس کے اور کچھ نہیں کی جا سکتی کہ عربی اور فارسی کی شعریات میں چونکہ استعارے کو صنعتوں میں شامل نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کو، ایک معنی کو کئی طریقے سے بیان کرنے کا انداز بتایا گیا ہے، اسی وجہ سے اس کی درجہ بندی علم بیان کے ساتھ کی گئی ہے، اس لیے حالی نے استعارہ اور شعری صنعت گری میں تفریق روا رکھی ہے۔ لیکن بعد کے زمانے میں استعارہ اور تمثیل کو ہم لسانی طریق کار میں شمار کرنے کے باعث شعری صناعی کا ایسا جزو لاینفک تصور کرنے لگے ہیں جس کو رائج کرنے میں مغرب کی نو مرتب کردہ شعریات نے اہم رول ادا کیا ہے۔ جہاں تک غزل کے وسیلے سے بعض لکھنوی شعرا کے خیالات میں

راہ پانے والی رکاکت کا سوال ہے تو اس پہلو پر حالی کا اعتراض ان کے اخلاقی تصورِ شعر کے تناظر میں عین متوقع معلوم ہوتا ہے۔ یہ وہی تصورِ شعر ہے جس کی تشکیل کے وقت وہ عربی شعریات کے مرتب قُدامہ ابن جعفر کے تصورات سے بیش از بیش استفادے کے باوجود ان کے اس بیان کو کہ "احسن الشعرا کذبہ" (بہترین شعر وہ ہوتا ہے جس میں جھوٹ ہو) یکسر زیرِ بحث نہیں لاتے۔ لیکن حالی کے اس رویے کو اگر ان کے اخلاقی نقطۂ نظر کا حصہ مان لیں تو ہم ان کی نظریاتی مجبوری کا اندازہ ضرور لگا سکتے ہیں۔ الطاف حسین حالی نے غزل کے بارے میں لفظی و معنوی سطح پر جو اعتراضات کیے ہیں ان کا ہدف واضح طور پر متاخرین شعرا کی معاملہ بندی، اور محبت کے خارجی مظاہر اور تفصیلات ہیں۔ وہ لکھنوی شعرائے غزل کی زبان کو تصنع اور تکلف سے پُر اور فطری سلاست و روانی اور لطافت سے دور قرار دیتے ہوئے نظریہ سازی کے عمل سے گزرتے ہیں اور غزل کی شاعری کے اِس زوال کے اسباب و علل تلاش کرنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں

> جب دلی بگڑ چکی اور لکھنؤ سے زمانہ موافق ہوا اور دہلی کے اکثر شریف خاندان اور ایک آدھ کے سوا تمام نامور شعرا، لکھنؤ میں جا رہے، اور دولت و ثروت کے ساتھ علوم قدیمہ نے بھی ایک خاص حد تک ترقی کی، اس وقت نیچرل طور پر اہلِ لکھنؤ کو ضرور خیال پیدا ہوا ہوگا کہ جس طرح منطق و فلسفہ وغیرہ میں ہم کو فوقیت حاصل ہے، اس طرح زبان اور لب و لہجے میں بھی ہم دلی سے فائق ہیں۔ چونکہ منطق و فلسفہ و طب و علم کلام وغیرہ کی ممارست زیادہ تھی، خود بخود طبیعتیں اس بات کی مقتضی ہوئیں کہ بول چال میں ہندی الفاظ رفتہ رفتہ ترک اور ان کی جگہ عربی الفاظ کثرت سے

> داخل ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ سیدھی سادی اردو امرا اور
> اہل علم کی سوسائٹی میں متروک ہی نہیں ہوگئی بلکہ جیسا کہ
> ثقات سے سنا گیا ہے، معیوب اور بازاروں کی گفتگو سمجھی
> جانے لگی، اور یہی رنگ رفتہ رفتہ نظم ونثر پر غالب آ گیا۔ نظم
> میں جرأت اور ناسخ کے دیوان کا اور نثر میں باغ و بہار اور
> فسانۂ عجائب کا مقابلہ کرنے سے اس کا کافی ثبوت ملتا ہے۔

حالی کے اس بیان میں بنیادی ارتکاز مصنوعی لسانی طریق کار کو اپنانے اور مقامی روزمرہ کے رنگ کو چھوڑ کر محض مرعوب کرنے کی خاطر عربی الفاظ کے استعمال پر ہے، جس کا، ان کے نزدیک، غزل کے لغوی معنی ومفہوم اور صنعتی روایت سے کوئی علاقہ نہیں۔ وہ اپنے اس ردِ عمل کو اپنے تصور شعر میں شامل سادگی اور اصلیت کے بنیادی عناصر سے مربوط کر لیتے ہیں۔ جس کا سبق انہوں نے ملٹن کے ایک بیان سے سیکھا تھا، اور ملٹن کا یہ مشروط بیان حالی کے یہاں آ کر مطلق شاعری کے لازمی عناصر میں شامل کر لیا گیا۔ نظریاتی اخذ واستفادہ نے الطاف حسین حالی کو جس طرح خود متقدمین کے ہاتھوں غزل کے مضامین میں پیدا ہونے والی وسعت سے صرف نظر کرنے پر مجبور کیا، وہ وسیع معنوں میں ان کے مشرقی تصور شعر سے ہم آہنگ نہ تھا۔ شمس قیس رازی نے، جن کو فارسی غزل کی شعریات کا پہلا مرتب قرار دیا جاسکتا ہے، اور جس کے حوالے حالی کی نظریہ سازی میں تلاش کیے جاسکتے ہیں، غزل کے شعر کے لیے فنون عاشقی کے بیان کو ترجیحی اہمیت دی ہے اور اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے 'المعجم' میں وصف زلف وخال، حکایت وصل وہجر، ذکر گل وگلزار و باغ و بہار، بیانِ ابروباد و باراں اور وصف شہر وکوے یار یا مقام دلدار جیسے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ اس پس منظر میں داخلی وخارجی موضوعات کی کوئی تحدید باقی نہیں رہتی اور اصلیت کا دائرہ خاصا وسیع ہو جاتا ہے۔ اب ذرا اس ضمن میں حالی کا بیان ملاحظہ کیجیے

> اگرچہ اصل وضع کے لحاظ سے غزل کا موضوع عشق و محبت کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہے لیکن ہمارے شعرا نے اس کو ہر مضمون کے لیے عام کر دیا ہے اور اب اس صنف سخن کو محض مجازاً غزل کہا جاتا ہے۔

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالی غزل کے موضوعات و مضامین کے تنوع کا اعتراف کرتے ہیں اور اس تنوع کو غزل کی اصل وضع اور روایت کے منافی بھی تصور کرتے ہیں۔ تو جب ان کو یہ اقرار ہے کہ یہ صنف اب ہر مضمون کے لیے وسیلۂ اظہار بن چکی ہے تو محض متاخرین شعرا کی معاملہ بندی اور دوسرے خارجی تجربات یا مظاہرِ کائنات کا حوالہ معتوب کیوں قرار دیا جائے؟۔ اس سلسلے میں مزید خلط مبحث کی صورت وہاں پیدا ہوتی ہے جب الطاف حسین حالی سادگی اور اصلیت کی شرائط پر اصرار کرنے کے باوجود دہلوی شعرا کے غیر سادہ اشعار کا جواز، تاویل کی شکل میں تلاش کرتے ہیں

> غزل میں ضروری ہے کہ بہ نسبت اور اصناف کے سادگی اور صفائی کا زیادہ خیال رکھا جائے۔ اردو میں ولی سے لے کر انشاء اور مصحفی تک عموماً سب کی غزل میں صفائی، سادگی، روز مرہ کی پابندی، بیان میں گھلاوٹ اور زبان میں لچک پائی جاتی ہے۔ ان کے بعد دتی میں ممنون، غالب، مومن اور شیفتہ وغیرہ کے ہاں فارسی ترکیبوں نے بلاشک زیادہ دخل پایا ہے، مگر یہ لوگ بھی اعلیٰ درجے کا شعر اس کو سمجھتے تھے جس میں پاکیزہ اور بلند خیال ٹھیٹ اردو محاورے میں ادا ہو جاتا تھا۔

غالب، مومن اور شیفتہ کی غزل میں ولی، انشاء اور مصحفی کے برخلاف جس نوع کا لسانی

طریق کار ملتا ہے ان کو غالب کے اسلوب کی دبازت، مومن کی منطقیت اور شیفتہ کی علمیت یا فارسیت کے حوالے لے الگ الگ شناخت کے عمل سے گزارنے کی ضرورت ہے اور ان سب کا اسلوب ولی اور انشاء کی سادگی اور صفائی سے مختلف ہے۔ مگر حالی حقائق کے تضاد کو تاویلوں سے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے یہاں ان کے بیانات میں تاویلات کا تناسب بڑھ جاتا ہے، یہ بات ان کی دوسری تحریروں میں نہیں ملتی۔

اصلیت کی شرط بھی حالی کے لیے سادگی سے کم اہمیت کی حامل نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ "ہم کو چاہئے کہ اپنی غزل کو خود اپنے خیالات اور اپنے جذبات کا آرگن بنائیں" یہ اصلیت کا وہ تصور ہے جو شاعری سے شاعر کی آپ بیتی ہونے کا تقاضہ کرتا ہے۔ یہاں اس بحث کو جدید مغربی تنقید کا زائیدہ سمجھا جائے کہ "شاعری ذات کے اظہار کا نام ہے یا ذات سے فرار کا" جب بھی مشرقی شعریات میں زبان بالخصوص استعاراتی زبان کے وسیلے سے ایک نئی کائنات کی تخلیق اور زبان کے استعمال کو تجربے کا متبادل قرار دینے کا تصور خاصا پرانا ہے۔ عبدالقاہر جرجانی نے استعارہ کے اس عمل کو تجربے کا بیان محض ماننے کے بجائے خود زبان و بیان کو تجربے کا متبادل بتایا ہے۔ مگر حالی غزل میں اصلیت کے مطالعے کو شاعر کی ذات تک محدود کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

> چونکہ شاعری کا جزو اعظم یہ ہے کہ اس میں جو خیال باندھا جائے اس کی بنیاد اصلیت پر ہونی چاہیے اس لیے اصول شاعری کے موافق شراب و کباب کے مضمون باندھنا صرف ان لوگوں کا حق ہونا چاہیے جو یا خود اس میدان کے مرد ہوں یا اپنے اصل خیالات خمریات کے پیرایے میں بطور مجاز و استعارہ کے ادا کر سکتے ہوں۔

حالی نے غزل پر اظہار خیال کرتے ہوئے مجاز و استعارہ کو ہی نہیں تمثیل کو بھی پسندیدہ

قرار دیا ہے مگر جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ان کے نزدیک حقیقی معنوں میں استعمال ہونے والے غزل کے مزاج سے مخصوص الفاظ کو ہی استعارہ کی حیثیت سے بھی استعمال کرنے کو اہمیت حاصل ہے۔ وہ غزل کی مخصوص زبان پر ان الفاظ میں اصرار کرتے ہیں۔

> جن بزرگوں نے غزل کی بنیاد تصوف اور اخلاق پر رکھی ہے، ان کو بھی وہی زبان اختیار کرنی پڑی ہے جو غزل میں عموماً برتی جاتی ہے۔ عشقیہ مضامین میں جو الفاظ حقیقی معنوں پر اطلاق کیے جاتے تھے ان ہی الفاظ کو ان بزرگوں نے مجاز و استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے، اور رمزو کنایہ و تمثیل میں اپنے اعلیٰ خیالات ظاہر کیے ہیں۔

جہاں تک غزل کی مخصوص زبان اور اس کے مزاج کا سوال ہے تو الطاف حسین حالی، تغزل کا لفظ تو استعمال نہیں کرتے مگر غزل کے مزاج کو تغزل کے مترادف کے طور پر ہی استعمال کرتے ہیں۔ غزل کی زبان اور اسلوب بیان کی شناخت پر حالی کا اصرار تغزل کی اصطلاح کی مقبولیت اور اسے lyricism کا مترادف سمجھنے کی بنیاد معلوم ہوتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا خیال ہے کہ تغزل کی اصطلاح lyricism کے متبادل کے طور پر اردو میں بیسویں صدی میں داخل ہوئی ہے، اس سے قبل قدیم اردو شعریات میں اس تصور کا سراغ نہیں ملتا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں

> کلاسیکی شعرا کے سامنے تغزل اور غزلیت جیسے تصورات نہ تھے۔ ان تصورات کا ہمارے اصل نظریہ شعر سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ جھوٹے الفاظ ہیں جو انگریزی کے دباؤ میں آکر ہم لوگوں نے بیسویں صدی میں وضع کیے۔ اپنی شاعری کو انگریزی نکتہ چینوں سے بچانے کے لیے ہم لوگوں نے یہ

ترکیب سوچی کہ غزل کو انگریزی lyric کا مرادف قرار دیا،
اور اگر انگریزی lyric میں lyricism ہے تو اردو غزل میں
لامحالہ تغزل یا غزلیت بھی ہوگی۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے بیان میں اس حد تک صداقت تو ضرور ہے کہ تغزل کے لفظ کا استعمال بیسویں صدی سے قبل نہیں ملتا، مگر اس کا مطلب یہ نہیں یہ تصور بھی پہلے سے موجود نہیں تھا۔ غزل کا وہ روایتی مزاج جس کو بنانے میں غزل کے پرانے سکّہ بند موضوعات اور لفظیات شامل ہیں ان کا ذکر اردو تذکروں میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ یہ تصور غزل کے ساتھ ابتدا سے ہی وابستہ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس شاعر کی غزل میں قصیدہ یا مرثیہ کے اسلوب کی جھلک ملتی تھی اس کو غزل کے مزاج سے الگ قرار دیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر سودا اور قائم کے ہم عصر احمد علی یکتا نے قائم کی غزل پر رائے دی تھی کہ 'دوسرے شاعروں کے برخلاف جن کی غزل، قصیدہ ہو جاتی ہے اور قصیدہ، غزل، قائم کی غزل، غزل ہی رہتی ہے اور قصیدہ، قصیدہ رہتا ہے' شاید اس جملے میں سودا کی غزل کی قصیدہ نما بلند آہنگی پر طنز بھی ہے مگر زیادہ اہم بات یہ ہے کہ قائم یا سودا پر تبصرے کے ساتھ غزل کی غزلیت یا تغزل جیسی کسی صفت کا اعتراف اور غزل کے مزاج کا تعین بھی شامل ہے۔ غزل کے روایتی مزاج کے بارے میں اسی نوع کے تصورات کی بنیاد پر نیر مسعود نے تغزل کی اصطلاح سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

ابتدا سے ہمارے شاعروں نے تغزل سے انحراف
کرنا شروع کر دیا تھا اور اسی انحراف کی وجہ سے غزل اردو
کی بہت وسیع النظر اور سب سے جاندار صنف سخن بن گئی۔

متاخرین شعراء کی غزل پر اعتراض کرتے ہوئے الطاف حسین حالی نے بھی تغزل کی اصطلاح استعمال نہ کرنے کے باوجود سادگی، اصلیت، جامعیت، مخصوص لفظیات

اور متعین موضوعات یا اسلوب اظہار پر جو زور دیا ہے وہ دراصل غزلیت یا تغزل کے تصور پر اصرار کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اتفاق سے غزل پر حالی کے اعتراضات اور اصلاحی مشورے ان کے تصور شعر میں اس حد تک پیوست ہو گئے ہیں کہ اس سادگی اور اصلیت جیسی شرطیں بھی مغربی تصور نظم کا حصہ ہونے کے باوجود یہاں غزلیت کی اصطلاح سے پوری طرح ہم آہنگ بھی دکھائی دیتی ہیں۔ مگر یہاں حالی، ضمنی طور پر غزل کی جامعیت کو اپنے بین السطور میں تسلیم کرنے کے باوجود اُس لسانی طریق کار کے مخالف دکھائی دیتے ہیں جس کی وجہ سے غزل اپنے مخصوص اسلوب پر قائم رہنے کے باوجود ہر طرح کے مضامین کی سمائی کے نمونے پیش کر سکتی ہے۔ حالی کے اعتراضات کیوں کر بعد کے زمانے میں غزل کی صنف کی تجدید کا پیش خیمہ بن گئے، اس کا اندازہ بعض نقادوں کے ان خیالات سے لگایا جا سکتا ہے، جو حالی کے تصورات کی گونج کی شکل میں قدرے بعد کے زمانے میں راہ پا گئے تھے۔ امداد امام اثر، کاشف الحقائق میں غزل پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

> اس صنف کا تقاضہ یہ ہے کہ امور داخلی کے سوا امور خارجی قلم بند نہ ہوں اور اگر ہوں بھی تو داخلی پہلو کی آمیزش سے خالی نہ ہوں۔ اس لیے یہ صنف شاعری دشوار رنگ رکھتی ہے۔ ذرا سی لغزش سے غزلیت کا رنگ جاتا رہتا ہے۔

عندلیب شادانی کا خیال ہے کہ

> حالی نے اپنے وقت کی رائج اور مقبول عام غزل گوئی سے جن خصوصیات کی بنا پر اظہار برہمی کیا تھا، وہ اب بھی موجود ہیں اور معاصر شعرا کے دیوان لایعنی، بے بنیاد اور محض رسمی اشعار سے بھرے پڑے ہیں"۔

امداد امام اثر اور عندلیب شادانی ہی پر کیا موقوف مولوی عبدالسلام، حسرت موہانی اور مسعود

حسن رضوی ادیب بھی حالی کے اس نوع کے تصورات سے دامن نہ بچا سکے جنھوں نے ''ہماری شاعری'' میں لکھنوی غزل گوئی کی مدافعت کی مدلل کوشش کی ہے۔ حالی نے جس طرح رعایت لفظی اور دوسرے محاسن شعری پر قدغن لگانے کی کوشش کی تھی اس کا ہدف بسا اوقات وہ خود بن جاتے ہیں۔ ان کا اخلاقی تصور شعر مسدس حالی کی توثیق تو کرتا ہے مگر خود ان کی غزل گوئی کی تائید نہیں کرتا، اور اشعار کی تشریح و تعبیر کرتے ہوئے جب وہ غالب کی شاعری کے تجزیے میں نکتہ آفرینی کرتے ہیں تو محاسن لفظی و معنوی کی نشاندہی کیے بغیر غالب کی غزل کی عظمت اور انفرادیت کی نشاندہی نہیں کر پاتے۔ مرزا غالب کی غزل میں تلازمات کا استعمال، حسن تعلیل کی بہتات، لف و نشر کا انداز اور لفظی و معنوی رعایات کا ایسا نگارخانہ ملتا ہے جو اپنے آپ حالی کی اُس ضابطہ بندی کے منافی معلوم ہوتا ہے جس میں وہ علی الاطلاق شعری صنائع کے مخالف دکھائی دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

> صنائع و بدائع پر کلام کی بنیاد رکھنے سے اکثر معنی کا رشتہ ہاتھ سے جاتا رہتا ہے، اور کلام میں بالکل اثر باقی نہیں رہتا۔ صنائع کی پابندی اور التزام سے تمام اصناف سخن میں عموماً اور غزل میں خصوصاً بچنا چاہیے۔ متاخرین میں صنائع کا خیال زیادہ تر اس سبب سے پیدا ہوتا ہے کہ قدما کے کلام میں کچھ اشعار ایسے پائے جاتے ہیں جن میں باوجود حسن معنی کے اتفاق سے کوئی لفظی مناسبت پیدا ہو گئی ہے۔
> ہمارے لٹریچر میں صنائع لفظی کی لے بڑھتے بڑھتے آخر کار محض الفاظ پرستی باقی رہ گئی، اور معنی کا خیال بالکل جاتا رہا صنائع و بدائع کی پابندی دلی کے شعرا میں عموماً بہت کم پائی جاتی ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بالکل نہیں پائی

جاتی، البتہ لکھنؤ کے بعض شعرا نے اس کا سخت پابندی کے
ساتھ التزام کیا ہے اور بمقابلہ اہل دہلی کے لکھنؤ کے عام
شعرا بھی رعایت لفظی کا زیادہ خیال کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں انہوں نے ناسخ کی غزل کو بار بار حوالہ بنایا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ کے ایک آدھ شعر میں رعایت اور صنعت کی کارکردگی کو بھی دیکھا جائے۔ ناسخ کے یہ دو شعر نمونے کے طور پر دیکھیے تو بات زیادہ واضح ہو سکتی ہے۔

کوئی غارت گر نہیں دیوانے کے اسباب کا
خانۂ زنجیر کو کچھ غم نہیں سیلاب کا

تو نے آنکھیں پھیر لیں، یاں کام آخر ہو گیا
طائر جاں پائے بندِ رشتۂ نظارہ تھا

پہلے شعر میں دیوانہ، زنجیر اور خانۂ زنجیر اور سیلاب، اسباب، خانہ اور غارت گر جیسے الفاظ لفظی مناسبت اور معنوی رعایت کے سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ناسخ نے 'خانہ' کے لفظ کو ایک طرف خانۂ زنجیر کی مناسبت میں اور دوسری طرف گھر کے معنی میں سیلاب کی غارت گری سے جوڑ دیا ہے۔ اس طریق کار میں صنعت کاری کے ساتھ جنون یا بربادی کے حوالے سے داخلی تجربہ بھی ہم آہنگ ہو گیا ہے۔ جب کہ دوسرے شعر میں محبوب کے تغافل کو اپنی روح کے فنا ہونے کا سبب بتاتے ہوئے شاعر نے طائر جاں کو پائے بند رشتۂ نظارہ کہا ہے اور اس طرح حسّی اور جذباتی تجربے کی تمثیل سامنے آ گئی ہے۔ ان نمونوں کی مدد سے اگر ہم صرف اس حقیقت کا عرفان حاصل کر لیں تو یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ مغلیہ حکومت کے دورِ زوال میں ہمارے بیش تر غزل گو شاعر اپنی شاعری میں صنعت گری، پختہ کاری، توازن اور نزاکت بیان کا تاج محل تیار کرنے میں مصروف تھے اور اس طرح سماجی

اور سیاسی اضمحلال فن کاری اور ہنر مندی کا نقطۂ عروج بن گیا تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ خود حالی فنی رفعت و بلندی کے اس نکتے سے باخبر نہیں تھے مگر جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ چونکہ نوآبادیاتی فکر کا لازمی عنصر اپنے ماضی قریب پر خط تنسیخ کھینچنے اور ماضی بعید کی عظمت کی نوحہ خوانی کرنے سے عبارت تھا، اس لیے محمد حسین آزاد ہی کی طرح الطاف حسین حالی بھی اپنے آپ کو استعماریت کے ایجنڈا سے پوری طرح محفوظ نہیں رکھ پائے۔ اس رویے کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ وہ ماضی قریب کی غزل کی صنعت گری کو ہدف بنانے کے باوجود جگہ جگہ غزل کی ہزار شیوگی اور طرفگی کا اعتراف بھی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور اسی باعث حقیقت حال کے اعتراف اور منصوبہ بند اعتراضات اور اصلاحی مشوروں میں تضاد کی صورت حال نمایاں ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حالی اپنے اعتراضات کے برخلاف اس خیال کا اظہار نہ کرتے

> اگرچہ اس میں شک نہیں کہ جس طرح شعر میں جدت پیدا کرنی اور نئے اور اچھوتے مضامین پر طبع آزمائی کرنی شاعری کا کمال ہے، اسی طرح ایک مضمون کو مختلف پیرایوں اور متعدد اسلوبوں میں بیان کرنا بھی کمال شاعری میں داخل ہے۔

شعر میں جدت پیدا کرنے کا عمل، حالی کی تنقید کے زیر اثر یقیناً اضمحلال کا شکار رہا اور بیسویں صدی کے اوائل میں اردو غزل کے احیاء کے دوران پرانے اسالیب کے اپنانے کا غلبہ تو ضرور رہا مگر قدرے بعد میں فراق گورکھپوری اور یگانہ چنگیزی نے بعض نئے تجربے کو نئے طرز احساس میں ڈھال کر پیش کرنے کی کوشش بھی کی۔ اس کے نتیجے میں بیسویں صدی کے نصف آخر کے زمانے میں نئی غزل کے عملی اور اجتہادی نمونوں کی بہتات سامنے آئی اور اس باعث غزل کی زبان، اسلوب بیان اور طرز احساس کے سلسلے میں نئے

سرے سے غور وخوض کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس زمانے میں غزل کے اسالیب میں جو تنوع پیدا ہوا، اسے تنقیدی طور پر شعری اظہار کے نئے مباحث اور مغربی تنقید میں رائج ہونے والی صناعی، پیکر تراشی، پیراڈوکس، تناؤ، طنزیہ تہہ داری وغیرہ سے سہارا بھی ملا اور بدلی ہوئی شعریات میں اس نوع کی جدید غزل بہت سے نئے مباحث کا پیش خیمہ بن گئی۔ ان مباحث میں زبان کے استعمال کی نوعیت غزل کی صنف کے لیے اس باعث زیادہ اہمیت اختیار کر گئی کہ جس رویے کو حالی نے لفظ پرستی کہا تھا وہ شعری تنقید کا نیا حوالہ بن کر سامنے آیا۔ اس سلسلے میں بحث وتمحیص کا صرف اندازہ لگانے کی خاطر ظفر اقبال کے تازہ مضمون کے یہ چند جملے آج کے بدلے ہوئے شعری تناظر کی تفہیم میں معاون ہو سکتے ہیں۔

> شاعری کے طلسم زار میں داخل ہونے کا دروازہ صرف اور صرف لفظ ہے۔۔۔شعر میں لفظ کا غیر معمولی غیر متوقع یا غیر حقیقی استعمال معنوی لحاظ سے اس کی کایا پلٹ سکتا ہے۔ لفظ کا کوئی بھی استعمال شاعر کو شعر میں بے معنویت کے خطرے سے دوچار نہیں کرتا، بلکہ لفظ کا کوئی بھی عجیب استعمال معانی کے لیے در کھولنے کا باعث ہو سکتا ہے۔

ظفر اقبال کی یہ رائے غزل کے اسی ڈکشن کو نشان زد کرتی ہے جس کو حالی الفاظ پرستی قرار دیتے ہیں، اس لیے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غزل کے الفاظ کے آزادانہ استعمال کو زیر بحث لا کر نئے مباحث کا جو دروازہ کھولا گیا، وہ منفی ہونے کے باوجود آج معاصر غزل میں پائے جانے والے تنوع کا بنیادی وسیلہ اور نقش اول بن گیا ہے۔ یہی حالی کی کشمکش بھی ہے اور یہی ان کی افادیت بھی۔

نقد قاطع برہان

(مع ضمائم)

پروفیسر نذیر احمد

مرزا غالب کی مشہور تصنیف، قاطع برہان، ایک زمانے تک اہل علم کے درمیان موضوع بحث رہی ہے۔ اس کتاب سے لغت نگاری کے سلسلے میں کئی اہم مباحث سامنے آئے ہیں۔

فارسی اور اردو کے معروف و ممتاز محقق پروفیسر نذیر احمد نے غالب کی اس کتاب کے بعض مندرجات کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔

غالب شناسی کے سلسلے کی ایک اہم اور فکر انگیز کڑی۔

صفحات ۴۲۲

قیمت ۶۰ روپے

سیّد محمد عقیل

مشرقی حالؔی پر مغرب کا نوآبادیاتی (COLONIAL) دباؤ

ذرا تصور کیجیے اُس قیامت خیز زندگی کا جس میں چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہو۔ نہ حکومت نہ سلطنت، نہ کوئی نظم و ضبط۔ ایک بھرے پُرے شہر کی اینٹ سے اینٹ بج چکی ہو۔ ہر طرف سنّاٹا، انتشار اور قہرمانی کا راج۔ سارے انسان، مخلوق، رعیّت، جو چاہے کہہ لیجیے سب خانماں برباد، شرافت، عزّت، سماجی رکھ رکھاؤ، علم و ادب اور تہذیبی زندگی سب کے پرخچے اُڑے ہوئے۔ کوئی تیر گھاٹ کوئی میر گھاٹ۔ ایسے میں ایک استقامت اور ٹھہراؤ کی صورت، اُن لوگوں کے ہاتھوں میں نظر آئے جو خود اِس تباہی کا موجب رہے ہوں، تو ان کے احکامات اور اشاروں سے کون سرتابی کرسکتا ہے۔ انہیں تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ پھر، ان کے طور طریقے، علم و دانش، روایت اور درایت سبھی میں ایک چمک دَمک کا احساس تو ہوگا ہی۔ یہی کچھ حالؔی کی ادبی اور تہذیبی سوچ کے ساتھ ہوا کہ انہیں بھی انگریز ''ایک شایستہ قوم مغرب کی'' نظر آنے لگے۔ اور اُن کے سامنے، اپنے اکھڑتے ہوئے خیمے، بکھرتی ہوئی زندگی، منجمد اور ٹھہرا ہوا ادب، سب از کار رفتہ اور مغرب کی تہذیب اور ادب، سب کچھ اپنے

سے بُرتر معلوم ہوئے اور پھر پورا مشرق نہ سہی تو کم از کم اُردو شعروادب "سنڈاس اور عفونت کا ناپاک دفتر" محسوس ہونے لگا۔ چنانچہ، کلونیل داوَ پیچ کے ساتھ آئی ہوئی ہوا میں جب حالی نے اپنا مقدمہ شعروشاعری، پیش کیا تو مشرقی ادب اور تہذیب کے متعلق ان کے خیالات یوں مرتب ہوئے

"(۱) ناٹک ہمارے ملک میں بھانڈ اور نقالوں کو بہت ذلیل سمجھا جاتا ہے لیکن یورپ میں سُوانگ اور نقالی نے اِصلاح پاکر، قوموں کو بے انتہا اخلاقی اور تمدنی فائدے پہنچائے ہیں۔"

(۲) "باجا باجے ہمارے یہاں ہمیشہ لہو و لعب کے مجمعوں میں مستعمل ہوتے ہیں (یورپ میں بھی یہ ہوتا ہے مگر حالی کو شاید یہ معلوم نہ تھا) جن کو یہاں کے عُقلاء، فضول جانتے ہیں۔ شائستہ قوموں (یعنی یوروپین قومیں) نے، ان کے مناسب استعمال سے نہایت گراں بہا فائدے اٹھائے۔" (مقدمہ)

(۳) شعرا نے اپنی جادو بیانی سے دلوں پر فتح نمایاں حاصل کی شاعر کی ہر چیز، یہاں تک کہ اس کے عیب بھی، خلقت کی نظر میں مستحسن معلوم ہونے لگتے ہیں۔ بائرن کی نسبت مشہور ہے کہ لوگ اس کی تصویر نہایت شوق سے خریدتے تھے بلکہ چاہتے تھے کہ خود بھی ویسے ہی دکھائی دینے لگیں۔ ہونٹ اور پیشانی پر ویسی ہی شکن ڈال لیں۔" (مقدمہ)

(۴) ''یورپ میں پوئٹری کو قوم کی ترغیب و تحریص
کا ایک زبردست آلہ سمجھتے رہے ہیں لارڈ بائرن کی نظم
'چائیلڈ ہیرلڈ پلگریمج'، فرانس، انگلستان اور روس کو ٹرکوں
سے آزاد کرانے کی ترغیب دِلاتی ہے۔''

پھر حالی ان باتوں سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں

''الغرض، یورپ میں لوگوں نے شعر سے بڑے بڑے کام
لیے ہیں۔ ایشیا کی شاعری میں اگرچہ ایسی مثالیں مشکل
سے مل سکیں گی۔'' (مقدمہ)

حالؔی کی چند مشکلیں اور بھی تھیں، جیسا کہ انہوں نے اپنے سوانح حیات میں لکھا ہے کہ حالؔی کے والد، انگریزی سرکار کے نمک کے محکمے میں ملازم تھے۔ ''۱۸۵۶ء میں مجھے حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی اسامی صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی۔ مگر غدر ہوا تو ملازمت جاتی رہی نواب شیفتہؔ کی وفات کے بعد پنجاب بُک ڈپو میں ایک اسامی مجھ کو مل گئی جس میں مجھے یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوتے تھے اُن کی عبارت درست کرنے کو مجھے ملتی تھی (کہ اردو کی عبارت درست ہے یا نہیں۔ ترجمہ درست ہے یا نہیں یہ ان کا کام نہ تھا کیونکہ حالؔی انگریزی قطعی نہیں جانتے تھے) تقریباً چار برس یہ کام میں نے لاہور میں رہ کر کیا۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی۔ نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ، مشرقی لٹریچر اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل میں کم ہونے لگی۔''

مشرقی ادب اور تعلیم سے نفرت کا ایک سبب حالی کا اور بھی تھا جسے حالؔی اشاروں میں یوں بتاتے ہیں

''دلی پہنچ کر جس مدرسے میں مجھے شب و روز رہنا پڑا وہاں

> سب مدرس اور طلباء کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو جاہل سمجھتے تھے۔ ڈیڑھ برس دلی میں رہنا ہوا، اس عرصے میں کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں اور نہ کبھی ان لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو اُس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے۔
> انگریزی تعلیم کا خاص کر پانی پت میں اوّل تو کہیں ذکر سننے میں نہ آتا۔ اس کی نسبت عام لوگوں کا خیال تھا کہ سرکاری نوکری کا ذریعہ ہے۔"[۱۲]

دوسری طرف سرسید کی تعلیمی سرگرمیوں اور ان کی انگریزوں کی حمائت نے بھی حالی کو تحریک بھی دی اور متاثر بھی کیا۔ سرسیّد اور حالی میں اس سلسلے میں حاضی مطابقت تھی۔ تعلیم اور خصوصاً انگریزی تعلیم کی ترویج واشاعت اور ان کا انگریزوں کی مدد کا سلسلہ اور اُن کی انگریزوں کی اس خیر خواہی کا صِلہ سرسیّد کو اس طرح مل رہا تھا کہ ۱۸۳۸ء میں سررشتہ داری، ۱۸۴۱ء میں، مین پوری میں منصفی، ۱۸۵۷ء میں تمام رات مسٹر شیکسپئر کی کوٹھی کا پہرہ دینے کے بعد مرادآباد کا صدر الصدور ہونا۔ ۱۸۶۸ء میں بنارس میں جج خفیفہ، ۱۸۶۹ء میں سفرِ انگلستان، غرض کہ انگریزی حکومت کی عنایات کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ پھر ۱۸۸۸ء میں کے۔سی۔ایس۔آئی (نائب کمانڈر استار آف انڈیا) کا خطاب انگریزی حکومت کی طرف سے ملا اور ۱۸۸۹ء میں ایڈنبرا یونی ورسٹی نے ایل۔ایل۔ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔ لندن جانے سے پہلے، رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے فیلو مقرر ہوئے، پھر لندن میں بڑے بڑے معزز کلبوں کی ممبر شپ انہیں دی گئی۔ ۱۸۷۸ء میں وائس رائے کی لیجسلیٹو کاؤنسل کے ممبر بنائے گئے۔ ۱۸۸۲ء میں ایجوکیشن کمیشن کے ممبر ہوئے اور ۱۸۸۴ء میں پبلک سروس کمیشن کے ممبر ہوئے جبکہ اُس وقت انگریزوں کے علاوہ شاید ہی کوئی ہندوستانی کمشین کا ممبر ہوا ہو۔ اُس وقت یہ اعزاز کسی ہندوستانی کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا جس کا اِس وقت

اندازہ کرنا بہت مشکل ہے۔ جنہوں نے برٹش انڈیا میں انگریزوں کی حکمرانی اور ان کے مناصب کی اہمیت دیکھی ہے وہی، ان مناصب کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ نتیجے میں سرسیّد نے خود ایک انجمن علی گڑھ میں ''برٹش انڈین ایسوسی ایشن'' کے نام سے بنائی۔ یہ سب خصوصی مراعات، عام پبلک اور خصوصاً سرسیّد کے حلقے کو بہت اچھی بھی معلوم ہوتیں مگر ''ایمپائر'' پر اگر کوئی حرف آنے کا شبہ بھی ہوتا تو یہی انگریز، ایسے لوگوں کو کبھی معاف نہ کرتے جن کی کارگزاریاں مشکوک معلوم ہوتیں۔ غالب کی پنشن نہ ملنے کی چاہے کتنی ہی تاویلیں ماہرین غالب کریں، مگر اس کا اصل سبب وہی بہادر شاہ کا ''سکّہ'' کہنا تھا جس میں لوہارو خاندان کی پیرویاں بھی غالب کے خلاف مستزاد ہو گئیں، اگر چہ غالب ''سکّہ'' کہنے کا ہمیشہ انکار کرتے رہے۔ شاید انگریزوں سے دوستی کی کوشش، کچھ کا شاعری میں اپنا شاگرد بنانا، سب وہی پنشن کی واگزاری کی کوششیں تھیں۔ مگر ان سب سے بھی حکومت قطعی نہیں پسیجی، کیونکہ ''اسلام خطرے میں ہے'' جیسا نعرہ بھی اندر اندر حکومت نے the empire is in danger جیسے تہذیبی جملے سے بنا رکھا تھا جو ہر انگریز کا watch-word بن گیا تھا اور یہ سب اپنی تمام کالونیوں کے تحفظ کے لئے تھا جس پر سختی سے عمل ہوتا تھا۔ ''میر صادق علی اور میر رستم علی رئیسان چاند پور، ضلع بجنور کا تعلق، اس جرم میں، کہ ان کی عرضی، بادشاہ دلّی کے دفتر سے برآمد ہوئی تھی، سرکار نے ضبط کرلیا۔''[۱۲] انگریز غیر مشروط تابعداری اور وفاداری چاہتے تھے بقول، اکبرالہ آبادی، نہ اف کیجیے اور نہ ہٹ کیجیے/ جو صاحب کہیں اس کو جھٹ کیجیے/ حالی نے 'وشائعت و بائعت' تو انگریزوں کی طرف داری ضرور کی مگر سرسیّد کی طرح براہ راست نہیں اور جہاں تک مجھے معلوم ہے، انہوں نے ملکہ وکٹوریہ کی وفات پر ایک تعزیتی نظم لکھنے کے علاوہ اور کچھ براہِ راست انگریزوں کے لیے نہیں کیا۔ مگر جو علمی ادبی اور کلچرل تبدیلیاں حالی، انگریزی تہذیب سے متاثر ہو کر لائے اس کا جواب اور کوئی نہ لا سکا۔ مگر یہ ایسا وقت تھا کہ کوئی بھی اس طرح سوچ سکتا تھا۔ پھر انگریزوں کے مخالفین کا حشر بھی حالی کو معلوم تھا۔

شیفتہ، مولوی فضل حق خیر آبادی اور منیر شکوہ آبادی پر کیا کیا گزر چکی تھی، حالی اس انجام سے باخبر تھے۔ پھر بھی حالی کے اقدام ہمیشہ مثبت سمتوں میں رہے۔ انہیں "خذ ماصفا" پسند تھا۔ سرسید سے بھی انہوں نے یہی سیکھا تھا۔

یہاں ایک بات کی وضاحت کردوں کہ یہاں جو کچھ لکھا جا رہا ہے، اُسے صرف ایک طرح کی اکیڈمک انکوائری (academic enquiry) ہی سمجھا جائے۔ یہ سب کچھ کسی حد تک کلونیل دباؤ کے تجزیے (analysis) کی کوشش ضرور ہے۔ جس میں تاریخ کے گھماؤ اور "ایمپائر" کی بقا کی سیاسی فرماں روائی (Political hegemony) اور ادبی و ثقافتی تبدیلیوں پر اثراندازی کو نہیں بھولنا چاہیے۔ پھر کالونیاں بناتے وقت، کالونیاں بنانے والی (colonizing) شہنشاہیت، کالونیوں کی اپنی تاریخی ثقافتی اور تہذیبی صورتوں نیز روایات کی پروا کیے بغیر، خود اپنے طور طریقوں اور روایات کو یوں پیش کرتی ہے جیسے وہی، صحیح ارتقائی صورتیں ہیں اور محکوم انسانوں کے اپنے سارے ٹریڈیشن پست اور بے مصرف ہیں۔ وہی میکالے، کپلنگ اور ای۔ ایم۔ فارسٹر والا مزاج۔ یقیناً انگریزوں کی ادبی اور تجارتی صورتوں نے حالی کو بے حد متاثر کیا تھا اور یہ بات، ان حالات میں مناسب تھی بھی کہ مسلمانوں کی جاگیردارانہ عادتوں اور مزاج نے انہیں تجارت اور تعلیم دونوں سے دور رکھا۔ تجارت کو وہ بنیوں بقالوں کا کام سمجھتے تھے اور تعلیم کو صرف نوکری کا ذریعہ اور صاحبانِ ثروت کو نوکری کی ضرورت نہ تھی۔ بات بالکل الگ سی ہے مگر غور کے قابل ضرور ہے کہ دلّی سے جب کچھ لوگ لکھنؤ، شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کی ملازمت کی تلاش میں جاتے تو ان میں صاحبانِ ثروت میں سے شاید ہی کوئی شخص ہوا ہو (سلیماں شکوہ کا معاملہ بالکل دوسرا ہے)۔ جزوی مثالوں کو چھوڑ کر عامۃ الناس، تعلیم و تعلّم سے بے خبر تھے اگر چہ تعلیم اور تجارت دونوں کبھی مسلمانوں کی وراثت رہ چکے تھے مگر ۱۸۵۷ء کے بعد، یہ دونوں تقریباً دور کی آواز ہو چکے تھے۔ حالؔی نے اسی لیے کہا کہ "جنھوں نے کہ تعلیم کی قدر و قیمت نہ جانی مسلّط ہوئی

ان پہ ذلت/اور اس تعلیم سے حالی کا مطلب یقیناً، مغربی تعلیم تھا جس کے سرسیّد، سب سے بڑے مؤید تھے۔ حالی حبیب الرحمٰن شروانی کو ایک خط میں لکھتے ہیں

> "میں خیال کرتا ہوں کہ اگر آپ انگلش لٹریچر سے واقف نہ ہوئے ہوتے تو اس تصنیف کا خیال ہرگز آپ کے دل میں نہ گزرتا۔ پس تاوقتیکہ ،ندوۃ العلماء، انگریزی تعلیم کی ضرورت پر زور نہ دے گی، اسکی چیخ پکار سے کوئی معتد بہ نتیجہ پیدا نہیں ہو سکتا"۔

اور یہ سچ بھی تھا کہ جنھوں نے اس تباہ حال سماج (battered society) میں مغربی تعلیم حاصل کی، وہ کم از بھیک مانگنے، یا ان طریقوں سے کام چلانے سے بچ گئے، جن کی روداد، حالی نے مسدس میں یوں لکھی ہے۔

دلوں میں ہے یہ یک قلم سب نے ٹھانی
کہ کیجیے بسر مانگ کر زندگانی
جہاں قدر دانوں کا ہے کھوج پاتے
پہنچتے ہیں واں مانگتے اور کھاتے
کہیں باپ دادا کا ہیں نام لیتے
کہیں روشناسی سے ہیں کام لیتے
تجارت کو کھیتی کو دشوار سمجھیں
فرنگی کے پیسے کو مردار سمجھیں

یعنی سرکاری نوکری کو حرام سمجھتے ہیں۔ کہ اس طرح دَرِ افرنگ کی بندگی کرنا پڑے گی۔ ایسے موقع پر عوام الناس کی مجبوریوں کو حالی نے نظر میں نہیں رکھا، جہاں عالمانِ دین نے ایسے فتاوے دیے تھے کہ انگریزی تعلیم حرام ہے اور انگریزی نوکری بھی اسی زمرے میں

آتی ہے۔ خود مولوی فضل حق خیرآبادی نے بھی اس قسم کا فتویٰ دیا تھا۔ حالی جس تعلیم کی طرف متوجہ کرنا چاہتے تھے، وہ تعلیم، سرسید کے مدرسے ہی سے حاصل ہو سکتی تھی، جہاں بقول سلیم احمد" حالی کے پیرو مرشد نے انگریزوں کے لئے کلرک ڈھالنے کی ایک فیکٹری بنائی تھی"۔ ورنہ کون نہیں جانتا کہ تعلیم اور علم، ہمیشہ سے مسلمانوں کی وراثت رہے ہیں جس کا سلسلہ جزیرۃ العرب سے اسپین (اندلس)، وسط ایشیا اور ہندوستان کی خانقاہوں، فیروز تغلق کے مدرسوں سے لے کر، مشرقی سلطانوں کی تعلیمی کوششوں تک پھیلا ہوا ہے جس کی بلند چوٹیاں حضرت علی سے لے کر اُلکندی، الرازی، الغزالی، ابن سینا، بغداد اور سمرقند و بخارا تک میں جس میں محمد ابوعبداللہ ابن اسماعیل بخاری اور تیمور کے پوتے اُلغ بیگ (۱۳۹۱ء تا ۱۴۴۸ء) کی رصدگاہ وغیرہ سب شامل ہیں۔ اُلغ بیگ جو ایک عالم، مورخ اور علم ہیئت کا ماہر تھا۔ پھر سمرقند میں مدرسۂ ریگستان، مدرسۂ شیر دار نیز پندرھویں اور سولھویں صدی کے بخارا کے دینی مدرسے جن میں مدرسۂ میر عرب، مدرسۂ کوکلتاش، مدرسۂ عبداللہ خاں اور مدرسۂ مادر خاں، دیوان بیگی کا مدرسہ (۱۹۹۸ء میں راقم نے سمرقند کے کچھ ایسے مدرسے خود دیکھے تھے) ظاہر ہے کہ حالی مسلمانوں کے اس شاندار ماضی کے علم و تعلیم سے بے خبر تو نہ رہے ہوں گے۔ اس لیے جس تعلیم کی وہ تبلیغ کر رہے تھے وہ یقیناً نوکری حاصل کرنے والی انگریزی تعلیم ہی تھی۔ دوسری بات حالی نے تجارت کی کہی تھی اور اس طرح گھما پھرا کر کہ اس سے مسلمانوں کا تباہ شدہ سماج، کچھ بہتر ہو سکتا ہے کیونکہ تجارت ہی سے معاشی صورتوں کا علاج ممکن ہے، مگر تجارت اور صنعت گری بھی ہو تو وہ بھی انگریزی طور طریقوں سے کہ آج (یعنی حالی کے وقتوں میں) ہندوستان میں اگر مغرب کا مال نہ ہو تو، ہندوستانی بھوکے مر جائیں کیونکہ یہ نہ کچھ کرتے ہیں اور نہ کچھ کر سکتے ہیں۔ انہیں مغرب ہی کے لوگ سکھا سکتے ہیں اور یہ سب مغربیوں ہی کے طفیلی بنے ہوئے ہیں جسے برٹش حکومت 'سفید فام قوم کا بوجھ' (white man's burden) کہتی تھی۔ حالی اسے یوں پیش کرتے ہیں

نہ پاس ان کے چادر نہ بستر ہے گھر کا
نہ چاقو، نہ قینچی نہ نشتر ہے گھر کا
جو مغرب سے آئے نہ مال تجارت
تو مرجائیں بھوکے یہاں اہلِ حرفت

تو سب ہندوستانی بھوکے مرجائیں۔ تجار پر براہ راست معیشت بند ہوجائے اور جانے کیا کیا ہوجائے۔ یہ وہی سبق ہے جو انگریز اوران کے گماشتے، ہندوستانیوں کو پڑھاتے رہتے تھے۔ تعلیم اور تجارت کی اہمیت سے کسے انکار ہوسکتا ہے مگر جب یہ نوآبادیات (colonies) میں سرمایہ کاری، دباؤ اور ظلم و جور (repression) اور اپنی امپیریل اسکیموں کو بارآور اور کامیاب بنانے کے لیے، ایک خاص نقطۂ نظر سے پھیلائے جائیں تو ایسی تعلیم اور تجارت اور عقل (wisdom) سب محض سرکاری نقطۂ نظر کی ہوں گی نہ کہ فلاحِ عامّہ کے لیے۔ وہ ڈاسن کا بُوٹ بنانے کے لیے، کچا مال حاصل کرنے کے لیے، شیفیلڈ کے کارخانوں کے چاقو، قینچی، نشتر اور سوئی کی تجارت کے لیے ہوں گی یا کسی ایسے مذہبی پرچار کے لیے جو ''ایمپائر'' کی توسیع میں مدد کرسکے اور یہی کچھ ہندوستان میں ہو بھی رہا تھا۔ جس ٹیکنیکل تعلیم کا حالی خواب دیکھ رہے تھے اسکی جانکاری (know-how) ''ایمپائر'' کہاں اور کیسے دے رہی تھی؟ یہاں تو بقول اکبرالہ آبادی

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے
جب بسولا ہٹا تو رندہ ہے

والی کیفیت تھی اور پروفیسر doctor of divinity یعنی مسیحی مذہب کے مبلّغ تھے اور ''مشن'' اسکول۔ اسی تعلیم پر ''ایمپائر کی توسیع'' کا کام ہورہا تھا جیسا کہ گوری وِشوناتھن نے اپنی کتاب masque of conquest (1989) میں لکھا ہے کہ کولونیل گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسیوں کو میکالے صاحب اوران کے ہم خیال وقتاً فوقتاً حکومت کے مفاد کے لیے بدلتے بھی

رہتے تھے تاکہ کولونیل حکومت اپنی گرفت مضبوطی سے قائم رکھے۔ گوری وشواناتھن کے مطابق میکالے کا یہ سب سے معاندانہ (hostile) پروگرام تھا۔

حالی کی تجارت والی بات، یہاں تک تو درست ہے کہ تجارت اور صنعت سازی کے بغیر، کوئی قوم معاشی طور پر مرفہ الحال نہیں رہ سکتی اور کبھی کبھی اُس کی معاشی زندگی خطرے میں بھی پڑ جاتی ہے مگر حالی سے یہ بات تو آہستہ سے پوچھی ہی جاسکتی ہے کہ انیسویں صدی کے ہندوستان میں یا اس سے بھی پہلے انگریزی طرزِ تجارت اور مغربی مصنوعات ہندوستان میں عام نہ تھیں تو ہندوستانی آخر کس طرح زندگی بسر کرتے تھے، ہندوستانی کس طرح کی تجارت کرتے تھے۔ کپڑے سلا کر پہنتے تھے یا یونہی لپیٹ لیتے تھے اور اگر سلاتے تھے تو ان کی قینچی، سوئی، کیسے بنتی تھی اور کہاں سے آتی تھی؟۔ مگر حالی تو اس طرزِ تجارت اور مالِ تجارت کے حامی ہیں جو مغرب سے مغربی طور طریقوں سے آئے۔ سوئی، قینچی، چاقو اور نشتر کی مثالوں اور ضرورتوں کے اشارے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حالی اس ٹیکنیکل تعلیم و تجارت کے حامی تھے جو مغرب میں صنعتی انقلاب سے وجود میں آئی تھی۔ ان کی نظر میں کفش دُوزی کا فن جو ٹیکنیکل بھی ہے اور عملی بھی، علم افلاطون سے بہتر ہے (جو محض خیالی ہے اور تھیوری ہے)

کمال کفش دُوزی، علم افلاطون سے بہتر ہے
یہ وہ نکتہ ہے سمجھے جس کو مشائی نہ اشراقی

حالی نے جس گولڈ اسمتھ کا حوالہ دے کر اُردو شعرا کو اُسی قسم کی شاعری کرنے کی ترغیب دی اور اُس کی نظم Deserted village کا خلاصہ پیش کیا، اُسی ڈزرٹڈ ولیج میں، آگے چل کر گولڈ اسمتھ نے انگلستان کی ایسی تجارت اور اس طریقِ تجارت کی مذمت بھی کی ہے۔ (یہ بات ممتاز حسین نے بھی لکھی ہے) اور یہ تمام رومانوی شعرا کا خیال تھا کہ صنعتی انقلاب کے تجارتی طور طریقوں نے اِستحصالی طریقِ تجارت کو ترقی دی ہے جس میں human

factor کا زوال ہوا ہے اور یہ عامۃ الناس کے لیے ہرگز مفید نہیں ہے۔ٹریولین نے سوشل ہسٹری آف انگلش لٹریچر میں ایسی استحصالی تجارت اور شعرائے انگلینڈ کا ایسی تجارت سے تنفر کا بَرملا اظہار پیش کیا ہے۔ صنعتی انقلاب، یقیناً تجارتی دنیا میں بَرومندی کی ایک جست (leap) تھا اور ٹیکنکل میدان میں ایک انقلابی جہت بھی مگر اس سے جو استحصالی صورتیں پیدا ہوئیں، اُس میں انسانیت اور انسانی ہمدردی مفقود ہوگئی۔یورپ کے شعرا اور ادیب اسی وجہ سے اس طریق تجارت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔مگر حالی شاید، ان کو افلاطون یعنی بے عمل ہی سمجھتے رہے ہوں گے۔(کیونکہ عربوں کے یہاں کہاوت تھی، کہ فلسفی میدان عمل کے بھگوڑے ہوتے ہیں)

مقدمۂ شعروشاعری حالؔی کا سب سے اہم کارنامہ ہے جس نے اردو تنقید کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کیا اور یہ صحیح ہے کہ مقدمۂ شعروشاعری اردو کی نئی تنقید کی خشت اوّل ثابت ہوا۔وہ حالی جنھوں نے بڑے افتخار سے کہا تھا کہ 'حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں رترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں ر'انہوں نے علم وادب کے میدان میں بھی آزاد انگریزی شعری فکر سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔اس طرح کہ مشرق کی وہی تمام کوششیں انہیں یا تو بیکار نظر آئیں یا مشرقیوں کی ان تمام کوششوں سے حالی بے خبر رہے جن کی خبر، ان کو، ان کے مطابق مغرب ہی سے ملیں۔ممتاز حسین نے اپنی کتاب ''حالی کے شعری نظریات۔ایک مطالعہ'' میں لکھا ہے

حالؔی سرسیّد احمد خاں سے اس قدر مغلوب اور مغربی افکار سے اس قدر مرعوب ہوگئے تھے کہ وہ جن باتوں کو مشرقی ادب کے حوالے سے اچھی طرح بیان کرسکتے تھے، انہیں بھی انھوں نے مغربی مصنفین کے توسّط سے بیان کیا۔مثلاً ارسطو کی کتاب بوطیقا کا خلاصہ ''الشفا'' اور ''اساس الاقتباس'' دونوں میں موجود ہے لیکن وہ (حالی) ارسطو کے نظریات کی تشریح، لارڈ میکالے کے توسّط سے کرتے ہیں جس کی ناقدانہ بصیرت مشکوک ہے۔''[۵۵]

پھر بھی حالی نے جو بحثیں مقدمہ، میں اٹھائی ہیں، جیسے، شاعری سوسائٹی کی تابع ہے، شعر کی عظمت، شعر کے لیے ضروری ہے یا نہیں، وزن کی شعر میں کس قدر ضرورت ہے، شاعری کے لیے کیا کیا شرطیں ضروری ہیں، اور اس ضمن میں انہوں نے تخیل، شرح کائنات کا مطالعہ اور تفحصِ الفاظ کی بحث اٹھائی ہے۔ پھر والٹر اسکاٹ کی شاعری کو زیر بحث لائے ہیں۔ یہ سب بحثیں بہت مفید ہیں جن سے اردو والے جُزوی طور پر تو واقف تھے مگر کماحقہ، نہیں۔ کتاب العمدہ، اور نقد الشعر، وغیرہ میں بھی اس طرح کی کچھ بحثیں ہیں مگر ان سب کو ایک تار میں پرو کر، تنقد کے لیے ایک نیا راستہ پیدا کرنا یقیناً حالی کا بڑا کارنامہ ہے۔ بس صورت یہ ہے کہ یہ سب اس طرح پیش کیا گیا ہے جیسے ادب کی ماہیت، اسکے اوضاع نیز اس کی مختلف جہتوں سے مشرق کبھی واقف نہ ہوتا اگر مغرب کے یہ نمونے اور یہ خیالات بھی انگریزوں کے ادب کے ذریعے یہاں نہ آئے ہوتے۔ ایسی صورت میں مشرقی ادب، علی الخصوص اردو ادب، ان باتوں سے بے بہرہ رہ جاتا۔ اس کوشش میں حالی یہاں تک چلے جاتے ہیں کہ مشرقی محققین کے اقوال کو غلط پیش کر کے، مغربی ادبی اقوال کو ان پر کبھی کبھی فوقیت دے دیتے ہیں۔ ممتاز حسین نے لکھا ہے [1]

> ''انہوں (حالی) نے جو تفہیم ارسطو کے خیال سے متعلق، خواجہ نصر الدین طوسی کی پیش کی ہے، وہ کس قدر غیر ذمہ دارانہ ہے۔ محقق طوسی نے یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ ''سب سے پہلے وزن کا التزام عربوں نے کیا''۔ بلکہ یہ لکھا ہے کہ وزن حقیقی یعنی وزن بالقافیہ کا التزام سب سے پہلے عربوں نے کیا''۔ شاید یہ بھی حالی کی کلونیل دباؤ والی سوچ ہی کا نتیجہ ہے۔

حالی خود تو انگریزی سے قطعی ناواقف تھے جس کا پتہ مولوی عبدالحق اپنی کتاب

''چند ہم عصر'' میں اور حامد حسن قادری ''داستان تاریخ اردو'' میں تفصیل سے دیتے ہیں۔ شاید جس نے بھی حالی کو، انگریزی ادب سے ترجمہ کرکے انہیں جو کچھ بتادیا، حالی نے اسی کو اہم سمجھ کر مقدمے میں شامل کرلیا۔ یہ بات ایک معمہ ہے کہ حالی کے لیے یہ ترجمے کرتا کون تھا؟۔ کم از کم اس راقم آثم کو اس کا پتہ نہیں ہے کہ کون حالی کو ملٹن، میکالے، گولڈ اسمتھ ورڈسورتھ او کولرج وغیرہ کے تنقیدی مضامین یا نظریات کے ترجمے کرکے دیتا تھا؟۔ جہاں تک مجھے علم ہے حالی کے دوستوں اور ہم عصروں میں کوئی بھی انگریزی ادب کی اتنی سوجھ بوجھ نہیں رکھتا تھا۔ نہ شیفتہ، نہ نذیر احمد، نہ صہبائی اور نہ ہی سر سیّد (اگرچہ وہ تقریباً ڈیڑھ سال تک لندن میں رہے) نہ ہی مفتی صدر الدین آزردہ۔ حالی پر تحقیق کرنے والوں کو بھی آج تک معلوم نہ ہوسکا کہ یہ ترجمے حالی کے لیے کس نے کیے اور پھر اتنے شغف کے ساتھ۔ یہ ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے جسے تلاش کرنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ کرنل ہارائیڈ ہی نے حالی کے لیے یہ کام کیا ہو۔ کیونکہ یہ کام وہی کرسکتا ہے جو بہت کچھ ادب کا نبض شناس بھی ہو صرف مترجم ہی نہ ہو۔ پھر بہت سے بھٹکاؤ بھی، ان ترجموں کے ساتھ حالی کے یہاں ملتے ہیں۔ اب یہی کہ والٹر اسکاٹ کی شاعری، انگریزی ادب کی شعری تاریخ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی مگر حالی نے یہ بات بتائی کہ ''والٹر اسکاٹ کی نظموں میں دو خاصیتیں ایسی ہیں جن کو سب نے تسلیم کیا ہے (کون سب نے؟ انگریزی ادب کے ناقدین نے یا عام قاری نے) (۱) اصلیت سے تجاوز نہ کرنا (۲) ایک ایک مطلب کو نئے نئے اُسلوب سے ادا کرنا''۔ پہلی بات تو یہ کہ والٹر اسکاٹ ایک نیم تاریخی اور نیم رومانی طرز کا ناول نگار تھا۔ شاعری، اس نے کی ہی کتنی؟ پھر رومانیت اور حقیقت واصلیت میں ایک طرح کا بیر ہے۔ حیرت ہے کہ جو، اس دور کا سب سے بڑا شاعر ہے اور جس نے تھیوری آف پوئٹری پر کیسی کیسی باتیں کی ہیں، حالی کے لیے ترجمہ کرنے والوں نے اسے بہت سَرسری (casual) ڈھنگ سے لیا preface to lyrical ballads میں شعری نظریات پر کیسی کیسی بحثیں

ہیں؟۔پھر مقدمے میں جہاں نظریاتی بحثیں ہیں، انہیں حالی یوں پیش کرتے ہیں۔
''ایک یوروپین محقق، ان لفظوں کی شرح اس طرح کرتا ہے۔'' مگر یہ نہیں بتاتے کہ وہ یوروپین محقق ہے کون؟ مگر ممتاز حسین نے ڈھونڈھ نکالا کہ وہ یوروپین محقق کولرج ہے جس کی بہت سی مثالوں اور جملوں کو حالی نے من وعن نقل کر دیا ہے۔ کولرج نے ۱۸۱۸ء میں ایک لکچر شاعری پر دیا تھا، حالی نے سب کچھ اس لکچر سے اردو میں پیش کر دیا ہے۔ ممتاز حسین کی کتاب حالی کے شعری نظریات۔ ایک تنقیدی مطالعہ، میں ص ۵۰ سے ۵۲۔۵۱ تک اِسے دیکھا جا سکتا ہے۔ ممتاز حسین نے دونوں عبارتیں آمنے سامنے لکھ کر، ثبوت فراہم کر دیا ہے جنہیں طوالت کے خوف سے اس مقالے میں یہاں پیش نہیں کیا جاتا۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ کہیں کہیں ، حالی، کولرج اور میکالے کے خیالات کو ملا کر اپنی عبارت، مقدمے میں تیار کر لیتے ہیں۔ ''شعر میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہیں۔'' کے عنوان کے تحت جو باتیں حالی نے مقدمہ کے ص ۶۱ پر لکھی ہیں، کہ ایک یوروپین محقق، اِن لفظوں کی شرح اس طرح کرتا ہے ''سادگی سے صرف لفظوں کی سادگی مراد نہیں ہے'' یہ سب کولرج کی عبارت ہے۔ پھر آگے چل کر مقدمہ کے ص ۶۳ پر لکھتے ہیں کہ ''جیسی مقناطیسی کشش کا ذکر، اِس محقق (یعنی کولرج) نے ملٹن کے الفاظ کی شرح میں کیا ہے، لارڈ میکالے کہتے ہیں کہ وہ خود ملٹن ہی کے بیان میں پائی جاتی ہیں ؎'' لیکن انگریزی ادب کی تنقیدی تاریخ میں میکالے کو کوئی معمولی ناقد بھی نہیں مانتا۔ نہ میکالے کی کوئی تنقیدی تھیوری ہے۔ ''میتھو آرنلڈ تو اُسے (apostle of philistines) ناتراشیدہ اور عامیانہ خیال کا آدمی) کہتا ہے۔ مگر چونکہ ہندوستان کی کلونیل حکومت میں اُسے بڑی اہمیت، اُس کی مغرب پرستی اور ہندوستانیوں کی تحقیر کرنے کے باعث تھی، پھر میکالے انگریزی تعلیم اور اسے پھیلانے کا ماہر بھی سمجھا جاتا تھا، اس لیے حالی نے بھی اُسے بڑی اہمیت دی اور اُسے ''صاحبان والا شان'' والا وقار بخشا۔ تمام مصنفین کے لیے تو حالی ''وہ'' اور ''اُس'' کی ضمیر کا استعمال کرتے ہیں مگر میکالے کے لیے

لکھتے ہیں کہ "لارڈ میکالے کہتے ہیں" بظاہر تو یہ بہت معمولی سی بات ہے مگر اس سے حالی کے کلونیل دباؤ والے رویّے کا پتہ چلتا ہے۔ میکالے سے حالی کی کچھ دلچسپی اس کے اس بیان سے بھی ہو سکتی ہے جس میں اُس نے کہا تھا کہ مفلس جنت میں جا ہی نہیں سکتا کیونکہ جب اس کے پاس دولت اور روپیہ پیسہ نہ ہوگا تو وہ خیرات اور کارِ خیر وغیرہ کس طرح کرے گا جس سے قربِ الٰہی حاصل ہو (ع۔ دربار میں اللہ کے آوازہ ہے اس کا، یعنی دولت کا۔ چکبست) اور دولت، روپیہ پیسہ، فی زمانہ صرف تجارت ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں جس کی حالی تبلیغ کر رہے تھے۔ تعجب ہے کہ میکالے کے اِس قول کو کسی بااعتقاد عیسائی "good christian" نے چیلنج کیوں نہ کیا کہ اس قول سے خود بائبل پر ضرب پڑتی ہے جہاں sermon on the mount میں کہا گیا ہے کہ۔ blessed are the poor for their's is the kingdom of heaven پھر یہاں یہ بات تو محض جملۂ معترضہ کے طور پر لکھ دی گئی ہے۔ بات تو ادب اور مقدمے، کی ہو رہی تھی۔ ہاں تو جہاں، وزن کی شعر میں ضرورت، اور قافیہ شعر کے لیے ہے یا نہیں، کی دلچسپ بحث حالی نے اٹھائی ہے، وہاں انہوں نے قولِ فیصل کے طور پر یورپ کے محقق کا پھر حوالہ دیا ہے۔ "یورپ کا محقق لکھتا ہے کہ اگرچہ وزن پر شعر کا انحصار نہیں ہے اور ابتدا میں وہ مدتوں، اس زیور سے معطّل رہا مگر وزن سے بلاشبہ اُس کا اثر زیادہ تیز اور اس کا منتر زیادہ کارگر ہو جاتا ہے۔" غالباً یہ محقق ولیم ورڈسورتھ ہے جس نے preface میں اس طرح کی بحثیں اٹھائی ہیں۔ مگر ایسی تمام بحثیں مشرقیوں کے یہاں بھی ملتی ہیں۔ بوعلی سینا، نصیر الدین طوسی (اساس الاقتباس)، ابن رشیق، رشید الدین وطواط، ابن قدامہ (کتاب النقد)، شعر والشعراء (ابن قتیبہ)۔ کتاب العمدہ میں ابن رشیق لکھتا ہے "شعر کی عمارت چار چیزوں سے اٹھتی ہے۔ لفظ و وزن، معنی و قافیہ۔ پھر بحث وزن پر پہنچ کر وزن شعر کا اعظم و اخص رکن ہے۔ کلام، شعر نہیں کہلاتا جب تک اُس میں وزن اور قافیہ نہ ہو"۔ پھر وزن و قافیہ کی شرط نہ ماننے پر بھی بحث ہے[4]۔ مقدمے میں چند ضمنی

باتیں مزید حالی نے بلاسبب چھیڑ دیں مثلاً عرب، شعر کے کیا معنی سمجھتے تھے" کی ذیلی سرخی کے تحت انہوں نے لکھا۔" حالانکہ قرآن شریف میں وزن کا مطلق التزام نہ تھا"۔ان کا یہ قول اور defence درست نہیں۔ قرآن شریف میں متعدد مقامات پر کچھ آیتوں میں وزن بھی ہے اور قافیے کا التزام بھی۔ مثلاً سورۂ والشمس، سورۂ والعادیات ذبحاً، سورۂ کوثر، سورۂ اخلاص اور سورۂ رحمٰن میں یہ التزام دیکھا بھی جا سکتا ہے۔ پھر مقدمے، کے ص ۳۸ (حوالۂ بالا ایڈیشن) پر جہاں "وزن کی شعر میں کس قدر ضرورت ہے" اور "قافیہ شعر کے لیے ضروری ہے یا نہیں" میں پھر یورپ کی شاعری کو اس لیے بہتر بتایا ہے کہ اس میں بلینک ورس اور غیر مقفیٰ شاعری کا خاصہ رواج ہے۔ اس طرح شعر گوئی میں آزادی ہے اور ردیف کی بھی پابندی، شعریت اور معنی کا کبھی کبھی خون کر دیتی ہے۔" قافیے کی پابندی ادائے مطلب میں خلل انداز ہوتی ہے"۔ (ص ۳۹ـ۳۸) قافیہ اور ردیف کی پابندی کی مخالفت میں حالی نے خاصہ زور لگایا۔ صنائع و بدائع کا استعمال بھی انہیں پسند نہ تھا، اگرچہ یہ تمام باتیں، مشرقی شاعری کا حسن سمجھی جاتی ہیں (خود حالی کی شاعری بھی اس سے خالی نہیں) مگر اس اختلاف کی عملی ضرورت خود حالی کے یہاں بطور نمونہ بھی کہیں نہیں ملتی۔ نہ ہی حالی نے بلینک ورس کا کہیں کوئی تجربہ کیا جبکہ عبدالحلیم شرر اور مولوی اسماعیل نے بلینک ورس میں شاعری کی ہے اگرچہ انہوں نے نہ کبھی بلینک ورس کی تائید میں کچھ لکھا اور نہ قافیہ ردیف کی پابندی کی کوئی مخالفت کی۔ حالی کا یہ تضاد بھی اُسی کلونیل دباؤ کی وجہ سے ہے، جس کا بار بار، اس مقالے میں ذکر کیا گیا ہے۔ حد یہ ہے کہ

نمازیں پڑھو بے خطر معبدوں میں
اذانیں دھڑلے سے دو مسجدوں میں

والے تصور کو بھی حالی "مغرب کی شائستہ قوم" کی رعایت ہی سمجھتے ہیں کیونکہ قدیم یوروپی تہذیب کے مطابق "جس بادشاہ کی حکومت ہو، اسی کا مذہب بھی رعایا کا ہونا

چاہیے۔فارمولا،اگرانگریز،ہندوستان میں نافذ کردیتے تو ہندوستانی کیا کر سکتے تھے؟ مگر انگریز بے حد ہوشیار قوم ہے۔اس نے یہ زبردستی کسی کالونی میں کہیں بھی نافذ نہیں کی بلکہ اس کے لیے مشن اسکول اوران اسکولوں میں بائبل کا پڑھنا لازمی بنا کر یہ کام کیا۔ہندوستان جیسے ذات پات اورورنا شرم میں منقسم معاشرے میں انہیں سماجی طور پر up-grade کرکے یہ کام کیا۔معلوم نہیں حالی یہ باتیں کہاں تک سمجھتے تھے۔پھر ڈارون اور نیوٹن کی تھیوریوں نے یوں بھی معتقدات کو متزلزل کردیا تھا،اس لیے آزادخیالی کو یوں بھی فروغ ہورہا تھا جو مغربی علوم کی تحصیل کے ساتھ ساتھ روشن خیالی میں تبدیل ہورہی تھی۔اس طرح پیروی مغرب، ان معنوں میں بہتر صورتیں بھی پیدا کررہی تھی جو تاریخ اور سماجی ارتقا کی بدولت ہورہا تھا جس سے اندھے عقیدوں اور اوہام پرستی پر چوٹ پڑ رہی تھی۔ادبی مسائل اور افکار میں بھی تبدیلی آنا،ایک لازمی سی بات تھی۔نئی زندگی کے نئے تجربوں کے ساتھ، پرانے ادبی اصول (norms) تو بہرحال ٹوٹتے۔محمد حسن عسکری نے اپنی کتاب ''ستارہ یا بادبان'' میں عجیب سی بات لکھی ہے

> غرض حالی کے زمانے سے لے کر آج تک ہمارے یہاں پیروئی مغرب،اسی طرح ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہمارے ادب سے ہر قسم کے معیار بالکل ہی غائب ہوگئے۔ہمارے نقاد کہتے رہتے ہیں کہ اردو ادب،مغربی ادب کے برابر پہنچ گیا۔پرانے خیال کے بزرگ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس جو کچھ تھا، وہ بھی گنوا بیٹھے پیروئی مغرب کے صرف ایک ہی معنی ہوسکتے تھے اور وہ یہ کہ ہم مغرب کا طرز احساس قبول کرلیں ۔''

طرزِ احساس کا ہے میں؟ فکر شعر میں؟ فکرِ ادب میں؟ یا تدوین ادب وتنقید

میں؟۔تہذیبی صورتوں میں؟ یا حکومت میں؟عسکری نے خود ہی لکھا ہے کہ ''اگر اشپنگلر کی بات مانی جائے تو ایک کلچر، دوسرے کا طرزِ احساس مستعار لے ہی نہیں سکتا''۔ اگر ایسا ہے اور یقیناً ایسا ہی ہے،تو،ہم مغرب کا طرزِ احساس کس طرح قبول کرلیں؟ تہذیبوں کے اپنے اپنے فکری اور تہذیبی مطمحِ ہوتے ہیں، روائتیں اور ٹریڈیشن ہوتے ہیں، جو شاید اوپر سے تو ملکی اور جغرافیائی اثرات کا جامہ پہن لیتے ہیں، لیکن اندر اندر، جو نسل (race) اور قوم کی انفرادی اور اجتماعی نفسیات کا دھارا ہلچل مچاتا رہتا ہے، وہ طرزِ احساس کو کس کس طرح سے بدلتا جاتا ہے؟ جس پر ہر دور کی تاریخ کے گھماؤ اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔عسکری، ایسی رائے دیتے ہوئے، ان تمام باتوں کو شاید نظر میں نہیں رکھتے۔پھر خود عسکری لکھتے ہیں۔
''انیسویں صدی کے آخر میں نطشے سے اعلان کیا کہ خدا مر گیا۔۱۹۲۵ء کے قریب ڈی۔ایچ لارنس نے اعلان کیا کہ انسانی تعلقات کا ادب مر گیا۔۱۹۴۵ء میں مالرو نے اعلان کیا کہ انسان مر گیا'' (مشرق و مغرب کی آویزش)۔پھر مقدمۂ شعر و شاعری، کے بعد انگریزی اور اردو تنقید میں اتنے تصورات، آپس میں گڈمڈ ہوگئے ہیں اور اتنے اختلافات بھی اُبھر آئے ہیں کہ کوئی کسی کی نہیں سنتا۔نہ ہی کسی ایک مغربی نقطۂ نظر (جس میں امریکی نقطۂ نظر بھی شامل ہے) کو ادب اور تنقید میں استقامت حاصل ہے۔پھر عمرانیات اور فلسفیانہ تصورات کا الگ دباؤ ادب پر پڑتا رہتا ہے۔مارکسزم، وجودی فکر، تاریخی اور سماجی نقطۂ نظر، لسانی، جمالیاتی اور اسلوبیاتی طرزِ فکر کے ساتھ، ساختیات، پس ساختیات، ردِ تشکیل اور مابعد جدیدت اور پھر مابعد جدیدیت کے بعد beyon postmodernism اور ''مابعد جدیدت کی مفلوک الحالی (the poverty of post modernism)، تنقید اور ادب کی نئی صورتیں، پوسٹ ریشنلزم (post rationalism) اور پھر، ان تمام صورتوں کی کاٹ کی کوششوں میں مزید تھیوریوں کا جنم، ان سب نے ادب میں وہ افراتفری مچا رکھی ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ صحیح راستہ کدھر ہے۔پھر صحت کا بھی کیا معیار ہوگا؟ انہیں کے ساتھ

ساتھ، مادّی کائنات، عقلیت، جذبہ، تخیل اور حسیات سب دوڑتے بھاگتے رہتے ہیں۔ شعور، لاشعور اور نفسیات کی دوسری صورتیں، ان سب پر مستزاد ہیں۔ یہ سب دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ حالی سے پوچھیں کہ حالی، اب آؤ اور بتاؤ کہ کس مغربی صورت کی ہم پیروی کریں؟۔ ہم بڑی مشکل میں ہیں اور کوئی راستہ بتانے والا بھی نہیں ہے۔ نہ تمہارا ضبط، نہ انسانی نیکیاں جس کا تم نے استعمال کیا، نہ تمہاری سادگی نہ ہی unconcious tools of history والی بات جس نے تم سے یہ سب لکھواڈالا۔

۱۔ خودنوشت بہ حوالہ داستان تاریخ اردو از حامد حسن قادری، ص ۵٦۸ پہلا ایڈیشن۔

۲۔ داستان تاریخ اردو، ص ۸۔۱۷۷ از حامد حسین قادری، ۱۹۴۱ ایڈیشن

۳۔ نئی نظم اور پورا آدمی، از سلیم احمد پہلا ایڈیشن، ص ۸۳۔ یہ بات محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (M A.O College) کے لیے کہی گئی ہے جو بعد کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنا۔

۴۔ جو علم سکھائی جاتی ہے، وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے۔ اکبرالہ آبادی

۵۔ حالی کے نظریات ایک تنقیدی مطالعہ از ممتاز حسین، ص ٦۵

٦۔ حالی کے تنقیدی نظریات۔ ایک مطالعہ، ص ۱۰ پہلا ایڈیشن

۷۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ رام نرائن لال بینی مادھو، الہ آباد، ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۸۱ء

۸۔ مزید معلومات کے لیے ملاحظہ ہو ممتاز حسین کی "حالی کے نظریات ایک تنقیدی مطالعہ" ص ۵۴

۹۔ مراۃ الشعر۔ از عبدالرحمٰن۔ مطبوعہ اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ۔ کچھ کتابوں کے نام اور احوال عربی ادب کی تاریخ از ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی مطبوعہ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی سے بھی لیے گئے ہیں۔

۱۰۔ مجموعہ محمد حسن عسکری، ص ۲٦۹، مطبوعہ سنگِ میل پبلکیشنز لاہور، ۲۰۰۰ء

۱۱۔ اسی کتاب کا صفحہ ۵۴۷ ملاحظہ ہو۔

تفہیمِ غالب

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

معروف غالب شناس اور ممتاز جدید نقاد شمس الرحمٰن فاروقی مشرق و مغرب کی ادبیات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ یہ کتاب ان کی بیس سالہ کاوشوں کا ثمرہ ہے۔

تفہیم غالب دیوانِ غالب کی شرح نہیں بلکہ قدیم و جدید شعریات کی روشنی میں مرزا غالب کے ۱۴۸ منتخب اشعار کی ایسی فکر انگیز شرح ہے جو کلامِ غالب پر ایک متوازن تنقید کا درجہ رکھتی ہے اور جس میں فاروقی کا رویہ غالب کے تمام شارحین سے مختلف ہے۔

صفحات	۴۷۸
قیمت	۹۰ روپے

حنیف نقوی

مکاتیبِ حالؔی

سر سید کے رفقا میں مولانا الطاف حسین حالؔی اس اعتبار سے سرِ فہرست ہیں کہ ان کی اہمیت اردو نثر اور نظم دونوں میں یکساں طور پر مسلّم ہے۔ اردو نثر میں انہیں تنقید کے بنیادگزار کی حیثیت سے شرفِ اولین حاصل ہے تو نظم میں جدید شاعری کے بانیوں میں ان کا نام سب سے نمایاں اور ان کا کلام سب سے زیادہ مقبول ہے۔ علاوہ بریں عربی و فارسی نثر و نظم میں بھی بیک وقت کوئی ان کا مدِ مقابل نظر نہیں آتا۔ شبلی کی فارسی شاعری یقیناً خاصے کی چیز ہے لیکن فارسی نثر میں اور اس سے بڑھ کر عربی نظم میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے اعتبار سے حالؔی بلاشبہ شبلی پر فوقیت رکھتے ہیں۔ اردو میں سوانح نگار کی حیثیت سے ان کا جو مقام ہے، اس سے بھی ہم سب بخوبی واقف ہیں لیکن اس حقیقت سے شاید کم ہی لوگ باخبر ہوں کہ ''یادگارِ غالب'' اور ''حیاتِ جاوید'' کے بعد اس سلسلے کی ان کی تیسری معروف تصنیف ''حیاتِ سعدی'' آج بھی اپنے موضوع پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ فارسی زبان و ادب اور اس کی تاریخ و تنقید پر ان کے غیر معمولی عبور کی ایک بیّن دلیل ہے۔ اسی طرح عربی زبان و ادب کے ایک رمز شناس کے بقول ان کی عربی نثر و نظم بھی بڑی حد تک

اہلِ زبان کی تحریروں سے لگا کھاتی ہے۔ ان تمام خوبیوں پر مستزاد ان کی وہ شرافت نفس اور منکسر مزاجی تھی جو انہیں اپنے تمام ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ اپنے بعض معاصرین کے برخلاف انہوں نے کبھی بھی اور کسی بھی معاملے میں اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے یا اپنے کارناموں کو عالمانہ ادّعا کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش نہیں کی نتیجہ یہ ہے کہ ان کی بہت سی تحریریں وہ توجہ نہیں پاسکیں جس کی وہ فی الواقع مستحق تھیں۔ وہ جس پائے کے عالم اور ادیب تھے، اسکو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ محفوظ ہو جانا چاہیے تھا مگر افسوس ہے کہ ایسا نہ ہوسکا۔ ۱۵/اگست ۱۹۱۰ء کو مولانا ظفر علی خاں کے نام کے ایک خط میں انہوں نے اپنی گرتی ہوئی صحت کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی منتشر تحریروں کے سلسلے میں اس خیال کا اظہار کیا تھا

> اپنا کلامِ نظم و نثر اردو و فارسی وغیرہ مرتب کرنا چاہتا ہوں مگر نہیں ہوسکتا۔ حالاں کہ کسی سے امید نہیں کہ میرے بعد کوئی اس کو بوجوہ دلخواہ نہ سہی، سرسری طور پر ہی مرتب کردے"
>
> (مکاتیب حالی، ص ۶۳)

طرح طرح کے عوارض بالخصوص ضعفِ بصارت نے حالؔی کو ان کی زندگی کے باقی چار سالہ دور میں اس کا موقع نہ دیا کہ وہ اپنے اس منصوبے کو حسب دلخواہ پایۂ تکمیل تک پہنچاتے۔ ان کی وفات کے بعد شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے اس کام کی ذمہ داری سنبھالی اور مختلف ذرائع و وسائل سے ان کی منتشر تحریروں کو یکجا کر کے اور کتابی صورت میں ترتیب دے کر بڑی حد تک اس نقصان کا سدِ باب کردیا جو بصورتِ دیگر ناگزیر تھا۔ تاہم یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انتہائی پرخلوص اور سنجیدہ کوشش کے باوجود اس قسم کی کتنی تحریریں ان کی دسترس سے دور رہ گئیں اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ ان کا کیا حشر ہوا؟ کم از کم ان کے مکتوبات کے بارے میں جو فی الوقت ہمارا موضوعِ گفتگو ہیں، یہ بات کسی قدر وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی

ہے کہ بہ استثناے چنداں کا بڑا حصہ محفوظ نہیں رہ سکا اور اب یہ گمانِ غالب ہے کہ ضائع ہو چکا ہے۔

بحالتِ موجودہ شیخ محمد اسمٰعیل مرحوم کا مرتبہ مجموعہ ''مکاتیب حالی'' کل انہتر (۶۹) خطوط پر مشتمل ہے جنہیں بہ اعتبارِ زبان تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ حصہ اول میں اردو کے چوّن (۵۴) حصہ دوم میں فارسی کے آٹھ (۸) اور حصہ سوم میں عربی کے سات (۷) خط شامل ہیں۔ اردو کے چوّن (۵۴) خط انتالیس (۳۹) مکتوب الیہم کے نام ہیں۔ ان میں پانچ خط ایسے بھی ہیں جو اصل خطوط کی بجاے ان کے اقتباسات پر مشتمل ہیں۔ حصہ دوم کے آٹھ فارسی خطوط میں سب سے اہم خط مرزا غالب کے نام ہے جس میں غالب کے استفسار پر نظیری کے ایک شعر کی تشریح کی گئی ہے۔

حالی، غالب کے عزیز ترین شاگردوں میں تھے۔ یہ واحد خط ہے جو ان کے درمیان مراسلت کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ حالی کے نام غالب کا کوئی خط ان کے کسی مجموعۂ مکاتیب میں شامل نہیں۔ حتیٰ کہ اردوے معلّیٰ کے اس ایڈیشن میں بھی جو مطبعِ مجتبائی دہلی نے اپریل ۱۸۹۹ء میں بطور خاص مولانا حالی کی اجازت سے شائع کیا تھا اور جس کا حصہ دوم خود مولانا موصوف کے عنایت کردہ ''قلمی مسودے'' پر مبنی ہے، اس قسم کی کوئی تحریر جگہ نہیں پا سکی ہے۔ یہ صورتِ حال اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ ان دونوں کے درمیان مراسلت و مکاتبت کا وسیلہ اردو نہیں، فارسی تھی۔ حالی کا محولۂ بالا خط غالب کے جس خط کے جواب میں لکھا گیا ہے، وہ یقیناً فارسی ہی میں تحریر کیا گیا ہوگا۔ مرزا صاحب کے اواخرِ عمر میں ان کے اور مولانا حالی کے درمیان نمازِ پنجگانہ کے سلسلے میں جو منظوم تحریری مکالمہ ہوا تھا، اس کی زبان بھی فارسی ہی تھی۔ اس سے بھی ہمارے متذکرۂ بالا قیاس کو تقویت ملتی ہے ظاہر ہے کہ دوسروں کے نام لکھے گئے استاد کے اردو خطوط کو محفوظ رکھنے والے سعادت مند شاگرد نے اپنے نام کے یہ خطوط بھی احتیاط سے رکھے ہوں گے

لیکن یہ احتیاط بھی انہیں ضائع ہونے سے نہ بچا پائی، یہ ایک بالکل مختلف امر ہے۔ "یادگار غالب" کے بعض حوالوں سے یہ بات بہر حال پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ حالؔی کے پاس غالب کے بعض ایسے فارسی خطوط موجود تھے جو ان کی زندگی میں "پنج آہنگ" کے کسی ایڈیشن میں جگہ نہیں پا سکے تھے۔

اپنی محدود تعداد کے باوجود حالؔی کے یہ خطوط ان کی شخصیت، ان کے افکار و نظریات اور ان کے گرد و پیش کے بارے میں معلومات کے ایک اہم ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسا کہ اس سے قبل بھی عرض کیا جا چکا ہے، حالؔی کی شخصیت کا سب سے نمایاں وصف ان کی منکسر مزاجی اور شرافتِ نفس تھی۔ بڑوں کا احترام، معاصرین کی قدر دانی اور چھوٹوں کی ہمت افزائی ان کی فراخ دلی مثالی حیثیت کی حامل تھی۔ ان خطوط میں اس کی مختلف مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً علاّمہ شبلی نے سر سید کی سوانح عمری "حیات جاوید" کو مدلل مداحی قرار دے کر سر سید اور حالی دونوں کے معاملے میں جو منفی رویّہ اپنایا تھا وہ ایک مخصوص مزاجی کیفیت اور طرزِ فکر کا آئینہ دار ہے، اسکے برخلاف حالؔی نے شبلؔی کے علمی کارناموں کی پذیرائی اور ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں جس وسیع النظری کا مظاہرہ کیا ہے وہ ایک بالکل مختلف اندازِ فکر اور کیفیتِ مزاج کا عکاس ہے۔ خود علاّمہ شبلی کے نام ۳۰ رنومبر ۱۹۰۶ء کے ایک خط میں جو پانی پت سے لکھا گیا ہے، ایک مقامی لائبریری کے لیے ان کی متعدد کتابوں کی خریداری کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں

> آپ کی تصنیفات کی نسبت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا کہ مَن عَرَفَ مَعرِفَتکُم ھی التّصِیفِ کَلَّ لِسانُہ۔ آپ کا وجود قوم کے لیے باعثِ فخر ہے۔ خدا تعالےٰ آپ کو بہت مدت تک زندہ سلامت رکھے"۔
>
> (ص ۴۰)

۱۹۰۷ء کے ایک اور خط میں مولانا کے مجموعۂ کلام ''دستۂ گل'' کے بارے میں اپنے تاثرات ان الفاظ میں سپردِ قلم کیے ہیں

''کوئی کیوں کر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے سیرۃ النعمان، الفاروق اور سوانح مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں۔ غزلیں کا ہے کو ہیں، شراب دوآتشہ ہے جس کے نشے میں خمارِ چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے۔ غزلیاتِ حافظ کا جو حصہ محض رندی و بے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے، ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دل ربائی ہو مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے زیادہ گرم ہیں''۔ (ص ۴۲)

مولانا ظفر علی خاں حالؔی کے کم عمر معاصرین میں تھے۔ وہ ایک کامیاب صحافی اور خطیب بھی تھے اور ایک اچھے نظم نگار بھی۔ وہ شاعروں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جس کی تربیت انجمنِ پنجاب کے زیرِ اثر ہوئی تھی اور جو حالؔی و آزادؔ کی قیادت میں شاعری کی نئی شاہراہ پر گامزن تھا۔ جنوری ۱۹۰۵ء کے دکن ریویو میں ان کی ایک نظم ''رودِ موسیٰ'' شائع ہوئی تھی۔ اسے پڑھنے کے بعد حالؔی نے ۱۱ر مارچ ۱۹۰۵ء کو انہیں جو خط لکھا تھا، وہ ان کے طرزِ شاعری کے بارے میں تحسین آمیز اظہارِ خیال کے پہلو بہ پہلو خود نفسِ شاعری کے متعلق حالؔی کے نقطۂ نظر اور اپنے دور کے عام اندازِ شاعری سے ان کی بے اطمینانی پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ لکھتے ہیں

''آپ کی نظم 'رودِ موسیٰ'۔۔۔ اوّل سے آخر تک بڑے غور سے اور بڑے شوق کے ساتھ پڑھی۔ میرا حال اب یہ ہو گیا ہے کہ پرانے طرز کی نظمیں تو (اِلّا ماشاءاللہ) اس لیے

دیکھنے کو جی نہیں چاہتا کہ ان میں کوئی نئی بات دیکھنے میں نہیں آتی اور نئی طرز کی نظموں میں گو مضامین نئے ہوتے ہیں مگر وہ چیز جس کو شاعری کی جان کہنا چاہیے اور جس کو ''جادو'' کے علاوہ اور کسی لفظ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، کہیں نظر نہیں آتی۔ لیکن اس نظم کو دیکھ کر میں متحیر ہو گیا۔ مرثیہ دیکھ کر بھی مجھے ایسا ہی تحیّر ہوا تھا لیکن اس وقت آپ کے دل کو لگی ہوئی تھی اور ایسا کلام جو دل کے جوش پر مبنی ہو، خواہی نخواہی موثر اور دل کش ہوتا ہے لیکن رودِ موسیٰ پر جو کچھ آپ نے لکھا ہے، یہ محض زورِ طبع اور شاعری کی خداداد قابلیت سے لکھا ہے۔ اگر آپ جیسے دو چار آدمی ملک میں پیدا ہو جائیں تو کچھ امید ہوتی ہے کہ نئی شاعری چل نکلے۔ مجھے تو مسلمانوں کے دکھڑے نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ نیچر کے مظاہر پر کچھ طبع آزمائی کرتا۔ مولوی اسمٰعیل صاحب میرٹھ والے بھی اب ہماری طرح پا در رکاب ہیں۔ صرف پنجاب میں آپ جیسے چند لوگوں کی صورتیں نظر آتی ہیں، بشرطے کہ آپ کو فکرِ معاش دم لینے دے اور یہ بھی دل کو لگی رہے۔''

چوں کہ بات نئی شاعری کی نکل آئی ہے اور حالؔی اس طرزِ شاعری کے موسس اور پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کے ایک اور خط کا بھی حوالہ دے دیا جائے جس میں انھوں نے ''قومی جلسوں میں نظموں کی بھرمار'' کے خلاف اظہارِ خیال کرتے ہوئے شاعری کے اصل منصب اور موضوعات کے تعین کی کوشش کی ہے۔ یہ

خط مولوی محبوب عالم کے نام ہے اور اپریل یا مئی ۱۹۰۲ء میں لکھا گیا ہے۔ حالی کا موقف یہ ہے کہ جن اداروں یا انجمنوں کے مقاصد میں فلاحی و رفاہی منصوبوں کے لیے چندہ جمع کرنا بھی شامل ہو، ان کے جلسوں میں عوام کو متوجہ اور متحرک کرنے کے لیے روایتی قسم کی نظمیں پڑھی جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس جیسی تنظیموں کے لیے جن کے اجلاس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اہل الرائے حضرات کا مجمع ہوتا ہے، یہ مناسب نہیں کہ وہ نظم خوانی میں اپنا وقت ضائع کریں

"ہم نہ قدیم شاعری کے مخالف ہیں، نہ جدید شاعری کے مزاحم بلکہ ایک لحاظ سے جدید شاعری کے زیادہ موید ہیں لیکن ہماری رائے میں نئی شاعری کو ترقی دینے یا اس کی داد لینے کا مقام بجائے قومی جلسوں کے نئی طرز کے مشاعروں کو قرار دینا چاہیے جن کا عمدہ نمونہ ایک دفعہ پہلے لاہور میں قائم ہو چکا ہے۔ نئی طرز کے مشاعرے سے ہماری مراد یہ ہے کہ قدیم دستور کے موافق ان میں شعرا کو مصرع طرح نہ دیا جائے بلکہ کسی مضمون کا عنوان بنا کر نظمیں کہلوائی جائیں اور اس بات کا اختیار کہ وہ کس بحر یا کس صنف میں ترتیب دی جائیں، خود شعرا کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ نئی طرز کی شاعری میں سوا اس کے کہ لوگوں نے جا بجا مسلمانوں کے تنزل کا رونا رویا ہے، اور مضامین کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے حالانکہ نیچرل مضامین کا وسیع اور ناپیدا کنار میدان موجود ہے۔ جس میں ہمارے شعرا طبیعت کی جولانیاں اور فکر کی بلند پروازیاں دکھا سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے قومی

جلسوں میں شاعری کے جوہر دکھانے سے کوئی عمدہ نتیجہ
شاعری یا قوم کے حق میں پیدا نہیں ہوسکتا۔" (ص ۵۰)

حالی کی سیرت و شخصیت کا ایک نمایاں وصف یہ بھی تھا کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست داعی او مبلغ تھے چنانچہ وہ اس قسم کی ہر کوشش کو قابل قدر و لائق ستائش سمجھتے تھے جس کا مقصد ان دونوں فرقوں کے باہمی اختلافات کا سدِ باب اور ان کے درمیان اشتراک و تعاون کی تبلیغ و ترویج ہو۔ ان کی نگاہ میں یہ مقصد بجائے خود اس قدر اہم تھا کہ وہ اس کی کامیابی یا ناکامی کے امکانات پر بھی زیادہ غور و فکر اور بحث و تمحیص کے قائل نہ تھے۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے ۱۹۰۴ء میں "اتحاد" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا تھا جس کا مقصد ہندو اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد و اتفاق کو فروغ دینا تھا۔ بعض معاصر اخبارات ان کے اس اقدام کو ایک بے نتیجہ کوشش سے تعبیر کر رہے تھے کیونکہ ان کے خیال میں ان دونوں فرقوں کے اختلافات کا دور ہونا ایک امر محال تھا۔ حالی کے نزدیک نہ تو حالات اس قدر مایوس کن تھے اور نہ یہ نقطۂ نظر اصولی طور پر درست تھا۔ اسی لیے وہ شرر کی اس کوشش کو سراہتے ہوئے ان کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں

"اگر فرض کر لیا جائے کہ فی الواقع ان دونوں قوموں کا تنافر اس درجے کو پہنچ گیا ہے کہ کسی طرح دور نہیں ہوسکتا تو بھی اس بات کا انکار نہیں ہوسکتا کہ "اتحاد" کا مقصد نہایت اعلیٰ اور اشرف ہے۔ جو لوگ دنیا میں ہمیشہ کے لیے امن اور مصالحت کی بنیاد ڈالنا اور جنگ و خوں ریزی کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹانا چاہتے ہیں، ان کی نسبت بھی ایسا ہی خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی کوششوں کا بار آور ہونا غیر ممکن ہے لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ نوع انسان کے ہوا خواہ اور

> خیر اندیش نہیں ہیں یا وہ دنیا کو بدی اور خباثت سے پاک کرنا نہیں چاہتے۔" (ص ۵۳)

حالی کو یہ مقصد کس قدر عزیز تھا اور وہ اسے سہل الحصول نہ سمجھنے کے باوجود اس کی تکمیل کے کس قدر آرزومند تھے، اس کا اندازہ پیارے لال شاکر میرٹھی مدیر "العصر" کے نام ۱۸/ جون ۱۹۱۳ء کے ایک خط سے بھی ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں

> "میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ مجھ سے زیادہ شاید کوئی اس بات کا آرزومند ہوگا کہ ہندوستان کے ہندو، مسلمان اور مسیحی سب ایک دوسرے کے ایسے دوست ہوں جیسے ایک سگا بھائی دوسرے سگے بھائی کا دوست ہوتا ہے مگر میرے نزدیک ایسی حالت ایک صدی سے ورے ہندوستان میں پیدا نہیں ہو سکتی مگر ہم کو کیا ع 'بعد از سرِ من کن فیکون شد، شدہ باشد۔' (ص ۱۱۰)

ہندو مسلم اختلافات کی طرح مختلف اسلامی فرقوں کے باہمی تنازعات بالخصوص شیعہ سنّی مناقشوں سے بھی حالی بے حد آزردہ اور بددل رہتے تھے۔ اسی بنا پر اس اقرار و اعتراف کے باوجود کہ "اسلامی فرقوں کا اتحاد ہندو مسلمانوں کے اتحاد سے کچھ کم دشوار نہیں ہے" وہ ہمیشہ 'مذہبی تعصبات کے گرد و غبار سے اسلام کا مطلع صاف کرنے" کی کوشش میں سرگرم افراد کے حامی و ہم نوا رہے، اور ان لوگوں کی ہمت شکنی کرتے رہے جو ان اختلافات کو ہوا دے کر اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں۔ "آب حیات" کے پہلے ایڈیشن میں مولانا محمد حسین آزاد بعض نامعلوم وجوہ کی بنا پر مومن کے حالات شامل نہیں کر سکے تھے۔ چونکہ مولانا آزاد مسلکاً شیعہ تھے اور مومن کا شمار اس مسلک کے مخالفین میں ہوتا تھا، اس لیے کتاب کی اشاعت کے بعد بعض لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ مومن کو نظر انداز کیے

جانے کا سبب بھی اختلاف عقائد ہے۔ حالؔی کے نزدیک یہ بدگمانی انتہائی ناپسندیدہ اور شر انگیز تھی چنانچہ وہ اسے "یاوہ سرائی" سے تعبیر کرتے ہوئے مولانا آزاد کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اس قسم کے تبصروں کی پروا کیے بغیر اپنا کام جاری رکھیں۔ ایک طویل خط کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو

> "افسوس ہے کہ سفیر ہند امرت سر میں جو مومنؔ کا حال چھپا ہے، وہ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ صرف منشی ذکاء اللہ کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ کسی شخص نے ایسا کچھ لکھا ہے مگر دوسرے صاحب جو آپ پر کچھ منہ آئے ہیں، ان کا مضمون نواب احمد سعید خاں صاحب نے اخبار صبح صادق میں دکھایا تھا۔ یہ خیال اکثر لوگوں کو ہے کہ آپ نے مذہبی تعصب کے سبب مومنؔ کا حال نہیں لکھا، مگر اس سے بڑھ کر کوئی سخیف اور پوچ خیال نہیں ہوسکتا آپ لوگوں کی یاوہ سرائی پر کچھ التفات نہ کیجیے اور اپنا کام کیے جایئے۔ نکتہ چینوں کے خوف سے مفید کام بند نہیں کیے جاسکتے۔" (ص ۱۸)

حالؔی سرسید کے رفیقِ خاص اور علی گڑھ تحریک کے پر جوش مبلغ اور قافلہ سالار تھے لیکن سرسید کے صاحبزادے سید محمود نے جس قسم کا مزاج پایا تھا اور اپنے والد کی وفات کے بعد جس طریقِ کار پر عمل پیرا تھے، وہ ایم۔ اے او کالج کے دوسرے بہت سے بہی خواہوں کی طرح حالؔی کے لیے بھی سخت تکلیف اور کبیدگیِ خاطر کا سبب تھا۔ حالات کی اس روز افزوں خرابی کے تدارک کی ان کے نزدیک اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہ تھی کہ سید محمود کو جلد از جلد کالج کمیٹی کی صدارت سے برطرف کر دیا جائے۔ چنانچہ علامہ شبلی کو ۲۸ ستمبر ۱۹۹۹ء کے

ایک خط میں لکھتے ہیں

"سید محمود کی بے اعتدالیاں اب حد سے زیادہ بڑھ گئی ہیں اور لوگوں کو ان کی آڑ میں کالج کے درہم برہم کرنے کا خاصا موقع مل گیا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ محسن الملک کو نواب لفٹننٹ گورنر نے نینی تال بلایا ہے۔ سید محمود کو پریسیڈینسی سے علیحدہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ کاش ہز آنر ان کے برطرف کرنے کا مشورہ دیں سردست کالج کی حالت نازک ہے۔ خدا انجام بخیر کرے۔" (ص ۴۷)

سرسید، ان کی تحریک اور ان کے قائم کردہ کالج سے غیر معمولی ہمدردی اور تعلق خاطر کے باوجود مسلمانوں کی اصلاح اور تعلیمی ترقی کے سلسلے میں حالی کا واحد مطلوب و مقصود ایم۔اے۔او کالج ہی نہ تھا۔ وہ ہر اس ادارے اور اس تنظیم کے ساتھ اشتراک و تعاون کو ضروری سمجھتے تھے جو اس مقصد کے حصول کے لیے سرگرم ہو۔ اپنی اس وسیع النظری کی بنا پر انہیں ان لوگوں سے کسی قدر شکایت بھی تھی جن کی تمام تر دلچسپی اور ساری ہمدردیوں کا مرکز و محور صرف علی گڑھ تھا۔ چیف جسٹس گوالیار اسٹیٹ صاحبزادہ سلطان احمد خاں کے نام ۲۵ رمئی ۱۹۰۹ء کے ایک خط میں انجمن حمایتِ اسلام کے سفیر شیخ عبدالرحمٰن کا تعارف کرانے کے بعد انہوں نے اس طرح اپنے اس موقف کا اظہار کیا ہے

"اگر چہ علی گڑھ پارٹی کے اصحاب سوائے ایم۔اے۔او کالج اور کسی انسٹی ٹیوشن کی مدد بہ طوع و رغبت نہیں کرتے لیکن اب زمانے کا اقتضا یہ ہے کہ مسلمانوں کی ہر ایک تعلیم گاہ کی پوری پوری امداد کی جائے کیوں کہ چھ کروڑ مسلمانوں کے لیے ایک محمڈن کالج کسی طرح کافی نہیں ہو

سکتا"۔(ص۹۹)

سر سید، ان کی تحریک اور اس تحریک سے وابستہ افراد کے حوالے اس مجموعے کے کئی خطوط میں موجود ہیں لیکن غالبؔ کے بارے میں یہ تحریریں کوئی خاص معلومات فراہم نہیں کرتیں۔ ان کا ذکر بطورِ خاص نواب سعید احمد خاں طالبؔ دہلوی کے نام کے ایک خط میں آیا ہے۔ یہ خط اس خط و کتابت کے حوالے سے جو"واقعات انیس" کے بعض مضامین کے متعلق مکتوب الیہ موصوف اور اس کتاب کے منصف سید امجد علی اشہریؔ کے درمیان ہوئی تھی، ۴؍ مارچ ۱۹۰۹ء کو لکھا گیا ہے۔ اشہریؔ صاحب نے اپنی اس کتاب میں غالب کے سفرِ لکھنؤ کے دوران ان کے اور میر انیس کے درمیان ملاقات اور گفتگو کی جو روداد بیان کی ہے، حالیؔ نے اسے یکسر خلاف واقعہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے

"میں اس باب میں صرف اس قدر لکھنا کافی سمجھتا ہوں کہ نہ مرزا کی ملاقات لکھنؤ میں میر انیس مرحوم سے ہوئی اور نہ ہو سکتی تھی"۔(ص۹۵)

اپنے اس دعوے کی تائید میں مولانا نے جو دلائل پیش کیے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں

(۱)"مرزا صاحب کلکتہ جاتے (ہوے) اثنائے راہ میں چند روز لکھنؤ ٹھہرے تھے۔ یہ زمانہ نصیر الدین حیدر کا تھا"

(۲)"نصیر الدین حیدر ۱۸۲۷ء میں تخت نشین ہوئے اور ۱۸۳۷ء میں انہوں نے انتقال کیا۔"

(۳)نصیر الدین حیدر کے بعد پانچ برس کے قریب محمد علی شاہ تخت نشین رہے' بعد ازاں امجد علی شاہ برسرِ اقتدار آئے۔

(۴)انیسؔ کے خاندان نے انہی امجد علی شاہ کے زمانے میں "فیض آباد سے آ کر لکھنؤ میں سکونت اختیار کی۔"

ان واقعاتی شہادتوں کے علاوہ اشہری صاحب کے بیانات کے رد میں مولانا حالی نے ایک منطقی دلیل بھی پیش کی ہے۔ فرماتے ہیں

> "واقعات انیس (میں) جو مکالمہ میر صاحب اور مرزا صاحب کی طرف منسوب کیا گیا ہے، وہ دونوں صاحبوں کی شان سے نہایت بعید معلوم ہوتا ہے۔ مرزا صاحب جو گویا کہ اہل لکھنؤ کے مہمان تھے، ان سے میر انیس کا پہلی ملاقات میں یہ کہنا کہ غزل ایک مبتذل صنفِ کلام ہے اور ان سے مرثیہ لکھنے کی فرمائش کرنا اور گویا در پردہ یہ کہنا کہ اس میدان میں آؤ تو حقیقت معلوم ہو، کس قدر خلافِ انسانیت، خلافِ تہذیب اور خلافِ اخلاق باتیں ہیں جن کو مردِ آدمی باور نہیں کر سکتا۔" (ص ۹۷)

حالی زبان اور لغت کے مسائل سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کے زمانے تک ان موضوعات پر جتنا کچھ کام ہوا تھا، وہ ان کے نزدیک ناکافی اور غیر اطمینان بخش تھا۔ چنانچہ ۶ / مارچ ۱۹۱۳ء کے خط میں انہوں نے مولوی عبدالحق کو انجمن ترقی اردو کے سکریٹری کا عہدہ سنبھالنے کی مبارکباد دینے کے بعد بطورِ مشورہ یہ بھی لکھا تھا کہ

> اصلاحاتِ علمیہ کی ڈکشنری ضرور مرتب کیجیے اور اس کے بعد معمولی اردو زبان کی ڈکشنری کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ اگر آپ کی کوشش سے یہ دونوں لغات تیار ہو جائیں تو آپ قوم کی ایسی خدمت سے عہدہ برآ ہوں گے جو قومی ترقی کی جڑ ہے"۔ (ص ۴۸)

۱۵ / اگست ۱۹۱۰ء کے خط میں مولانا ظفر علی خاں کو لکھتے ہیں

''اردو زبان کی تذکیر و تانیث پر میں اپنے خیالات ظاہر کرنا چاہتا تھا مگر طبیعت کی نادرستگی، کمزوری اور سب سے زیادہ مکروہاتِ دنیوی نے اس ارادے کو اب تک پورا نہیں ہونے دیا۔'' (ص ۱۳)

ان کے معاصرین اس قسم کے مسائل میں برابر اُن سے استفادہ کرتے رہتے اور وہ بڑے شوق سے ان کے سوالوں کے جواب دیتے تھے۔ مولوی امام الدین کو ان کے ایک ایسے ہی استفسار کے جواب میں ۲رفروری ۱۹۰۷ء کے خط میں لکھتے ہیں

''تابعدار غلط ہے، صرف تابع یا فرمان بردار کہنا چاہیے کیوں کہ تابعدار کے معنی تابع رکھنے والے کے ہیں گویا مخدوم ہوگیا، نہ کہ خادم۔ فصحا کے کلام میں کہیں نہیں آیا ہے، عوام اور جہلا کی زبان پر اکثر جاری ہے۔ غلط العام صحیح کا قاعدہ فصحا جائز نہیں سمجھتے'' (ص ۷۶)

مولانا کے ایک ہم وطن مصنف بابو رگھوناتھ سہائے بی۔ اے نے درخواست کی تھی کہ وہ ان کی تصنیف ''گلدستۂ اخلاق'' کو بہ نظرِ اصلاح ملاحظہ فرما کر انہیں اس کی لسانی و بیانی خامیوں سے مطلع فرمائیں۔ اس کے جواب میں انہیں ''کئی'' یا ''کئی ایک'' کے استعمال کی طرف متوجہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

کئی کا لفظ غلط نہیں ہے مگر اس کا استعمال ٹھیک نہیں ہوا۔ کئی مثلاً ایسی جگہ بولتے ہیں جیسے کئی لڑکے بازار میں جاتے تھے، کئی لڑکوں نے مدرسے میں شرارت کی، لڑائی میں کئی آدمی مارے گئے، اس گاؤں میں کئی بدمعاش رہتے ہیں، استاد نے کئی تھپڑ مارے یعنی جہاں تعداد معلوم ہوتی ہے،

وہاں کئی یا کئی ایک بولتے ہیں مگر جہاں تعداد نہیں معلوم
ہوتی وہاں اکثر، بعض یا بعض بولا جاتا ہے جیسے اکثر لڑکے
شریر ہوتے ہیں، بعض آدمی ناعاقبت اندیش ہوتے ہیں۔
بعضے استاد بے قصور لڑکوں کو مارا کرتے ہیں۔ آخر کی تینوں
مثالوں میں ''کئی'' یا ''کئی ایک'' کا لفظ فصیح اردو کے خلاف
ہے۔'' (ص ۹۱، ۹۲)

تین چار برس قبل ''ہماری زبان'' کے صفحات پر علمائے ادب کے درمیان کافی دنوں تک یہ بحث چلتی رہی تھی کہ از روئے لغت صرف ''استفادہ کرنا'' درست ہے یا ''استفادہ حاصل کرنا'' بھی لکھا جا سکتا ہے۔ حالیؔ نے ان خطوط میں اس موضوع پر وضاحتاً تو کچھ نہیں لکھا ہے لیکن ان کے ایک خط کی عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ''استفادہ حاصل کرنا'' کے استعمال کو جائز سمجھتے تھے۔ علاّمہ شبلی کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں

چونکہ میں (ضعف بصارت کی بنا پر) خود کتابوں سے
استفادہ حاصل نہیں کر سکتا، اس لیے اپنی ہوس کو اس طرح
پورا کرتا ہوں کہ اور لوگوں کے لیے لائبریری میں کتابیں
منگواتا ہوں۔'' (ص ۳۸، ۳۹)

اسے محض اتفاق یا سہوِ قلم کہنا درست نہ ہوگا کیوں کہ حالیؔ اس سے پہلے بھی دو ایک جگہ لفظ ''استفادہ'' کا اسی طرح استعمال کر چکے تھے ''یادگار غالب'' میں ایک مقام پر لکھتے ہیں

''یوروپ کے بعض نامور شعرا مشرقی شاعروں کے کلام سے
اب تک استفادہ حاصل کرتے اور اس سے صدہا اسلوب
بیان اخذ کرتے ہیں'' (یادگار غالب، یوپی اردو اکادمی

ایڈیشن،۱۹۸۲ء،ص ۱۸۳)

''مکاتیب حالی'' کے اس مختصر جائزے سے بخوبی یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حالؔی کی دوسری متعدد تحریروں کی طرح ان کے یہ خطوط بھی نہایت مفید، دل چسپ اور بصیرت افروز معلومات کے حامل ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کے وہ خطوط بھی جو اس مجموعے میں شامل نہیں لیکن جن کا موجود ہونا معلوم ہے یا تحقیق و جستجو سے جن کی بازیافت ممکن ہے، یکجا کیے جائیں اور ایک نیا مجموعہ مرتب کر کے شائع کیا جائے تا کہ ان سے استفادے کا دائرہ مزید وسیع ہو سکے اور حالؔی کے افکار و نظریات کے مختلف گوشے کچھ اور روشن ہو کر سامنے آسکیں۔ غالبؔ کے خطوط کی تلاش و تحقیق اور ترتیب و اشاعت پر جس طرح توجہ دی گئی ہے اگر حالؔی کے خطوط اسی توجہ اور اہتمام کے ساتھ شائع کر دیے جائیں تو یہ یقیناً اردو زبان ادب کی ایک بڑی خدمت ہوگی۔

شریف حسین قاسمی

یادگارِ غالب میں غالب کے منثور فارسی آثار کے اقتباسات کے تراجم پر ایک نظر

"یادگار غالب" کا فارسی ترجمہ کرتے وقت مجھے یہ احساس ہوا کہ خواجہ الطاف حسین حالی (متوفی ۱۳ر صفر ۱۳۳۳ھ/ ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء) نے احوال و آثارِ غالب پر اپنی اس اہم کتاب میں غالب کی منثور فارسی کتابوں سے بعض اقتباسات کے اردو میں جو تراجم، خلاصے یا ماحصل پیش کیے ہیں، ان پر اظہارِ نظر کی ضرورت ہے۔ ادھر چند برسوں سے ہمارے بعض اساتذہ اور دانشور بھی غالب کی منثور فارسی تصانیف کو اردو میں منتقل کر رہے ہیں۔ چوں کہ اب اُردو اور فارسی میں روز بروز فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے، اردو کے اساتذہ اور دیگر فضلا فارسی سے بے اعتنائی برت رہے ہیں، اس لیے یہ کام نہایت ضروری ہو گیا ہے کہ غالب کے فارسی آثار کو اردو کا جامہ پہنایا جائے اس لیے کہ غالب کے احوال و آثار سے متعلق بعض بنیادی امور غالب کے صرف انھی فارسی آثار میں محفوظ ہیں۔

حالی جس ماحول میں پروان چڑھے تھے، اس میں فارسی زبان اور اس کے ادب

سے واقفیت کو حتی اس وقت بھی ضروری سمجھا گیا جب اس سے چشم پوشی عام ہو چکی تھی۔ حالی نے با قاعدہ فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ فارسی کے عالم تھے، یادگار غالب کی تکمیل میں انہوں نے بیشتر غالب کے فارسی آثار ہی سے استفادہ کیا ہے کہ اس کام کے لیے یہی ایک مفصّل ذریعہ ہے۔ حالی کا فارسی کلام، یادگار غالب میں بعض ادبی توضیحات، ان کی کتابیں حیات سعدی، اصول فارسی اور سفر نامۂ ناصر خسرو کی تصحیح و ترتیب اور اس پر مفصّل مقدمہ وغیرہ اس حقیقت کے ترجمان ہیں کہ حالی فارسی زبان اور اس کے ادب سے بخوبی آشنا تھے۔

یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ ایک نہایت مشکل کام ہے۔ جب کسی نظم یا شعر کا ترجمہ کرنا ہو، تو یہ کام اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ غالب کی فارسی نثر کی خصوصیات پر لکھا جا چکا ہے، اس کے مفصل اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں۔ اس سلسلے میں صرف اتنا عرض کر دینا بہر حال ضروری ہے کہ بقول حالی مرزا کی فارسی نثر کو جو مقدار میں فارسی نظم سے بہت زیادہ ہے، اس بنا پر کہ وہ وزن سے معرّا ہے، صرف ایشیائی اصطلاح کے موافق نثر کہا جا سکتا ہے، ورنہ اگر وزن سے قطع نظر کی جائے تو مرزا کی نثر میں شاعری کا عنصر نظم سے بھی غالب تر معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً کلیاتِ نظم کا دیباچہ اور خاتمہ، مہر نیمروز کے ابتدائی عنوان، تمام تقریظیں اور دیباچے جو لوگوں کی کتابوں پر مرزا نے لکھے ہیں اور مکاتبات کا ایک معتد بہ حصہ سراسر شاعرانہ خیالات اور پوئیٹکل نظم و نسق پر مبنی ہے[1]۔

غالب کی فارسی نثر پر حالی کے اس منصفانہ تجزیے سے یہ امر واضح ہوا کہ غالب کی فارسی نثر کا بیشتر حصہ منثور نظم ہے اور اس کے، کسی بھی زبان میں ترجمے کے وقت ہمیں وہی دشواریاں پیش آئیں گی جو کسی نظم یا شعر کے ترجمے کے وقت پیش آتی ہیں۔

حالی نے یادگار غالب میں، جہاں ضرورت محسوس کی، وہاں غالب کے منثور فارسی آثار سے بعض ضروری حصّوں کو اردو میں پیش کیا ہے۔ حالی کو یہ خوب احساس تھا کہ

غالب کی فارسی نثر کا اردو ہی میں کیا، کسی بھی دوسری زبان میں ترجمہ کرنا جوکھم کا کام ہے۔ اس لیے انہوں نے فارسی اقتباسات کو اردو میں پیش کرنے کے لیے دو طریقے اپنائے۔ ایک تو یہ کہ کہیں انہوں نے فارسی نثر کے حصّوں کا بقول ان کے، محض خلاصہ یا ماحصل لکھ دیا اور دوسرے یہ کہ فارسی عبارتوں کا اردو میں ترجمہ کر دیا۔ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حالی نے غالب کی فارسی عبارتوں کے بیشتر خلاصے یا ماحصل اردو میں لکھے ہیں، ترجمے زیادہ نہیں، اس کی وجہ واضح ہے کہ خلاصہ یا ماحصل بیان کر دینا نسبتاً آسان تھا اور ترجمے کے لیے زیادہ توجہ، وقت نظر اور وقت کی ضرورت تھی جو حالی کے پاس اس کام کی تکمیل کے لیے مفقود تھا۔ دوسرے یہ کہ حالی نے خود ان کے بقول یہ التزام کیا ہے کہ

مرزا کی زندگی کے عام حالات جس قدر کہ معتبر ذریعوں سے معلوم ہوسکیں اور ان کی شاعری و انشا پردازی کے متعلق جو امور کہ احاطۂ بیان میں آسکیں اور ابنائے زماں کی فہم سے بالاتر نہ ہوں، ان کو اپنے سلیقے کے موافق قلمبند کروں۔[۲۰]

اس لیے فارسی عبارات کے خلاصے، ماحصل اور ترجمے بھی عام فہم رکھے گئے۔ اس کے باوجود غالب کے فارسی آثار سے اقتباسات کے خلاصوں یا تراجم میں جو فروگذاشتیں اور کمیاں نظر آتی ہیں، ان سے گمان ہوتا ہے کہ حالی نے یہ کام کسی خاص رغبت اور توجہ سے انجام نہیں دیا۔ یہ بات تو خود حالی نے "یادگار غالب" کے دیباچے میں لکھی ہے کہ

بعض دوستوں کے اصرار پر انہیں یادگار غالب کی تکمیل کے لیے ایک نہایت اہم اور ضروری کام ملتوی کرنا پڑا[۲۱]

یعنی یادگار غالب ان کی نگاہ میں بہت اہم اور ضروری کام نہیں تھا۔ اسی طرح یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ حالی نے غالب کے احوال زندگی کو ضمنی حیثیت دی، اصل توجہ ان کے آثار کی شرح و توضیح پر مبذول رہی ہے۔ اس لیے اس حصّے میں غالب کے فارسی

آثار سے اقتباسات کے خلاصے یا تراجم بھی سرسری انداز سے پیش کیے گئے ہیں۔

حالی نے غالب کے منثور فارسی آثار سے جن اقتباسات کو اردو میں پیش کیا ہے، اس کی تفصیل درج ذیل ہے

غالب نے مہر نیمروز میں "خطاب بہ بہادر شاہ" کے تحت شاہجہان کے ملک الشعرا کلیم ثانی (متوفی ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۱ء) کے سونے چاندی میں تولے جانے اور اپنی ناقدری کا ذکر اس طرح کیا ہے

"گویند در عہد جہانبانی حضرت صاحبقران ثانی بہ فرمانِ آن
خسروِ دریا دل کلیم را صدرہ بہ سیم و زر و لعل و گہر سنجیدہ اند، من
آن خواہم کہ دیدہ وران را دستور دہی تا از کشش نرنجند
و یکبار گفتار مرا با کلام کلیم بسنجند"[۲۷]

حالی نے اس عبارت کے مطالب کو یادگار غالب میں اپنے سلیقے کے مطابق اس طرح سادگی سے پیش کیا ہے

شاہجہان کے عہد میں کلیم شاعر کو سیم و زر میں تولا گیا تھا، مگر میں صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ اور کچھ نہیں تو میرا کلام ہی ایک دفعہ کلیم کے کلام کے ساتھ تول لیا جائے[۲۸]۔

اس عبارت میں "دیدہ وران را دستور دہی تا از کشش نرنجند" بہت اہم ہے جس کا مطلب ہے کہ آپ دیدہ وروں کو حکم دیں کہ وہ میرے کلام پر توجہ کرنے سے افسردہ خاطر نہ ہوں۔

لیکن حالی نے خلاصے میں اس عبارت کا مفہوم شامل نہیں کیا، بہر حال خلاصے میں ضروری نہیں کہ اصل عبارت کا مکمل مفہوم پیش کیا جائے۔

- حالی نے غالب کے منثور فارسی آثار سے اقتباسات کا اسی انداز سے سادہ اور سلیس خلاصہ پیش کیا ہے کہ اسی اسلوب کو انہوں نے اپنی یادگار غالب کے لیے مناسب

سمجھا۔

حالی نے غالب کے قید ہونے کا واقعہ بیان کیا ہے۔ حالی نے خود اس پر اظہار رائے سے اجتناب کیا اور پورا واقعہ غالب کی زبانی یہ کہہ کر سنایا ہے کہ ''مرزا نے خود اس واقعہ کو ایک فارسی خط میں مختصر طور پر بیان کیا ہے، جس کا ترجمہ ہم اس مقام پر لکھتے ہیں''۔

غالب کے اس خط کے جس حصّے کا حالی نے ترجمہ کیا ہے، اس کا فارسی متن اور ترجمہ یہاں پیش کرنے سے پہلے عرض کر دیا جائے کہ حالی نے یہ ترجمہ بھی رواروی میں کیا ہے۔ یہ اہم خط جس توجہ کا طالب تھا، وہ ترجمے میں مفقود ہے۔ اگر اس خط کے مطبوعہ متن کو معتبر سمجھا جائے، اور بظاہر وہ درست اور معتبر نظر آتا ہے، تو ایک جملے کا تو غلط ترجمہ کیا گیا ہے جس میں غالب کی ایک ایسی عادت کا ذکر ہے جو ہمارے سماج میں ناپسندیدہ اور حالی کی نظر میں قابلِ مذمّت تھی۔ یہاں فارسی کا ایک ایک جملہ اور یادگارِ غالب سے اس کا ترجمہ پیش ہے

شحنہ عدو بود و مجسٹریت با من نا آشنا

کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف (اس جملے میں ''با من'' کا ترجمہ ''مجھ سے'' ضروری ہے، اس کے بغیر واضح نہیں ہوتا کہ مجسٹریٹ غالب سے ناواقف ہے یا زیرِ غور قضیے سے)

فتنہ در کمین بود و بخت نارسا

فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں (یہ مناسب ترجمہ ہے)

مجسٹریت با آن کہ شحنہ را فرمان رواستی، در خستن من (از) شحنہ فرمان برد

باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے، میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا (میرے باب میں، اس جملے کی فارسی موجود نہیں، اور غالباً ''در خستن من'' کا یہ ترجمہ کیا گیا ہے، جو بہر صورت درست نہیں۔ در خستن من کا ظاہر ہے یہ مطلب ہے کہ مجھے برباد کرنے، یا بے

عزت و رسوا کرنے کے لیے)
وتوقیع گرفتاری من نوشت
اور میری قید کا حکم جاری کر دیا،
وقاضی جنایی با آن کہ با من دوستی داشت، پیوستہ با من مہر ورز و مہربان بود
سشن جج، باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا،
وبارہا در بزم می بہم پیمود
اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا۔
(یہ فارسی جملے کا اصلاً ترجمہ نہیں ہے۔ جملہ ہے "وبارہا در بزم می بہم پیمود" یعنی شراب کی محفلوں میں بارہا ہم پیالہ رہا تھا)
چشم پوشید و بہ تغافل زد
اس نے بھی اغماض اور تغافل اختیار کیا
داوری بہ صدر بردند،
صدر میں اپیل کیا گیا
ہیچ کس نشنید و ہمان فرمانِ بیداد بجا ماند
مگر کسی نے نہ سنا اور وہی حکم برقرار رہا
(اس جملے میں فرمان بیداد کا ترجمہ صرف "حکم" کیا ہے، جب کہ ہونا یہ چاہیے کہ غیر منصفانہ یا ظالمانہ حکم)
ندانم چہ روی داد کہ چون نیمہ میعاد سپری شد، مجسٹریت را دل بہم آمد
پھر معلوم نہیں کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گذر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا
وخود از صدر نسخ حکم خویش و رستگاری من خواست
اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ کی

(یہ ترجمہ بھی ناقص ہے، ہونا یہ چاہیے کہ اس نے خود صدر عالت سے اپنے حکم کی منسوخی اور میری رہائی کے لیے لکھا، درخواست کی)

خواہش وی پذیرفتند بلکہ اورا بدین خواہش ثنا گفتند

اور وہاں سے حکم رہائی آ گیا اور حکام صدر نے ایسی رپورٹ بھیجنے پر اس کی بہت تعریف کی

(خواہش وی پذیرفتند، وہاں سے حکم رہائی آ گیا، یہ مفہوم تو ہو سکتا ہے، ترجمہ نہیں، ترجمہ تو یہ ہوگا اس کی درخواست یا رپورٹ، جیسا کہ حالی نے ترجمہ کیا ہے، قبول کر لی گئی۔

گویند بسکہ نکویان قوم، آن خیرہ سر یعنی مجسٹریت بیدادگر را ملامت کردند۔

سنا ہے کہ رحم دل حاکموں نے مجسٹریٹ کو بہت نفرین کی

(یہاں بھی نکویان قوم کا ترجمہ ''رحم دل حاکموں'' درست نہیں، ہونا چاہیے کہ اس قوم کے نیک لوگوں نے)

و یایۂ آزادی و خاکساری مرا در نظرش جلوہ دادند، بدین رنگ کہ رہایی من ار خویش خواست، عذر خواست و دگر ہم پوزشہا و دلجویی ہا کرد۔

اور میری خاکساری اور آزادہ روی سے اس کو مطلع کیا، یہاں تک کہ اس نے خود بخود میری رہائی کی رپورٹ بھیج دی۔

(اس جملے میں ''عذر خواست و دگر ہم پوزشہا و دلجویی ہا کرد'' کا ترجمہ موجود نہیں، اس نے عذر پیش کیا، معافی مانگی اور دلجوئی کی)

و من خود از آن رو کہ ہر صفت و ہر فعل و ہر امر را از کردگار می نگرم و ستیزہ با کردگار روا نبود، از آنچہ رفت آزادم و بدانچہ رفت شادم۔

اگرچہ میں، اس وجہ سے کہ ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا، جو کچھ گذرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گذرنے والا ہے، اس پر راضی ہوں (یہاں بھی ''جو کچھ گذرا اس سے خوش اور اس کے ننگ سے آزاد ہوں'' ہونا چاہیے)

لما چون آرزو منافی آیین بندگی نیست

مگر آرزو کرنا آیین عبودیت کے خلاف نہیں، (ہونا یہ چاہیے کہ "لیکن چوں کہ آرزو کرنا آیین عبودیت کے خلاف نہیں")

اصل خط میں اس کے بعد یہ فارسی شعر ہے

عشق است و صد ہزار تمنا، مرا چہ جرم
گر خواہشی کند دلِ شیدا مرا چہ جرم

(مگر اس کا ترجمہ نہیں کیا گیا، حالانکہ اسی خط میں بعد میں ایک شعر آیا ہے، جس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔)

خواہم سپس در جہان نباشم
و اگر باشم در ہندوستان نباشم

میری آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں،

روم است و مصر است و ایران است و بغداد است و گرنہ خود کعبہ، پناہِ آزادگان و سنگِ آستانہ رحمۃ اللعالمین تکیہ گاہِ دلدادگان بس است۔

روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے، یہ بھی جانے دو، خود کعبہ آزادوں کی جاے پناہ اور آستانہ رحمۃ اللعالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے۔

(یہاں بھی "بس است" کا ترجمہ موجود نہیں۔)

کی بود کہ از بندِ فرو ماندگی کہ خود از آن بند کہ رفت، روان فرسا تر است، برون جہم و منزلی در نظر نیاوردہ سر بہ صحرا نہم

دیکھیے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے، جو اِس گذری ہوئی قید سے زیادہ جانفرسا ہے، نجات پاؤں اور بغیر اس کے کہ کوئی منزلِ مقصود قرار دوں، سر بہ صحرا نکل جاؤں

آنست آنچہ بر ما رفت

وانیست آنچہ می خواہم

یہ ہے جو کچھ کہ مجھ پر گذرا، اور یہ ہے جس کا میں آرزو مند ہوں[۸]

حالی نے دستنبو سے بھی فارسی کی اس عبارت کا اردو ترجمہ "یادگار غالب" میں دیا ہے

بہ درستی کہ راستی نہفتن شیوۂ آزادگان نیست، منِ نیم مسلمان کہ ہم از بند و پیوندِ آیین و کیش آزادم، و ہم از رنج و شکنجِ بدنامیِ خویش وارستہ، پیوستہ خوی آن داشتمی کہ بہ شب جز فرنچ ہیچ نخوردمی و اگر نیافتمی، خوابم نبردی، و در این ہنگام کہ بادۂ فرنگ در شہر بسیار گران است و من تہی دست، اگر جوانمرد، خدادوست، خداشناس، دریا دل مہیش داس بہ فرستادنِ بادۂ شکری ہندی کہ در رنگ با فرنچ برابر و در بوی از ان خوشتر ستی، بر آتشِ دل آب نزدی، جان نبردمی[۹]۔

حالی نے اس کا یہ ترجمہ کیا ہے

"سچ بات کا چھپانا آزادوں کا کام نہیں ہے۔ میں آدھا مسلمان کہ جس طرح قیدِ کیش و ملّت سے آزاد ہوں، اسی طرح بدنامی اور رسوائی کے خوف سے وارستہ ہوں، میری مدّت سے یہ عادت تھی کہ رات کو فرنچ کے سوا کچھ کھاتا پیتا نہ تھا اور اگر وہ نہ ملتی تھی تو مجھ کو نیند نہ آتی تھی۔ اگر جوانمرد، خدادوست، خداشناس، دریادل مہیش داس ہندوستانی شراب، جو رنگ میں فرنچ سے مشابہ اور بو میں اس سے بہتر تھی، مجھے نہ بھیجتا، تو میں ہرگز جاں بر نہ ہوتا"[۱۰]۔

یہاں بھی حالی نے فارسی عبارت کے اس جملے کا ترجمہ حذف کر دیا

در این ہنگام کہ بادۂ فرنگ در شہر بسیار گران است و من تہی دست۔

یہ جملہ اُس وقت غالب کی مالی بدحالی کی طرف اشارہ کرتا ہے، اس لیے اہم ہے۔ اسی طرح "بادۂ شکری ہندی" کا ترجمہ "ہندستانی شراب" کیا ہے، حالانکہ یہاں شکر کی ہندستانی شراب یا اگر متن میں "بادۂ نے شکری ہندی" ہے تو گنے کی ہندستانی شراب ہونا چاہیے۔

قاطع برہان کے آخر میں غالب نے چند فوائد لکھے ہیں۔ حالی نے ان میں سے فائدۂ اوّل

کا ماحصل اردو میں دیا ہے۔ یہاں ضروری نہیں تھا کہ حالی اس فائدے کے ہر جملے کا مقصد و منہاج اپنے ماحصل میں شامل کریں، یہی انہوں نے کیا بھی ہے۔

غالب کی فارسی غزل پر تبصرہ کرتے ہوئے حالی نے غالب کے فارسی دیوان کے خاتمے سے اس عبارت کا اردو ترجمہ لکھا ہے

ہر چند منش کہ یزدانی سروش است، در سر آغاز نیز گزیدہ گوی، پسندیدہ جوی بود، لما بیشتر از فراخ روی پی جادہ شناسان برداشتی وکژی رفتار آنان رالغزشِ مستانہ انگاشتی، تاہم در آن تگاپو پیش خرامان را بہ فرخندگی ارزش ہمقدمی کہ درمن یافتند، مہر جنبید و دل از آزرم بہ درد آمد۔ اندوہ آوارگی ہای من خوردند و آموزگارانہ در من نگرستند۔ شیخ علی حزین بہ خندۂ زیر لبی بیراہہ روی ہای مرا در نظرم جلوہ گر ساخت و زہر نگاہ طالب آملی و برق چشم عرفی شیرازی مادۂ آن ہرزہ جنبش ہای ناروا در پای رہ پیمای من سوخت۔ ظہوری بہ سر گرمی گیرائی نفس حرزی بہ بازوی و توشہ ای بہ کمرم بست۔ نظیری لاابالی خرام بہ ہنجار خاصۂ خودم بہ چالش آورد۔ اکنون بہ یمن فرۂ پرورشِ آموختگی این گروہ فرشتہ شکوہ کلکِ رقاص من بہ خرامشِ تدرو است و بہ رامش موسیقار، بہ جلوہ طاوس است و بہ پرواز عنقا۔

اس عبارت کے ترجمے میں بھی حالی نے اُس دقت نظر اور توجہ سے کام نہیں لیا جو ضروری تھا۔ بیشتر الفاظ کا ترجمہ موجود نہیں اور انداز وہی ہے جو انہوں نے غالب کی فارسی عبارتوں کا خلاصہ یا ماحصل پیش کرنے میں اپنایا ہے۔ اس عبارت کا حالی نے جو ترجمہ کیا، وہ درج ذیل ہے

اگر چہ طبیعت ابتدا سے نادر اور برگزیدہ خیالات کی جویا تھی، لیکن آزادہ روی کے سبب زیادہ تر اُن لوگوں کی پیروی کرتا رہا جو راہ صواب سے نابلد تھے۔ آخر جب ان لوگوں نے، جو اس راہ میں پیشرو تھے، دیکھا کہ میں باوجودیکہ ان کے ہمراہ چلنے کی قابلیت رکھتا ہوں اور پھر بے راہ بھٹکتا پھرتا ہوں، ان کو میرے حال پر رحم آیا اور انہوں نے مجھ پر مربیانہ نگاہ ڈالی۔ شیخ علی

حزیں نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھ کو جتائی۔ طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادّہ جو مجھ میں تھا، اس کو فنا کر دیا۔ ظہوری نے اپنے کلام کی گیرائی سے میرے بازو پر تعویذ اور میری کمر پر زادِ راہ باندھا اور نظیری نے اپنی خاص روش پر چلنا مجھ کو سکھایا۔ اب اس گروہ والا شکوہ کے فیضِ تربیت سے میرا کلکِ رقاص چال میں کبک ہے تو راگ میں موسیقار، جلوے میں طاؤس ہے تو پرواز میں عنقا[۱۲]۔

پنج آہنگ میں شامل غالب کے فارسی خطوط کا اردو ترجمہ غالباً سب سے پہلے محمد عمر مہاجر صاحب نے کیا تھا جو مارچ ۱۹۶۱ء میں کراچی سے شائع ہوا ہے۔ مہاجر صاحب نے ترجمے میں متن کے تمام مطالب کو سمو دینے کے بجائے اردو عبارت کی نوک پلک درست کرنے پر زیادہ زور دیا ہے اور وہ اس عمل میں کامیاب ہیں۔ اس طرح ان کا ترجمہ ایک لحاظ سے ان کے سلیقے کے مطابق خطوط کا خلاصہ ہے جو رواں، مربوط اور سلیس اردو میں پیش کیا گیا ہے۔ اس ترجمے میں بہر حال متن کے بعض ضروری الفاظ و مطالب کا مفہوم نظر نہیں آتا جو ترجمے کے بنیادی اصول کے منافی ہے اور جس کی وجہ سے ترجمہ ناقص کہلائے گا۔ سبط حسن صاحب نے مہاجر صاحب کے ترجمے پر اپنی پیشگفتار میں یہی بات اپنے ڈھنگ سے اس طرح کہی ہے

> ہم یہ نہیں کہتے کہ عمر مہاجر صاحب کا ترجمہ حرف آخر ہے یا یہ کہ انہوں نے فارسی عبارت کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کیا ہے، کیونکہ یہ قریب قریب محال تھا، لیکن یہ ضرور ہے کہ محمد عمر مہاجر صاحب نے یہ دشوار کام بڑے خلوص اور کاوش و محنت سے سرانجام دیا ہے۔ لطف یہ ہے کہ انہوں نے غالب کے اسلوب بیان کی دلکشی میں مطلق فرق نہیں آنے دیا ہے، چنانچہ پنج آہنگ کے ترجمے کو اردوے معلّٰی کے

خطوط میں شامل کر دیا جائے تو اصل اور ترجمے میں تمیز کرنا
مشکل ہو جائے گا[۳۱]۔

غالب نے نواب مصطفیٰ خان کو ان کی طرف سے بھیجے گئے آم کے آٹھ ٹوکروں کی رسید میں ایک خط لکھا تھا، جس کا متن درج ذیل ہے

ولی نعمتِ طوطیانِ شکر خا، سلامت

ہنوز گل افشانیِ گلبنِ التفات شش جہت را بہ غالیہ بیزیِ بوی گل فرا گرفتہ بود، یعنی نشاطِ ورودِ بہارینِ صحیفہ از دل بدر نرفتہ بود کہ نخلِ برومندِ تفقد افشاندنِ بار آغاز کرد و رسیدنِ ہشت سبد انبہ در روضہ ہای فردوس بہ روی آرزو باز کرد۔ زہی انبہ ہای پاکیزۂ شیرین، از برون سو بہ شیر شستہ و از درون سو بہ شکر انباشتہ، بہ تازگی آب از چشمۂ خضر و باد از دمِ مسیح خوردہ و بہ شیرینی گوی از شکر و دل از خسرو بردہ۔ بہ پاکیزگی گوہرِ آبروی خانوادۂ ابر و ہوا و بہ دلآویزی پیکرِ چشم و چراغِ دودۂ برگ و نوا۔ ابرِ نیسان تا ازین گرانِ ارز ثمر دستمزدِ عرق ریزیِ سعی نجست، دفتر از حسابِ زیان زدگیہای روزگار گہر سازی نتوانست شست۔ انگور اگر در ریشگی دانستی کہ آب گشتن و بادۂ ناب گشتن دیگر است و چاشنیِ خدا آفریدِ این شیرۂ پاک دیگر، ہرگز آب نخوردی و بار نیاوردی تا درین ساختگی بہ مردم دردِ سر ندادی۔ نیشکر اگر در آغاز کار وا رسیدی کہ بہ گونہ گون فشار در آمدن و بہ سعیِ دیگران بہ صورتِ تنگِ شکر بر آمدن دیگر است و گوارائیِ ازل آوردِ این میوۂ نغز دیگر، ہرگز سر از خاک بر نکردی و بہ اندازۂ درازیِ بالای خود بہ خاک فرو رفتی تا درین نموداری بہ ابلہی انگشت نما نشدی۔ آنچہ خامۂ شکر فشان بدان رفتہ کہ ازین ثمرہای پیش رس یک نیمہ پختہ و نیمۂ دیگر ہنوز خام است، سبحان اللہ اگر میوۂ طوبیٰ در پختگی بدین رنگ و در خامی این چنین غالیہ فام است، من ضامن کہ بہشتیان بہ بادۂ طہور نگرایند و سبز پوشانِ آن روضہ نتوانند کہ دل از ہیچ کس ربایند۔ گفتم آنچہ بہ پختگی زرد گردیدہ کرشمۂ کارسازی عنایت است کہ کار بینوایان بہ فردا نگذاشت و آنچہ پیش از رسیدن رسیدہ اشارہ بہ خونگرمی

ذوق است کہ درنگ درد لجوئی رواداشت۔ دل گفت ہمانا آنچہ بہ پختگی زرد گردد، نہایت شوق است کہ من بدان خرسندم و خرسندیِ من فراوان باد و آنچہ پیش از رسیدن رسد، مژدۂ وصل است کہ من بدان آرزومندم کہ دوست مرا برزبان باد[1]۔

غالب کا یہ خط فارسی میں روایتی انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں محض عبارت آرائی اور مضمون آفرینی ہے اور وہ بھی اپنے عروج پر۔ مہاجر صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ

ولی نعمتِ طوطیان شکر خوار، سلامت

ابھی نامۂ بہاریں کی نکہتوں سے روح سرور آگیں تھی کہ نخلِ برومند سے عنایتوں کی ثمر افشانی ہونے لگی، یعنی آموں کے آٹھ ٹوکرے وصول ہوئے۔ سبحان اللہ! کیا آم ہیں۔ باہر دودھ سے دھلے ہوئے، اندر شکر میں گھلے ہوئے، جن کو چشمۂ خضر سے پانی اور نفسِ مسیح سے تازگی ملی ہے۔ جو شیرینی میں شکر سے بازی لے گئے اور جنھوں نے خودخسرو کا بھی دل موہ لیا (جو اپنی شیریں کا دلدادہ تھا) یہ آم پاکیزگی میں گوہر آبرو اور دلاویزی میں یکتا ہیں۔ ابرنیساں نے جب تک ان آموں کی آبیاری نہیں کی، اس سے زیانِ گہرسازی کی تلافی نہ ہوسکی۔ اگر انگور یہ جانتا کہ بادۂ ناب اور چیز ہے اور یہ شیرینی اور حلاوت اور، تو برومند ہونے کے خیال سے دستبردار ہوجاتا کہ بالآخر اس کی برومندی کا انجام خلق کے لیے دردسر کے سوا کچھ نہیں۔ اگر نیشکر کو شروع ہی سے علم ہوتا کہ سخت مراحل اور زحمتوں سے

گزرنے کے بعد بھی وہ حلاوت اور شیرینی جو آم ہی کا حصّہ
ہے، اس کے نصیب میں نہیں، تو مٹی سے سر نکالنے کی اسے
ہمت نہ ہوتی اور اگنے کی حماقت پر انگشت نمانہ بنتا۔ کیا کہنا
اُن آموں کا جن میں چند پکے ہوئے اور چند نیم رس ہیں۔
اگر میوۂ طوبیٰ پختگی اور خامی میں اِس کے برابر ہوتا تو میرا
ذمّہ کہ اہل جنّت شراب طہور کو بھول جاتے اور سبز پوشانِ
جنّت کی طرف ملتفت نہ ہوتے، یہ جو پختہ اور نیم رس پھل
بھیجے ہیں، یہ بھی آپ کی کرشمہ سازی ہے، جو پھل پختگی میں
زرد ہیں، انہوں نے بے نواؤں کو کل کے انتظار کی زحمت
سے بچالیا اور جو نیم رس ہیں، ان کا مقصد یہ ہے کہ مشتاقوں
کی تسلّی اور دلجوئی ہوتی رہے۔ یہ زردی گویا نہایتِ شوق کا
مظہر ہے کہ میں خوش ہوں اور ہوتا رہوں اور نیم رسی مژدۂ
وصل ہے جس کا میں آرزومند ہوں [۱۵]۔

مہاجر صاحب کے بعد جناب ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحب نے بھی پنج آہنگ میں خطوط غالب کا اردو ترجمہ کیا ہے جو اردو اکادمی سے ۱۹۹۲ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا ہے۔ تنویر صاحب نے مہاجر صاحب کا ترجمہ نہیں دیکھا تھا۔ ان کا ترجمہ ہر لحاظ سے مہاجر صاحب کے ترجمے سے مختلف ہے۔ تنویر صاحب کے ترجمے کی کیفیت خود ان کی زبانی سنیے

میں نے غالب کے اسلوبِ نگارش اور طرز ادا کو
زیادہ سے زیادہ پیش نظر رکھنے کی سعی کی ہے اور ان کے
بعض ایسے الفاظ کو باقی رکھا ہے، جن کو وہ اپنے فکری اظہار کا
زیادہ موثر و موزوں وسیلہ تصور کرتے تھے، اسی لیے میں نے

مناسب حدود میں رہتے ہوئے فارسی الفاظ اور خوش رنگ و
خوش آہنگ ترکیبوں سے شعوری طور پر اجتناب نہیں کیا۔
ممکن ہے اس کی وجہ سے ترجمے کی زبان قدرے مشکل
معلوم ہو، مگر یہ غالب کے اسلوب فکر اور انداز نگارش سے
نسبتاً زیادہ قریب ہے، اگر چہ ترجمہ اپنی گوناگوں کوتاہیوں
کے باوصف غالب کے فارسی خطوط تک پہنچنے میں معاون
نظر آئے تو میں اسے اپنی کامیابی تصور کروں گا۔[۱۱]

ڈاکٹر تنویر علوی صاحب نے اپنے ترجمے کے بارے میں ان توضیحات کی روشنی میں مصطفیٰ
خان بہادر کے نام اسی خط کا جو ترجمہ کیا ہے وہ درج ذیل ہے

طوطیاں شیریں سخن کے ولی نعمت، ہنوز گلشن التفات کی گل
باریوں کے باعث شش جہت میں بہار تازہ کی خوشبوئیں
بکھری ہوئیں تھیں، یعنی صحیفۂ بہاریں کے ورود کی
شادمانیاں فضائے دل سے رخصت نہ ہوئی تھیں کہ شجر مہر و
محبت نے دوبارہ لطف و کرم کے ساتھ ثمر افشانیاں شروع
کر دیں۔ آموں کے آٹھ ٹوکرے پہنچے اور میری آرزو
خرامی پر آٹھ بہشتوں کے دروازے کھول گئے۔

یہ پاکیزہ اور شیریں آم اے سبحان اللہ! شکل دیکھو تو
دودھ سے دھلے ہوئے اور سیرت کا خیال کرو تو شہد میں
گھلے ہوئے، تازگی پر نظر کیجئے تو آب حیات کی لطافت
کا گمان ہو اور یہ خیال گزرے کہ انہیں دمِ مسیح کے لطفِ
تاثیر نے پرورش کیا ہے۔ اپنی شیریں صفات میں وہ شکر

سے بڑھ گئے اور انہوں نے خسرو پرویز کا دل جیت لیا۔
غرض کہ آم اپنی پاکیزہ گوہری کے باعث ابروباد کے
خانوادے کی آبرو ہے اور اپنے حسن پیکر کے اعتبار سے
دودمانِ شاخ وشجر کا چشم وچراغ۔

ابر نیساں نے جب تک اس گراں بہا ثمر کی صورت
میں اپنی عرق ریزیوں کا صلہ نہ پایا، زمانے کی زباں زدگی کی
رُو سے وہ اپنے دفتر آمال کو آبِ گہر سے نہ دھو سکا اور موتی
برسانے والا بادل نہ بنا۔

رگِ تاک اگر یہ جانتی کہ آب بننے کا مطلب کچھ
اور ہے اور بادۂ ناب بننے کے معنی کچھ اور، تو اس شیرۂ لطیف
کی چاشنی سے ہرگز آب دار نہ بنتی اور ثمر آفریں نہ سمجھی جاتی
جب تک اس صورت پذیری کے عمل میں وہ لوگوں کو
دردسر نہ دیتی۔

فتار وافسردگی کی بات الگ ہے اور اس میوۂ نغز کی
خوش ذائقگی اور لطافت ایک امرِ دیگر۔ نخل خرما ہرگز خاک
سے سر نہ اٹھاتا اور اپنے قد بالا کی درازی کے لحاظ سے زمین
پر گر کر فروتنی کا اظہار نہ کرتا جب تک کہ اپنی اس نمود بے
بود کے لیے ابلہی سے منسوب نہ ہوتا اور انگشت نمائے خلق نہ
بنتا۔ زبانِ خامہ کی شکرفشانی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اِس
کے ثمرہائے پیش رس، اس میں آدھے کچے اور آدھے پکے
ہیں۔

سبحان اللہ! شاخ طوبے کا میوہ اگر پختگی میں بھی
خوش رنگی رکھتا ہے اور خامی میں بھی دل آویز خوشبو تو میں ضامن
کہ اہل بہشت ہرگز شرابِ طہور کی طرف مائل نہ ہونگے۔ اور
باغِ بہشت کے سبز پوش کسی کا دل نہ چرا سکیں گے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر پختہ ہو کر یہ سنہرے رنگ میں نہ
بدل جائے جو ایک کرشمہ کارسازی و عنایت ہے کہ بے
نواؤں کے کام کو روزِ فردا پر نہیں چھوڑا گیا اور اُن کی آرزو کی
یہیں تکمیل ہو گئی۔ یہ پھل جو اپنے پہنچنے کے وقت سے پہلے
پہنچ گئے ہیں وہ گرمیِ خون و ذوقِ تپش کے باعث ہے کے
دل جوئی میں کسی نوع کی تاخیر روا نہیں رکھی گئی۔

دل نے کہا کہ اس رمز کو یوں بھی خاطر نشان
کیا جا سکتا ہے کہ جو پختگی کے بعد زرد ہوتا ہے وہ نہایتِ
شوق ہے کہ میں اس پر خوش ہوں۔ یہ ایزدی عنایت مجھ پر
فراوانی کے ساتھ ہو اور جو وقت آنے سے پیش تر آ گئے، وہ
گویا مژدۂ وصل لے کر آئے ہیں کہ میں اس کا آرزومند
ہوں کہ میرا نام دوست کی زبان پر رہے۔

اب آخر میں عرض یہ کرنا ہے کہ غالب کے منثور فارسی آثار کا سب سے پہلے تو متن باقاعدہ مرتب ہو، تاکہ ان کے اردو تراجم کو قطعی صورت دی جا سکے۔ اسی طرح یہ فارسی متون اس انداز سے اردو میں منتقل کیے جائیں کہ اس کام میں حالی کی طرح نہ بے توجہی برتی جائے، نہ مہاجر صاحب کی طرح، متن کے بعض حصّوں کو نظرانداز کر کے، محض اردو ترجمے پر زور دیا جائے اور نہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحب کی طرح فارسی الفاظ اور خوش رنگ و خوش

آہنگ ترکیبوں کو ترجمے میں بہ عینہ سمونے اور اس کو غالب کے اسلوب فکر اور انداز نگارش سے نسبتاً زیادہ قریب رکھنے پر اصرار کی وجہ سے، ترجمہ مشکل معلوم ہو۔

غالب کے منثور فارسی آثار کے موضوعات مختلف ہیں۔ ان کے تراجم میں بھی مختلف طریقوں اور اسالیب سے کام لینا ہوگا۔ بہر حال مترجم کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ترجمے میں غالب کے تمام مطالب کسی نہ کسی انداز سے منتقل کر دیے جائیں اور اس کام میں اردو زبان کے مزاج کا لحاظ رکھنا لازمی ہے۔

حواشی

۱۔ یادگار غالب، خواجہ الطاف حسین حالی، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ۱۹۹۶ء، ص ۳۴۷

۲۔ ایضاً، دیباچہ، ص ۳

۳۔ ایضاً، ص ۳

۴۔ مہر، غلام رسول، غالب، نولکشور، ص ۱۹

۵۔ یادگار غالب، دیباچہ، ص ۲

۶۔ ایضاً، ص ۲۹

۷۔ ایضاً، ص ۲۹۔۳۰

۸۔ غالب کا یہ خط "باغ دودر" (ص ۱۴۹) میں شامل ہے جو وزیر الحسن عابدی کی تصحیح سے ۱۹۷۰ء میں لاہور سے شائع ہوئی ہے۔

۹۔ دستنبو، غالب، بمبئی، ۱۹۶۹ء، ص ۳۹

۱۰۔ یادگار غالب، ص ۴۰

۱۱۔ پنج آہنگ، غالب، تصحیح وزیر الحسن عابدی، لاہور ۱۹۶۹ء، ص ۱۳۹

۱۲۔ یادگار غالب، ص ۲۰۳۔۲۰۴

۱۳۔ پنج آہنگ (آہنگ پنجم)، غالب کے فارسی خطوط کا ترجمہ، محمد عمر مہاجر، کراچی، ۱۹۶۹ء، ص ف

۱۴۔ پنج آہنگ، غالب، ص ۲۳۱

۱۵۔ پنج آہنگ، ترجمہ محمد عمر مہاجر، ص ۳۴۔۳۵

۱۶۔ اوراق معانی، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، اردو اکادمی، دہلی ۱۹۹۲ء، ص ۴۷

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۶۲۔۱۶۳

کاظم علی خاں

مولانا حالیؔ اور حلقۂ اودھ پنچ

خواجہ الطاف حسین حالیؔ (۱۸۳۷ء تا ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء) علی گڑھ تحریک کے اُن سربرآوردہ رہنماؤں میں شامل ہیں جن پر خود بانیِ تحریک سرسید احمد خاں بجا طور پر فخر کرتے تھے۔ سرسید نے مُسدسِ حالی کے بارے میں لکھا ہے "بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے اعمال حسنہ میں سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا تو کیا لایا، تو میں کہوں گا حالی سے مُسدس لکھوالایا ہوں اور کچھ نہیں[۱] "مولانا حالیؔ کی ادبی زندگی کی تشکیل و تعمیر میں معاون عوامل و محرکات پر بات کرتے وقت سرسید سے حالیؔ کی ملاقات کے واقعے کو فراموش نہ کرنا چاہیے۔ یادگارِ حالی (ص ۱۱۰) میں صالحہ عابد حسین کا بیان ہے کہ حالیؔ چالیس سال کے سن میں سرسید سے پہلی بار ملے تھے۔ گویا حالیؔ (متولد ۱۸۳۷ء) کی سرسید سے پہلی ملاقات ۱۸۷۷ء میں ہوئی ہوگی لیکن خود مولانا حالیؔ نے حیاتِ جاوید میں سرسید سے اپنی پہلی ملاقات کو ۱۸۶۷ء یا ۱۸۶۸ء کا واقعہ قرار دیا ہے[۲]۔

سرسید اور حالیؔ کی ملاقات کے بارے میں ڈاکٹر سید عابد حسین کا یہ یادگار قول بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ "سرسید کی بدولت قوم کو شاعر مل گیا اور شاعر کو قوم"[۳]۔ سرسید سے

ملاقات اور علی گڑھ تحریک سے وابستگی نے حالی کی ادبی زندگی کو جن دوررس اثرات سے ہم کنار کیا، حالی شناسوں کی اِس علمی محفل میں اُس کی تفصیل بیان کرنا تحصیل حاصل کی مثال ہوگی۔ حالی کے ادبی آثار پر سرسید کے افکار و نظریات کے اثرات کا اعتراف کرنے والے صاحبانِ قلم کی خاصی طویل فہرست میں ڈاکٹر عبدالقیوم، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ اور ڈاکٹر منظر اعظمی کے نام شامل ہیں۔

ڈاکٹر عبدالقیوم اپنی پی۔ ایچ۔ ڈی کی تھیسس "حالی کی نثر نگاری" میں رقم طراز ہیں "سرسید کے خیالات کو تصنیف و تالیف کے ذریعے پیش کرنے والوں میں حالی کا نام سب سے نمایاں ہے۔"[۴]

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کا بیان ہے

> "سرسید سے حالی کی ملاقات سب سے پہلے نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے ہم راہ ہوئی۔ اس کے بعد وہ عمر بھر سید صاحب کے مداح رہے۔ مسدس حالی کے دیباچے میں انہوں نے سید صاحب کے اثرات کا بہ تفصیل تذکرہ کیا ہے اس کے علاوہ انہوں نے دوسری علمی خدمات بھی سید صاحب کی ترغیب و تشویق اور حوصلہ افزائی کی وجہ سے انجام دیں۔ غرض اِس میں کچھ شک نہیں کہ حالی کی حقیقت نگاری، متانت، افادیت پسندی اور اسلوبِ بیان میں مدعا نگاری اور مطلب نویسی بہت حد تک سرسید کی رفاقت اور محبت کے زیرِ اثر ہے[۵]"

اِس سلسلے میں ڈاکٹر منظر اعظمی کے ڈی۔ لٹ کے تحقیقی مقالے کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ ہو

"علی گڑھ تحریک سے متاثر شعرا میں حالی پیش پیش تھے۔ حالی لاہور سے جدید نظم کی روایت لے کر دہلی پہنچے تھے۔ بالآخر سرسید کی تحریک کے ایک مؤثر اور فعال رکن کی حیثیت سے اِن خیالات کو پیش کرنے لگے۔ مقدمۂ شعروشاعری علی گڑھ تحریک ہی کے بنیادی اصولوں کی تشریح وتفسیر ہے۔ مثنویاتِ حالی کی تقریباً تمام نظمیں علی گڑھ تحریک ہی کے زیرِ اثر لکھی گئیں۔ سوائے "جواں مردی کا کام" جو ایک انگریزی نظم سے ماخوذ ہے۔ بقیہ نظمیں برکھارت، نشاطِ امید، حبِّ وطن، مناظرہ رحم و انصاف، تعصب و انصاف، کلمۃ الحق، مناجاتِ بیوہ، پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ، دولت اور وقت کا مناظرہ اور حقوقِ اولاد یہ سبھی سرسید کے اصول وعقائد ہی کی بازگشت ہیں۔ حالی نے علی گڑھ کالج اور علی گڑھ تحریک کے علاوہ خود سرسید کی مدح میں معمارِ قوم، محسنِ قوم، سید احمد کی مخالفت کی وجہ، سرسید حیدرآباد میں، ایک پیکرِ انسانیت اور یادگارِ سرسید جیسی نظمیں لکھیں۔ حالی نے معاشی اور معاشرتی اصلاح کے سلسلے میں بھی نظمیں لکھیں۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ اور مسلمانوں کی تعلیم، علی گڑھ کالج کیا سکھاتا ہے، تنگِ خدمت، فلسفۂ ترقی وغیرہ نظمیں بھی اِس سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ اِن ساری نظموں میں علی گڑھ تحریک کی روح جمالی جلوہ گر نظر آتی ہے"[۱۱]

حالی کے ادبی آثار میں سر سید کے افکار اور علی گڑھ تحریک کے نظریات کا جو غلبہ ملتا ہے اُس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ حلقے اور عناصر جو سر سید اور علی گڑھ تحریک کے مخالف تھے، مولانا حالی کے بھی دشمن بن گئے۔ علی گڑھ تحریک اور مولانا حالی کی مخالفت کرنے والے حلقوں میں اخبار اودھ پنچ لکھنؤ قابلِ ذکر ہے۔

صحافتی طنز و مزاح کا شاہکار ہفتہ وار اخبار اودھ پنچ سرزمین لکھنؤ سے یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو نکلا اور اس اخبار کا اختتامی شمارہ ۱۹۳۴ء میں چھپا تھا۔ درمیان میں یہ اخبار ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۵ء تک تین سال کے عرصے کے لیے عارضی طور پر بند بھی رہا تھا لیکن پھر ممتاز حسین عثمانی کی ادارت میں ۱۹۱۶ء سے یہ دوبارہ جاری ہو کر ۱۹۳۴ء تک زندہ رہا تھا۔ اِس طرح اودھ پنچ لکھنؤ، مجموعی طور پر کم و بیش ۵۲ سال تک جاری رہا تھا[۳]۔ اودھ پنچ لکھنؤ کے بانی اور مُدیرِ اوّل منشی سجاد حسین (دورِ حیات ۱۸۵۶ء تا ۲۲ جنوری ۱۹۱۵ء) قصبۂ کاکوری، ضلع لکھنؤ کے باشندے تھے۔ وہ ۱۸۸۷ء سے انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو کر اپنی وفات تک اِس سیاسی جماعت سے وابستہ رہے تھے[۴] اور انہوں نے اپنے اخبار کے ذریعے کانگریس کے نظریات کی زبردست حمایت کی تھی۔ مُدیرِ اودھ پنچ منشی سجاد حسین کی اس کانگریس دوستی کے برعکس کانگریس کے لیے سر سید کی مخالفانہ روش پر خود مولانا حالی نے حیاتِ جاوید (ص ص ۲۵۱ تا ۲۶۴) میں نہ صرف تفصیل سے روشنی ڈالی ہے بلکہ سر سید کی کانگریس مخالف روش پر اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کیا ہے۔ غالب ایوارڈ یافتہ مزاح نگار احمد جمال پاشا مرحوم نے حلقۂ اودھ پنچ کے بارے میں لکھا ہے

> ''اودھ پنچ اور اُس کے ظریفوں کی حب الوطنی، انگریز دشمنی، مغرب سے نفرت، کانگریس پرستی، غلامی کے خلاف جدوجہد اور آزادی کے لیے کوشش ایک عظیم قومی کارنامہ ہے۔ اودھ پنچ کی تحریک ایک قومی تحریک تھی۔ اس کی

داستان اپنی قوم کا عظیم الشان رزمیہ ہے جسے ہمیشہ فخر کے ساتھ پیش کیا جاتا رہے گا۔[۱۰]"

اودھ پنچ لکھنؤ میں لکھنے والے معاونین کا جو حلقہ تیار ہوا اُس میں شاعر اور نثر نگار دونوں شامل تھے۔ حلقۂ اودھ پنچ میں یہ نام ملتے ہیں[۱۱]

۱۔ نوّاب سید محمد آزاد (۱۸۴۶ء تا ۱۱ر دسمبر ۱۹۱۶ء)
۲۔ اکبر حسین اکبرالہ آبادی (نومبر ۱۸۴۶ء تا ستمبر ۱۹۲۱ء)
۳۔ منشی جوالا پرشاد برقؔ (اکتوبر ۱۸۶۲ء تا مارچ ۱۹۱۱ء)
۴۔ مرزا مچھو بیگ ستمؔ ظریف (۱۸۳۱ء تا ۱۸۹۴ء)
۵۔ منشی سجاد حسین کاکوری (۱۸۵۶ء تا جنوری ۱۹۱۵ء)
۶۔ پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ (جون ۱۸۴۶ء تا جنوری ۱۹۰۲ء) اودھ پنچ کے ابتدائی دور میں اس کے معاون رہے تھے۔
۷۔ منشی احمد علی شوق قدوائی (متوفی اپریل ۱۹۲۵ء)
۸۔ پنڈت تربھون ناتھ ہجرؔ (۱۸۵۳ء تا مارچ ۱۸۹۲ء)

اِن معاونین کے علاوہ اودھ پنچ لکھنؤ میں کچھ لکھنے والے ایسے افراد بھی تھے جو فرضی ناموں سے لکھا کرتے تھے۔ اِن لوگوں میں یہ نام شامل ہیں مولانا دکنی، مسٹر لافر، زاغ بدایونی، سلطان ظریف، ش۔ ع کاکوری۔ ا۔ ع مدہوش بمبئیؔ، حضرت لکھنوی، ع۔ غ فیض آبادی۔ سخا۔ م۔ ع ایٹھوی۔ ع۔ و۔ فاروقی، ڈاکٹر ندیم نیز ظریفِ ہند[۱۲]۔

اودھ پنچ لکھنؤ نے یوں تو اپنے دور کے رنگا رنگ موضوعات پر انبار در انبار طنزیہ و مزاحیہ مضامین و منظومات شائع کرائے لیکن مغرب پرستی پر طنز و مزاح کے وار کرنا اس کا خاص وطیرہ تھا۔ اس کے علاوہ علی گڑھ تحریک اور اس سے وابستہ افراد و اشخاص کی مخالفت بھی

حلقۂ اودھ پنچ کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ چنانچہ علی گڑھ تحریک کی قد آور ادبی شخصیت مولانا حالی حلقۂ اودھ پنچ کی معرکہ آرائیوں کا ہدف بننے سے نہ بچے۔ حالی ادب میں افادیت کے اس درجہ قائل تھے کہ اُن کے نزدیک یہ ضروری تھا کہ بات چاہے مزے کی نہ ہو لیکن کام کی ضرور ہو۔ حالی کے اس طرزِ عمل پر اودھ پنچ لکھنؤ (مؤرخہ ۷ر جولائی ۱۹۹۸ء) میں اکبر الہ آبادی کا یہ طنز ملاحظہ ہو۔

" ہمارے مولانا حالی صاحب بھی کسی زمانے میں اچھے شاعر تھے لیکن حضرت نے اب حُسنِ خیال کی دُھن میں حُسنِ زبان سے قطع نظر کی ہے اور حسنِ خیال کو اس قدر روندا ہے کہ حُسن جاتا رہا اور خیال ہی خیال رہ گیا ہے "[۱۱]

پنڈت کشن پرشاد کول نے گلدستۂ پنچ کے عنوان سے ۱۹۱۵ء میں اودھ پنچ لکھنؤ کے بعض مشمولات کا انتخاب شائع کرایا تھا۔ گلدستۂ پنچ میں برج نرائن چکبست لکھنوی نے اپنے دیباچے میں اودھ پنچ میں چھڑنے والے جن چار ادبی معرکوں کی نشاندہی کی ہے، ان میں سے ایک معرکہ مولانا حالی پانی پتی کے خلاف بھی چھیڑا گیا تھا۔ اس سلسلے میں چکبست لکھنوی کا بیان ہے

" اودھ پنچ کا دوسرا وار مولانا حالی کو سہنا پڑا۔ مولانا موصوف کے دیوان کے مقدمے میں شاعری کے اصلی مفہوم پر بحث کی گئی ہے۔ جب یہ مقدمہ شائع ہوا تو اس بحث نے اودھ پنچ کی بارود کے لیے چنگاری کا کام کیا۔ اودھ پنچ کو مولانا حالی سے دو شکایتیں تھیں۔ پہلا اعتراض تو یہ تھا کہ مولانا حالی کا شاعری کا مفہوم غلط ہے۔ جس کو وہ شاعری سمجھتے ہیں وہ محض قافیہ پیمائی ہے اور فطرتی (فطری)

شاعری کی لطافت و رنگینی سے خالی ہے۔ اختلاف کی
دوسری وجہ یہ تھی کہ مولانا حالی نے اپنے مقدمے میں
مصنوعی اور خلافِ فطرت شاعری کی جس قدر مثالیں دی
تھیں اُن کا کثیر حصّہ لکھنؤ کے شعرا کے کلام سے لیا تھا جس کا
لازمی منشا اودھ پنچ کے نزدیک یہ تھا کہ لکھنؤ کے شعرا کی
توہین ہو۔ ان خیالات کا دلوں میں امنڈ نا تھا کہ دیوان اور
مقدمے پر اعتراضات کی بوچھار شروع ہوگئی اور یہ
سلسلہ بھی مدّت تک جاری رہا۔ جس عنوان سے اودھ پنچ
کے شہہ سواروں نے پانی پت کے میدان میں طرارے
بھرے ہیں وہ بعض صورتوں میں قابلِ اعتراض ضرور ہے
مگر نفسِ مضمون کو دیکھتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ اودھ پنچ
کی شکایت بے بنیاد نہ تھی [۱۱]۔"

حاؔلی کے خلاف اودھ پنچ کی اِس مہم پر بابائے اردو مولوی عبدالحق کا یہ بیان پیش
کرنا بھی بے محل نہ ہوگا

" سرسید تو خیر اس زمانے میں موردِ لعن وطعن تھے ہی اور
ہر کس وناکس اُن کے منہ پر آتا تھا لیکن اس کے بعد جس پر
سب سے زیادہ اعتراض کی بوچھار پڑی وہ حاؔلی تھے۔ ایک
تو ہر شخص جس کا تعلق سید احمد خاں سے تھا، یوں ہی مردود
سمجھا جاتا تھا اُس پر اُن کی شاعری جو عام رنگ سے جُدا تھی
اور نشانۂ ملامت بن گئی تھی اور مقدمۂ شعروشاعری نے تو
خاصی آگ لگادی۔ اہلِ لکھنؤ اِس معاملے میں چھوئی موئی

سے کم نہیں، وہ معمولی سی تنقید کے بھی روادار نہیں ہوتے۔
انہیں یہ وہم ہو گیا کہ یہ ساری کاروائی انہیں کی مخالفت میں
کی گئی ہے۔ پھر کیا تھا ہر طرف سے نکتہ چینی اور طعن وتعریض
کی صدا آنے لگی۔ اودھ پنچ میں ایک طویل سلسلۂ مضامین
مقدمے کے خلاف مدّت تک نکلتا رہا جو ادبی تنقید کا عجیب
وغریب نمونہ تھا۔ وہ صرف بے تک اور مہمل اعتراضات ہی
کا مجموعہ نہ تھا بلکہ پھکڑ اور پھبتیوں تک نوبت پہنچ گئی تھی۔
جن مضامین کے عنوان (ایسے ہوں)

ابتر ہمارے حملوں سے حالؔی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پامال ہے

تو اس سے سمجھ لیجیے کہ اس عنوان کے تحت کیا کچھ
خرافات نہ بکی گئی ہوگی۔ مولانا یہ سب کچھ سہتے رہے لیکن
کبھی ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا

کیا پوچھتے ہو کیوں کر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انہوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

لیکن آخر ایک وقت آیا کہ نکتہ چیوں کی زبانیں
بند ہو گئیں اور وہی لوگ جو انہیں شاعر تک نہیں سمجھتے تھے،
ان کی تقلید کرنے لگے

غُل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں" [۱۱]

یہاں مولوی عبدالحق کا یہ ارشاد ترمیم کا طالب ہے کہ اودھ پنچ میں مولانا حالؔی کی
کتاب "مقدمہ شعروشاعری" طعن وتعریض کا نشانہ بنی تھی۔ مولانا حالؔی پر اودھ پنچ لکھنؤ

میں ہونے والی ہنگامہ آرائی دراصل ''دیوانِ حالؔی'' کی پہلی اشاعت میں شامل حالؔی کے اُس طویل مقدمے پر ہوئی تھی جو ۱۸۹۳ء میں اُس وقت چھپا تھا جب مولانا حالؔی زندہ تھے۔ دیوانِ حالؔی کا یہی مقدمہ بعد میں ''مقدمۂ شعروشاعری'' کے عنوان سے ایک علاحدہ کتاب کی صورت میں پہلی بار ۱۹۲۰ء میں اُس وقت چھپا تھا جب ۳۱ردسمبر ۱۹۱۴ء کو مولانا حالؔی وفات پا چکے تھے [۵]۔ ان حالات میں حالی کی زندگی کے دوران ہونے والی معرکہ آرائی ''مقدمۂ شعروشاعری'' جیسی کتاب پر کیسے ہوسکتی تھی جو وفاتِ حالؔی کے بعد ۱۹۲۰ء میں چھپی ہو؟

حلقۂ اودھ پنچ حالؔی پانی پتی کے لیے جس طرح ''نرغۂ اعدا'' بنا ہوا تھا اس کا حال یادگارِ حالؔی میں یوں بیان کیا گیا ہے

> ''مقدمۂ شعروشاعری نے تو آگ ہی لگادی ہر طرف اعتراض، نکتہ چینی اور لعن طعن کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا اخباروں میں اُن کے خلاف مضامین لکھے جاتے۔ اودھ پنچ ان میں سب سے پیش پیش تھا۔ مدت تک اس میں مقدمے کے خلاف مضامین نکلتے رہے۔ اِن مضامین میں صرف جابے جا اعتراض ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ پھبتیوں اور پھکڑپن سے بھی کام لیا جاتا تھا۔ خالی، خیالی، ڈفالی نامی حریف حالؔی سے مقابلے کے لیے میدان میں اُتارے گئے اور
>
> ابتر ہمارے حملوں سے حالؔی کا حال ہے
> میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے
>
> اور

اور دِلّی دِلّی کیسی دِلّی۔ پانی پت کی بھیگی بلی جیسے فقروں اور
شعروں کے حربے استعمال کیے گئے۔ حالؔی سب کچھ
پڑھتے، سنتے اور سہتے رہے۔ نہ خود اِن لایعنی باتوں
متعصبانہ اعتراضوں کا کوئی جواب دیا نہ کسی دوسرے کو
دینے دیا۔ ایک مرتبہ خواجہ غلام الحسنین مرحوم نے اور دو
ایک مرتبہ حالؔی کے اور دوستوں نے بھی اُن سے اصرار
کیا کہ ہمیں ان کا جواب لکھنے کی اجازت دیجیے مگر حالؔی نے
انہیں منع کر دیا اور کہا تو حیرت سے صرف یہ
اعتراضوں کا زمانے کے ہے حالؔی پہ (وفور)
شاعر اب ساری خُدائی میں ہے کیا ایک ہی شخص [۱۶]

اودھ پنچ لکھنؤ اپنی صحافتی زندگی کے دوران جن چار اشخاص کے خلاف ادبی معرکہ آرائیوں سے دوچار ہوا تھا اُن میں سرشارؔ، حالؔی، داغؔ اور شررؔ لکھنوی کے نام شامل ہیں۔ اودھ پنچ نے اپنی اِن چاروں معرکہ آرائیوں پر اظہارِ فخر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے

"پنچ کی تلوار کا لوہا بڑے بڑے مانے ہوئے ہیں۔ اس
کی چمک سے حالؔی کی آنکھوں میں اب تک چکا چوند کا عالم
ہے۔ سرشار بھی اس کی کاٹ کے قائل تھے۔ داغؔ اِسی
کا داغ دل پر لے گئے۔ پھر شررؔ کا کیا دم ہے۔ اک ذرا سی
چنگاری کی ہستی کیا ہے۔ اسی تلوار کا پانی اسے بجھائے
گا" [۱۷]

اودھ پنچ لکھنؤ، مؤرخہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۰۵ء میں چھپنے والا یہ بیان داغؔ دہلوی کی وفات ۱۴ فروری ۱۹۰۵ء کے بعد کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے [۱۸] اور یہ بیان اِس بات کا بھی اِثبات کرتا ہے کہ حالؔی کے خلاف حلقۂ اودھ پنچ کی معرکہ آرائی اکتوبر ۱۹۰۵ء سے قبل

کا واقعہ تھی۔ اِس معرکہ آرائی میں اودھ پنچ نے چونکہ دیوانِ حالؔی طبع اوّل، مطبوعہ ۱۸۹۳ء میں شامل مولانا حالؔی کے مقدمے کو ہدفِ ملامت بنایا تھا لہٰذا حلقۂ اودھ پنچ کی جانب سے مولانا حالؔی کے خلاف کی جانے والی یہ ادبی معرکہ آرائی ۱۸۹۳ء کے بعد اور ۱۹۰۵ء سے قبل کا واقعہ رہی ہوگی۔ دیوانِ حالؔی کا ۱۸۹۳ء میں چھپنے والا پہلا ایڈیشن میری نجی لائبریری میں موجود ہے۔ اسی میں مولانا حالؔی کا وہ مقدمہ بھی شامل ہے جو بعد کو دیوان سے الگ کر کے ۱۹۲۰ء میں علاحدہ کتابی شکل میں چھاپا گیا تھا۔

مقالے کے اختتام میں یہ عرض کرنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ حالؔی کی مخالفت میں پیش پیش رہنے والے حلقۂ اودھ پنچ نے بھی ہنسی ہنسی میں بالآخر یہ اعتراف کر لیا تھا

عیب حالؔی کے بہت تم نے گنائے اے پنچ
اشک شوئی کرو، دو چار ہنر بھی دیکھو[۹]

حواشی

۱۔ رجوع کیجیے

(۱) داستانِ تاریخ اردو، حامد حسن قادری، دہلی ۱۹۹۵ء، ص ۶۰۹، نیز ص ۶۳۱

(۲) یادگارِ حالؔی، صالحہ عابد حسین، تیسرا اڈیشن علی گڑھ، ص ۴۲ تا ۴۳

۲۔ حیاتِ جاوید الطاف حسین حالی۔ نئی دہلی ۱۹۷۹ء ص ۴۱۵

۳۔ یادگارِ حالی، ص ۴۳

۴۔ حالی کی نثر نگاری ڈاکٹر عبدالقیوم۔ لاہور ۱۹۶۴ء ص ۵۸

۵۔ سرسید اور اُن کے نامور رفقاء سید عبداللہ۔ علی گڑھ ۱۹۹۴ء ص ۱۰۱ نیز دیکھیے ڈاکٹر عبداللہ کی انگریزی کتاب
The Spirit and Substance of Urdu Prose under the influence of Sir Sayyid Ahmad Khan
S M Abdullah, Lahore 1940, p 77

۶۔ اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ منظر اعظمی۔ لکھنؤ ص ۲۴۳

۷۔ بہ حوالۂ معاونین اودھ پنچ ڈاکٹر سید مصباح الحسن قیصر۔ لکھنؤ ۱۹۸۴ء ص ۱۰ تا ۱۲

۸۔ ر۔ ک (۱) اردو طنز و ظرافت اور منشی سجاد حسین ڈاکٹر مصباح الحسن قیصر۔ لکھنؤ ۱۹۷۸ء ص ۱۰۵

(۲) اودھ پنچ کی ادبی خدمات ڈاکٹر محمد عبدالرزاق فاروقی۔ کرنول آندھرا پردیش۔ اگست ۱۹۸۲ء ص ۱۰۶

۹۔ اردو کے چار مزاحیہ شاعر مرتبہ احمد جمال پاشا۔ لکھنؤ جون ۱۹۶۵ء ص ۱۰

۱۰۔ارکانِ حلقہ اودھ پنچ کے ناموں کی بیشتر مکمل فہرست درج ذیل مصادر کے حوالے سے پیش کی گئی ہے

(۱)اردو ادب میں طنز و مزاح ڈاکٹر وزیر آغا۔ نار پبلشنگ ہاؤس، دہلی ص۱۹۲ تا۱۹۹

(۲)معاونین اودھ پنچ ڈاکٹر مصباح الحسن قیصر

(۳)گلدستہ پنچ مرتبہ پنڈت کشن پرشاد کول، ہندوستانی پریس لکھنؤ، ۱۹۱۵ء

(۴)تذکرۂ ماہ و سال مالک رام۔ نئی دہلی، نومبر ۱۹۹۱ء

(۵)اردو طنز و مزاح۔ احتساب و انتخاب ابن اسماعیل۔ سری نگر دسمبر ۱۹۸۸ء ص۳۹ تا ۵۰

(۶)اردو نثر میں ظرافت ڈاکٹر اقبال اختر، پٹنہ ۱۹۸۶ء ص۵۸ تا ۵۹ نیز ۱۰۵ تا ۱۳۲

(۷)طنزیات و مضحکات رشید احمد صدیقی، نئی دہلی، ۱۹۷۳ء ص۸۸ تا ۱۳۳

(۸)رتن ناتھ سرشار، ڈاکٹر مصباح الحسن قیصر لکھنؤ، جنوری ۱۹۸۲ء

(۹)رتن ناتھ سرشار ڈاکٹر قمر رئیس، نئی دہلی ۱۹۸۳ء

(۱۰)اردو طنز و ظرافت اور منشی سجاد حسین ڈاکٹر مصباح الحسن قیصر

۱۱۔ بہ حوالہ معاونین اودھ پنچ ص۱۸۹ تا ۱۹۰

۱۲۔ ایضاً ص۱۴۴

۱۳۔ گلدستہ پنچ مطبوعہ ۱۹۱۵ء (دیباچہ ص۹ تا ۱۰)

۱۴۔ چند ہم عصر ڈاکٹر عبدالحق، حیدر آباد، ۱۹۷۲ء ص۱۶۴ تا ۱۶۵

۱۵۔ بہ حوالہ داستانِ تاریخ اردو۔ دہلی مطبوعہ ۱۹۹۵ء ص۶۳۱ نیز ص۶۳۳

۱۶۔ یادگار حالی، ص۱۰۸

۱۷۔ بہ حوالہ معرکۂ چکبست و شرر مؤلفہ میرزا محمد شفیع شیرازی۔ لکھنؤ، مارچ ۱۹۶۶ء ص۴۳۵ تا ۴۴۶

۱۸۔ تاریخ وفات داغ بہ حوالہ تذکرۂ ماہ و سال ص۱۵۰

۱۹۔ بہ حوالہ حالی کی نثر نگاری ڈاکٹر عبدالقیوم۔ لاہور ۱۹۶۴ء ص۵۲۶

انیس اشفاق

حالی کی تنقید

مقدمۂ شعروشاعری اور یادگارِ غالب کے دوراہے پر

ایک زمانے سے ایک ہی طرح کے مضامین پر مشتمل شاعری سے اُکتائے ہوئے حالی شاعری کے نئے تقاضوں کو پورا کرنے کی غرض سے جب مقدمے کی شکل میں اردو کی پہلی شعریات مرتب کررہے تھے تو انہیں شاید اس کا خیال نہ آیا ہوگا کہ برسوں کی محنت اور عرق ریزی کے بعد وہ شعر کو پرکھنے کے جن معیاروں کو مقرر کرنے کی سعی کررہے ہیں، آگے چل کر عملاً ان کا اطلاق کرتے وقت وہ خود ان کی نفی کرسکتے ہیں۔ مقدمے کے ذریعے حالی یہ بتانا چاہ رہے تھے کہ بدلتے ہوئے زمانے میں شاعری کے مطالبات کیا ہیں اور بدلتی ہوئی شاعری سے زمانے کی توقعات کیا ہیں۔ تبدیل ہوتے ہوئے ذہن، تیز ہوتی ہوئی فہم اور روشن ہوتی ہوئی بصیرت کے ذریعے انہوں نے یہ بتایا کہ شاعری کیا ہوکر ہمیں کیا فائدے پہنچا سکتی ہے اور کیا نہ ہونے کی صورت میں ہمیں اس سے کیا نقصان پہنچ سکتے ہیں۔ مقدمے کی تصنیف میں شروع سے آخر تک ان کے مقصد اور نیت میں کوئی تبدیلی نظر نہیں

آتی۔ وہ بڑی دل جمعی اور انتہائی متانت کے ساتھ اپنی مدلل بحثوں کے ذریعے اپنے اخذ کیے ہوئے نتائج کی معقولیت کو منوانے میں سرگرم نظر آتے ہیں۔ اپنے دیوان کے دیباچے میں برسوں تک پرانی شاعری کی راہ پر گامزن رہنے کے عمل سے شرمندہ ہوتے ہوئے وہ پرانی شاعری کو بدلنے یعنی اسے نئے قالب میں ڈھالنے کی ضرورت کے جواز پر یوں گویا ہوتے ہیں

> ''مگر جب آفتابِ عمر نے پلٹا کھایا اور دن ڈھلنا شروع ہوا وہ تمام سیمیائی جلوے جو خوابِ غفلت میں حقیقت سے زیادہ دلفریب نظر آتے تھے، رفتہ رفتہ کافور ہونے لگے۔ غزل وتشبیب کی امنگ انفعال کے ساتھ بدل گئی اور جس شاعری پر ناز تھا اس سے شرم آنے لگی۔ ہرچند سمجھایا گیا کہ
>
> غزل کہنے کے دن اب آئے ہیں مگر یہی جواب دیا گیا کہ
>
> غزل کہنے کے دن اب گئے
>
> جو لوگ عاشقانہ گوئی کے چٹخارے سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ خون جہاں منہ کو لگا پھر ذرا مشکل سے چھٹتا ہے مگر زمانے کی ضرورتوں نے یہ سبق پڑھایا کہ دلفریب مگر نکمی باتوں پر آفریں سننے سے دلشکن مگر کام کی باتوں پر نفریں سننی بہتر ہے اور حاکم وقت نے یہ حکم دیا کہ پروانہ وبلبل کی تو قسمت کو تو بہت رو چکے کبھی اپنے حال پر بھی دو آنسو بہانے ضرور ہیں۔''

- دیباچہ مقدمۂ شعروشاعری، ص ۲۸۳، مرتبہ ڈاکٹر رفیق حسین

اس اقتباس میں آفتابِ عمر کی سوچی سمجھی ترکیب سے مراد حالی کی عمر شاعری یا عمرِ فہم ہے جو اب تک پرانی روشنی کے سہارے آگے بڑھ رہی تھی لیکن اب نئی روشنی سے بہرہ ور ہو رہی ہے اور دل ڈھلنے سے مراد پرانی شاعری کا رخصت ہونا ہے۔ یعنی اب حالی نئی شاعری کی ضرورت کے قائل ہو کر پرانی شاعری کو بدل دینے کے معاملے میں اس حد تک اٹل ہیں کہ تلخ باتوں یعنی پرانی شاعری کی عمومیت پر آخر میں سننے کے بجائے اسے از کار رفتہ قرار دیے جانے کی پاداش میں نفریں سننے کو بہتر سمجھتے ہیں۔ وہ حکمِ زمانہ پر پروانہ وبلبل کو خیر باد کہہ کر ناظرین سے اپنی شاعری میں نئے خیالات کے ہونے کی توثیق چاہتے ہیں اور ان کو دعوتِ فہم دیتے ہوئے یہ انکشاف کرتے ہیں

> ''مگر خیالات میں ذرا بھی غور فرمائیں گے تو ان کو ایک دوسرا عالم نظر آئے گا۔ وہ دیکھیں گے کہ محمل نہیں بدلے مگر محمل نشیں بدل گئے ہیں۔''

دیباچہ مقدمہ شعر وشاعری، ص ۳۸۷

واضح رہے کہ اپنی شاعری میں ایک دوسرے عالم کو دکھانے والے حالی نے غالب کی درسگاہِ شاعری میں تربیت پائی ہے جہاں جدت کو روایت سے الگ رکھ کر دیکھنے کے بجائے اسے روایت کی تعبیرِ نو سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی اس دشتِ شاعری میں محمل نشیں نہیں بدلے گئے تھے بلکہ محمل نشینی کے آداب بدل دیے گئے تھے۔ حالی نے انہیں بدلے ہوئے آداب سے استفادہ کیا تھا لیکن زمانہ ان کے روایت آشنا ذہن کو ایسے بھی رخ دکھا رہا تھا جنہیں دیکھ کر انہیں شاعری کی روایت کو بدلنے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی اور وہ ایک نئی طرح کی شاعری کو وجود میں لانے کی غرض سے نئے ضابطوں پر مشتمل شعریات وضع کر رہے تھے۔ آیئے ہم اس شعریات کے خاص خاص نکتوں پر یہ دیکھنے کے لیے نگاہ ڈال لیں کہ مقدمے میں ان پر ثابت قدم رہنے کے باوجود حالی آئندہ انہیں کس طرح

نظر انداز کرتے ہیں۔

شعریات کے اِن نکات کے بیان میں حالی شاعری کو سیاسی معاملات و مسائل سے الگ نہیں رکھتے۔ وہ شاعری کو ازروئے انصاف علمِ اخلاق کا نائب مناب اور قائم مقام سمجھتے ہیں اور سماجی اقدار کے بدلنے کے ساتھ ساتھ شعری اقدار کے بدلنے کی بات کرتے ہیں، گویا ان کے نزدیک شاعری سماج ہی کے زیر سایہ پروان چڑھتی ہے۔ وہ شاعری میں مفید اور اخلاقی مضامین کے باندھنے پر اصرار کرتے ہیں اور جھوٹ اور مبالغے سے بچنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ پھر وہ نیچرل شاعری پر تفصیل سے گفتگو کرتے ہوئے اس کی لفظی اور معنوی تعریفوں کے ذیل میں ہمیں بتاتے ہیں کہ نیچرل شاعری سے ایسی شاعری مراد ہے جو لفظاً اور معناً دونوں حیثیتوں سے نیچر یعنی فطرت یا عادت کے موافق ہو۔ لفظاً نیچر کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور ان کی ترکیب و بندش تا بمقدور اس زبان کی معمولی بول چال کے موافق ہو جس میں وہ شعر کہا گیا ہے۔ معناً سے ان کی مراد یہ ہے کہ ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ دنیا میں ہوا کرتی ہیں یا ہونی چاہییں۔ ان کے خیال میں جو شاعری ان تعریفوں پر پوری نہیں اترتی اسے اَن نیچرل سمجھا جائے گا۔ غزل کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اس کی حالت فی زمانا نہایت ابتر ہے اور وہ محض ایک بے سود اور دوراز کار صنف معلوم ہوتی ہے۔ آگے چل کر وہ غزل کے بارے میں یہ اعلان بھی کر دیتے ہیں کہ زمانہ باآوازِ بلند کہہ رہا ہے کہ یا عمارت کی ترمیم ہوگی یا عمارت خود نہ ہوگی۔ غزل پر اپنی طویل گفتگو میں وہ جگہ جگہ اس میں ترمیم اور تبدیلی کے مطالبے کرتے نظر آتے ہیں اور کسی نہ کسی عنوان سے اس کی پرانی صورت کو بدل کر اسے قوم کی موجودہ حالت کا ترجمان بنانا چاہتے ہیں۔ وہ اس بات کو بھی تسلیم نہیں کرتے کہ اخلاقی مضامین سے غزل میں وہ گرمی پیدا نہیں ہوسکتی جو عشقیہ مضامین میں ہوتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عشق و عاشقی کی ترنگیں اقبال مندی کے زمانے میں زیبا تھیں۔ اب وہ وقت گیا۔ عیش و عشرت کی رات گزر گئی اور

صبح نمودار ہوئی۔ قصیدے کے متعلق خیال ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس میں تعریف و توصیف اور بے جا خوشامد نہیں ہونا چاہیے۔ ان کے خیال میں مدح ایسے اسلوب میں کرنی چاہیے کہ وہ منجر بہ خوشامد نہ ہو جائے۔ مثنوی کو مفید اور کارآمد صنف سمجھتے ہیں اور مرثیے کی اہمیت اور اسی کے تعلق سے انیس کے اس لیے معترف ہیں کہ انہوں نے اس نوع کی شاعری میں اخلاقی مضامین نظم کیے ہیں۔

یہ حالی کی شعریات کے وہ اہم نکات ہیں جن سے حالی کے تصورِ شاعری کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ہر نظریہ ساز نقاد کی طرح حالی کے لیے ضروری تھا کہ وہ آئندہ شاعری کو پرکھتے وقت اپنے اسی تصورِ شاعری کو نگاہ میں رکھتے اور انہیں اصولوں سے کام لیتے جن سے انہوں نے اپنی شعریات کی تشکیل کی ہے۔ لیکن یادگارِ غالب میں غالب کی شاعری کا محاکمہ کرتے وقت وہ مقدمے میں قائم کی ہوئی تنقیحات و ترجیحات کا مطلق خیال نہیں رکھتے۔ حالانکہ حالی کے لیے اپنے اصولوں کو عمل میں لا کر ان کو ثابت کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ مقدمے کی تصنیف کے بعد وہ پہلی بار کسی شاعر کے کلام کا تفصیلی جائزہ لے رہے تھے۔ انہیں چاہیے تھا کہ وہ کلامِ غالب کی تعبیر میں اپنی شعریات کو برت کر اس کے بامعنی اور کارآمد ہونے کا ثبوت فراہم کرتے۔ لیکن حالی نے ایسا نہیں کیا۔ انہیں خود بھی اس کا احساس تھا اسی لیے وہ غالب کے اردو اور فارسی کلام کا جائزہ لینے کے بعد خاتمے میں اپنی شعریات کو اس جائزے میں بروئے کار نہ لانے کا جواز یوں فراہم کرتے ہیں

> 'راقم کو مرزا کے کلام کے ساتھ جو تعلق بدوِ شعور سے آج تک برابر چلا آتا ہے اس کو چاہو اس معتقدانہ جوشِ عصبیت کا نتیجہ سمجھو جو انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتا ہے اور چاہو اس یقین کا ثمرہ خیال کرو جو نہایت زبردست شہادتوں سے حاصل ہوتا ہے۔ پس نہ ہم کو یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے اس

تالیف سے پبلک کی کسی بڑی ضرورت کو رفع کیا ہے اور نہ
یہ خیال ہے کہ محض ملک کی خیر خواہی اس کے لکھنے کا باعث
ہوئی ہے"

یادگارِ غالب، ص ۳۹۴

اس اقتباس میں دو باتیں غور طلب ہیں۔ پہلی یہ کہ اگر حالی کو اندھا اور بہرا کردینے والے معتقدانہ جوشِ عصبیت کا خیال تھا تو انہوں نے مقدمے کی نظریہ سازی میں قدم قدم پر کشادہ نظری کے جوش میں اپنے اصولوں پر ڈٹے رہنے کا مظاہرہ کیوں کیا اور یہ کیوں کہا کہ دلفریب مگر نکمّی باتوں پر آخر میں سننے سے دل شکنی مگر کام کی باتوں پر نفریں سننی بہتر ہے"۔

دوسری بات یہ کہ اگر زبردست شہادتوں کی بنا پر وہ غالب کی شاعری کو بہترین اور نمائندہ شاعری سمجھ رہے تھے تو شاعری پر گفتگو کرتے وقت انہیں اسی نوع کی شاعری کو نگاہ میں رکھنا چاہیے تھا۔ لیکن مقدمے کے اصولوں کو وضع کرتے وقت انہوں نے غالب کی شاعری کے ان خصوصیات کو نظرانداز کردیا جنہیں یادگارِ غالب میں نمایاں کیا ہے۔ یہاں یہ خیال رہے کہ پرانی شاعری کو مسترد کرتے وقت حالی نے غالب کو اس سے پوری طرح الگ نہیں رکھا ہے۔

یادگار میں حالی نے غالب کے شعروں کی شرحوں کے ذریعے جو مفاہیم روشن کیے ہیں ان میں نہ تو سیاست کی بات کی ہے نہ سوسائٹی کی، نہ اپنی تعبیرات کو تصورِ اختلاف سے وابستہ کیا ہے اور نہ ہی شرحوں کے دوران نیچرل اور اَن نیچرل شاعری کے جھمیلوں میں پڑے ہیں۔ وہ مقدمے میں بیان کیے ہوئے غزل گوئی کے جواز کا یہاں کوئی ذکر نہیں کرتے اور غالب کے منجر بہ خوشامد قصیدوں کے شمول کے ساتھ انہیں بہ اعتبارِ کمیت بھی اور بہ لحاظِ کیفیت بھی غالب کے اصنافِ نظم کی ممتاز ترین صنف قرار دیتے ہیں اور اس طرح مقدمے

کے برخلاف یادگار میں قصیدے کے معترف نظر آتے ہیں۔ یہی نہیں حالی غالب کی شاعری کی خصوصیتوں کے بیان پر بھی مقدمے کے بیانات کی پرچھائیں نہیں پڑنے دیتے۔ مقدمے میں اگر وہ شعر کے الفاظ اور ان کی ترکیب و بندش کو معمولی بول چال کے موافق بتاتے ہیں تو غالب کی شاعری کو استعارے، کنائے اور تمثیل کی بنیاد پر لائق تحسین سمجھتے ہیں۔ وہاں اگر وہ اخلاقی مضامین کی اہمیت پر زور دیتے ہیں تو یہاں شوخی و ظرافت کی جستجو کرتے ہیں اور اگر مقدمے میں شعر کی تاثیر کے ضمن میں اس کی خصوصیت از دل خیزد بر دل ریزد بتاتے ہیں تو یادگار میں غالب کی شاعری کو پہلو دار قرار دیتے ہوئے اس کی خوبی یہ بتاتے ہیں کہ بادی النظر میں اس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں مگر غور کرنے کے بعد اس میں ایک دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں۔

کہا جا چکا ہے کہ یادگار میں حالی نے مقدمے کے نظریات سے خود کو الگ رکھتے ہوئے خالص تشریحی طریق کار اختیار کیا ہے اور شرحوں میں فنی لوازم پر زیادہ گفتگو کی ہے۔ انہوں نے شعروں سے برآمد مفاہیم کو اپنے نظریوں سے منسوب یا مستحکم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ ان تشریحوں میں انہوں نے متن کی مختلف قرأتوں، لفظ کی معنوی قوتوں اور اشاراتی الفاظ کی کارفرمائیوں کو اہم جانا ہے اور اس طرح شاعری کے رموز کو زیادہ سے زیادہ سمجھنے کے لیے نظری کے بجائے عملی طریقہ اختیار کیا ہے۔ اس طریقہ کار کی صرف دو مثالیں ملاحظہ کیجیے

پہلی مثال اس شعر کی شرح ہے

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی میں صلا میرے بعد

حالی کی تشریح

اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جب سے میں مر گیا ہوں
مرد افگنِ عشق کا ساقی یعنی معشوق بار بار صلا دیتا ہے یعنی

لوگوں کو شراب عشق کی طرف بلاتا ہے مطلب یہ کہ میرے
بعد شراب عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا اس لیے اس کو بار بار
صلا دینے کی ضرورت ہوتی ہے مگر زیادہ غور کرنے کے بعد
جیسا کہ مرزا خود بیان کرتے تھے اس میں ایک نہایت
لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرعہ ہی
ساقی کے صلا کے الفاظ ہیں اور اس مصرع کو وہ مکرر پڑھ
رہا ہے۔ ایک دفعہ بلانے کے لہجے میں پڑھتا ہے ''کون
ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق'' یعنی کوئی ہے جو مئے
مرد افگنِ عشق کا حریف ہو؟ پھر جب اس آواز پر کوئی نہیں
آتا تو اسی مصرعے کو مایوسی کے لہجے میں مکرر پڑھتا ہے
''کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگنِ عشق''۔ یعنی کوئی نہیں
ہوتا۔ اس میں لہجے اور طرزِ ادا کو بہت دخل ہے۔ کسی کو
بلانے کا لہجہ اور ہے اور مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز
ہے۔ جب اس طرح مصرعۂ مذکور کی تکرار کروگے فوراً یہ معنی
ذہن نشین ہو جائیں گے۔

دوسری مثال

ے باندازہ حرام آمدہ ساقی برخیز
شیشہ خود بشکن بر سرِ پیمانۂ ما

تشریح

برخلاف عقل و شرع کے کہتا ہے کہ اے ساقی شراب
اعتدال کے ساتھ حرام ہے۔ تو اُٹھ اور اپنا شیشہ یعنی
بوتل یا صراحی ہمارے گلاس پر دے مار۔ اس شعر میں افراط

> شوق کی تصویر کھینچی ہے خواہ کسی چیز کا شوق ہو۔ جب کسی چیز کی طلب اور خواہش حد سے گزر جاتی ہے تو اس بات کی حد نہیں رہتی کہ اپنے ظرف کے موافق اس کی خواہش کی جائے۔ جب پانی کی پیاس نہایت شدت سے ہوتی ہے تو پیاسا دریا کو دیکھ کر یہ چاہتا ہے کہ سارے دریا کو پی جاؤں پس گو کہ مضمونِ شعر شراب کی تمثیل میں بیان کیا گیا ہے لیکن اس کا مصداق ہر چیز کا مشتاق قرار پا سکتا ہے۔

ان شعروں اور اسی طرح دوسرے شعروں کے مفاہیم کی دریافت کے دوران حالؔی نے ان کے مفاہیم پر مقدمے کے ضابطوں کو نافذ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ شاعری کو تصورِ اخلاق سے ملا دینے والے حالی نے غالب کے شعروں کی درجہ بندی میں بھی رندانہ، عاشقانہ، شوخی اور ظرافت کے اظہار و انداز والے شعر سب سے زیادہ رقم کیے ہیں اور ان کی تشریحوں میں بھی زبردستی اخلاقی مفاہیم کی جستجو نہیں کی ہے۔ گویا اپنی شعریات کو عملاً برت کر دکھانے کا یہ موقع ہاتھ آنے کے باوجود حالی اسے برت کر نہیں دکھا سکے۔ تو کیا یہ سمجھ لیا جائے کہ یادگار میں حالی اپنی شعریات کا انکار کر رہے ہیں یا غالب کو اس شعریات سے مستثنیٰ جانتے ہیں یا انہیں یادگار میں اس شعریات کو برتنے میں یہ خوف لاحق ہے کہ ایسا کرنے سے کہیں مقدمے کے مباحث باطل نہ ہو جائیں۔ کچھ بھی ہو حالؔی کو اپنی اس مجبوری کا احساس بھی تھا اور ایسا نہ کر پانے پر انہیں افسوس بھی تھا۔ اسی لیے یادگار کے خاتمے میں وہ تضاد اور تردید کے ساتھ بار بار اس کا جواز پیش کرتے ہیں

> ''ہم نے اس کتاب میں جیسا کہ مکرر بیان ہو چکا ہے مرزا کے کلام کا انتخاب صرف اس غرض سے درج کیا ہے کہ شاعری و انشا پردازی کی غیر معمولی استعداد جو مرزا کی فطرت میں رکھی گئی تھی جہاں تک کہ ان کی نظم و نثر پر شہادت

دے سکتی ہے، صاحبانِ ذوقِ سلیم پر واضح و لائح ہو جائے۔
اگر فی الحقیقت طریقۂ مذکور سے اس غرض کا پورا ہونا نہایت
دشوار ہے لیکن بالفرض اس کا پورا ہونا تسلیم کرلیا جائے تو بھی
اس سے کوئی فائدہ متصور نہیں"۔

خاتمہ یادگارِ غالب، ص۴۰۰۔۳۹۳

ان جوازوں سے قطعِ نظر حقیقت یہ ہے کہ شدید التباس کے عالم میں حالی پر گومگو کی کیفیت طاری ہے۔ دیکھا جائے تو مقدمے سے یادگار تک تین طرح کی شعریات بنتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایک وہ جو حالی نے مطلق شاعری کی وضاحت میں پیش کی ہے۔ دوسری وہ جو غالب کے شعروں کے اندر موجود ہے اور تیسری وہ جو یادگار میں حالی کے تجزیوں کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ لیکن حالی کی اصل شعریات بقیہ دونوں شعریات سے الگ جا پڑتی ہے۔ دیوان کے دیباچے میں حالی نے اپنی شاعری میں ایک دوسرا عالم نظر آنے کی بات کہی تھی اور غالب کے یہاں بھی وہ دوسرا عالم دکھائی دینے کی بات کرتے ہیں

"جب میر و سودا اور ان کے مقلدین کے کلام میں ایک ہی
قسم کے مضامین اور خیالات دیکھتے دیکھتے جی اکتا جاتا ہے
اور اس کے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں
ہم کو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے"

یادگارِ غالب، ص۱۱۶

حالی اپنی شاعری کا دوسرا عالم مقدمے کی شعریات کی روشنی میں دکھاتے ہیں لیکن غالب کی شاعری کا دوسرا عالم وہ ایک اور شعریات کے ذریعے دیکھتے ہیں اور اس شعریات کا مقدمے کی شعریات سے بظاہر کوئی علاقہ نظر نہیں آتا۔

اسلم پرویز

حالی، نظمِ اُردو اور ’انجمنِ پنجاب‘

یہ واقعہ ہے کہ اردو نظم کی تاریخ میں ’انجمنِ پنجاب‘ نے اہم رول ادا کیا ہے۔ یہاں یہ تاریخی حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ’انجمن پنجاب‘ اردو میں جس نئے شعور کا نام ہے وہ بالواسطہ طور پر فورٹ ولیم کالج کی دین ہے۔ فورٹ ولیم کالج ہی کی بدولت اردو نثر بالآخر اس مقام پر پہنچی جہاں ایک طرف تو ۱۸۳۷ء میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوا اور دوسری طرف اس زبان میں سائنسی، سماجی اور دیگر علوم پر کام کرنے کی روایت قائم ہوئی جس کے ذریعے مغربی افکار کی تازہ ہواؤں نے شکستہ اور زخم خوردہ ہندوستانی معاشرے کے عقلیت پسند ذہنوں کو بیدار اور متحرک کیا۔ اس سلسلے میں دہلی کالج اور دہلی ورنیکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام اور اسکی خدمات اور سرسیّد کی قائم کردہ ’سائنٹفک سوسائٹی‘ اور اس کا اخبار ’علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ‘ قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۸۳۷ء کا وہ سال جب اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا حالؔی کی پیدائش کا سال بھی ہے۔ دہلی کالج کا قیام ۱۸۲۵ء میں عمل میں آیا۔ یہ حالؔی کی ولادت سے بارہ برس پہلے کی بات ہے۔ دہلی کالج نے اپنی علمی اور ادبی خدمات اردو زبان کے ذریعے انجام دیں۔ دہلی کالج ہی کے تحت ۱۸۴۳ء میں

ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم ہوئی۔ گویا حالی نے جس زمانے میں آنکھ کھولی ہندوستان تاگزیر تاریخی تبدیلیوں سے گزر رہا تھا۔ حالی پہلی بار ۱۸۵۴ء میں دلّی آئے۔ اس وقت سلطنتِ مغلیہ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا اور ۱۸۵۷ء کا کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو چکا تھا۔ حالی نے اس موقعے پر دہلی کالج کی علمی سرگرمیوں کو بھی قریب سے دیکھا اور مغلیہ تہذیب کے دھندلاتے ہوئے نشانات کا بھی نظارہ کیا۔ یہ صورت حال ان کے لیے فکر و آگہی کی سطح پر لائق تقلید اور قدروں کے زوال کے اعتبار سے باعثِ عبرت تھی۔ اس سے ان کے تخلیقی ذہن کا وہ خمیر اٹھا جس میں ایک طرف تو دقیانوسیت کا کوئی شائبہ نہ تھا اور دوسری طرف جس نے ان کے طرز زندگی یہاں تک کہ طرزِ بیان میں بھی اس سادگی اور دیسی پن کو برقرار رکھا جس میں ہندوستانیت کی مہک بھی تھی اور فوک لور کی سی صداقت، جاذبیت اور تیکھا پن بھی۔ حالی کا شاید سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے نئی روشنی کے مرکب کی ایال تھامے رہنے کے باوجود اپنی زمینی شناخت برقرار رکھی۔ وہ اس حقیقت سے باخبر تھے کہ اس دور کے سماج اور خصوصاً مسلم معاشرے کی نجات کا ذریعہ سرسیّد کی تحریک اور ان کا مطمحِ نظر تھا۔ اس لیے اصولی طور پر انہوں نے اس تحریک کے ساتھ حلفِ وفاداری لیا لیکن اپنی ترجیحات کے ساتھ۔ حالی کی طبیعت میں جو بلا کا انکسار تھا اس نے کبھی بھی ان چھوٹے چھوٹے اختلافات کو سطح پر نہیں آنے دیا جو بعض امور پر وہ سرسیّد کے ساتھ رکھتے تھے۔ وہ مجموعی طور پر سرسیّد کے موقف کے حامی تھے اور انتہائی دیانت داری سے اس بات کے معترف بھی کہ نئے تصورات سے وہ ہم کنار تھے، وہ دراصل اس فضا کی دین تھے جو بڑی حد تک سرسیّد کی کوشش سے تیار ہوئی تھی۔ اور حالی نے اس بات کا اعتراف محض سپاٹ اور کھوکھلے الفاظ میں نہیں کیا بلکہ اپنی تصانیفِ نظم ونثر سے اس کا ثبوت بہم پہنچایا۔ گویا اردو شاعری یا یوں کہیے کہ نظمِ اردو کی تاریخ میں انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں لاہور میں انجمن پنجاب کی سرکردگی میں جو کارنامہ وجود میں آیا اس کے لیے نظریاتی طور پر ایک فضا دلّی میں پہلے ہی تیار ہو چکی

تھی۔ یوں بھی آزادؔ اور حالیؔ لاہور میں دلّی ہی کے تو سفیر تھے۔

جو بات ابھی کہی گئی یہاں اس کی تھوڑی سی وضاحت ضروری ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ نظیرؔ اکبر آبادی اردو کا پہلا نظم گو شاعر ہے۔ نظیرؔ اکبر آبادی کی نظمیہ شاعری نے اس امر کی توثیق کر دی کہ زندگی کی چھوٹی بڑی سچائیوں کے براہِ راست اظہار کا کارگر وسیلہ نظم ہی ہوسکتی تھی۔ بالواسطہ اظہار، ماورائے سخن بات اور ابہام اور علامت کے استعمال کی جن روایات سے غزل عبارت تھی، نظیرؔ نے اپنی نظم کو ان سب سے مبرا قرار دیا۔ لیکن نظیرؔ کی نظم زندگی کی سچائیوں کے اظہار تک ہی آکر اپنا سفر پورا کر لیتی ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں جب اصلاحی تحریک کا دور شروع ہوا تو ادب اور خصوصاً شاعری میں بھی اصلاحی مقاصد کو سامنے رکھنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ چنانچہ زندگی کی سچائیوں کے براہِ راست اظہار کی جو روایت نظیرؔ اکبر آبادی کے ذریعے نظم میں قائم ہو چکی تھی اس کی توسیع اسماعیل میرٹھی، آزادؔ اور حالیؔ جیسے شاعروں کے ذریعے اس وقت ہوئی جب نظم میں زندگی کی سچائیوں کے براہِ راست اظہار کے ساتھ ساتھ پیغام رسانی اور اصلاحِ معاشرہ کے مقاصد کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا۔ اس طرح کی نظم گوئی کا باقاعدہ آغاز انجمنِ پنجاب ہی سے ہوا لیکن اس کے خدوخال شاید اسماعیل میرٹھی اور حالیؔ جیسے شعرا کے ذریعے دہلی میں پہلے ہی بننے شروع ہو گئے تھے۔ چنانچہ ۱۸۶۷ء میں اسماعیل میرٹھی نے انگریزی کی چار نظموں کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا۔ یہ نظمیں تھیں، کپڑا، ایک قانع مونس، موت کی گھڑی اور فادر ولیم۔ حالیؔ نے ۱۸۷۲ء میں 'جواں مردی' کے عنوان سے ایک مثنوی لکھی۔ یہ مثنوی اگرچہ ایک چھوٹی سی کہانی کی شکل میں ہے لیکن اس میں اردو کی عشقیہ مثنویوں کی طرح کوئی حسن و عشق کی داستان نہیں بلکہ یہ ایک نصیحت آموز اور اخلاقی قصہ ہے جس میں مختلف اخلاقی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے سب سے بڑی اخلاقی خوبی مصیبت میں گھرے ہوئے دشمن کی مدد کرنا بتائی گئی ہے اور اس کو 'جواں مردی' کہا گیا ہے۔

حالی کی غزلیہ شاعری کا انداز یہ بتاتا ہے کہ ان کے ہاں اعلیٰ درجے کا وہی ادبی مذاق تھا جو کلاسیکی غزل کی عشقیہ شاعری کی جان ہے لیکن حالی نے بالآخر اس مذاقِ سخن کو سماجی فلاح کے اعلا مقاصد پر قربان کر دیا۔ یہ ان کی اس ایثار پسند طبیعت کی ایک روشن مثال ہے جس کا عکس ہم ان کے ہاں باہمی تعلقات میں رواداری، حسنِ سلوک اور خدمت گزاری کی شکل میں دیکھتے ہیں اور جس کا ذکر ان کے سوانح نگاروں نے بجا طور پر کیا ہے۔
دراصل معاملہ یہ تھا کہ حالی کا اصل میدانِ عمل ان کی تصانیف ہی تھیں۔ اگر حسرت موہانی کی طرح کہیں وہ بھی عملی سیاست میں سرگرم ہوتے تو شاعری کی سطح پر ان کے ہاں بھی تغزل کی وہ بجلیاں برقرار رہتیں جو ہمیں حسرت موہانی کے ضخیم کلیاتِ غزل میں کوندتی دکھائی دیتی ہیں۔ ایسی صورت میں ہم اس حالی سے محروم ہو جاتے جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔
بہر حال غزل کی قیمت پر حالی نے نظم کا جو سرمایہ اکٹھا کیا وہ کسی بھی طرح کم وقیع نہیں۔ اس سلسلے میں کلیاتِ حالی کے مختصر دیباچے میں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے حالی کو بہترین خراجِ تحسین پیش کیا ہے، اگر چہ اس دیباچے میں بھی اردو کے قدیم شعری سرمایے کی طرف مسدس والے 'عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر' والا غیر متاوزن اور معاندانہ رویہ موجود ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو

> ''اردو شاعری کے مجدد اور حکیمانہ نظم کے موجد 'سعدیِ ہند' شمس العلما مولانا خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی کا نامِ نامی ہندوستانی پبلک میں اب کسی تعارف کا محتاج نہیں رہا۔ آپ سے واقف ہر چھوٹا بڑا آپ کی پرسوز نظموں کا دل دادہ ہے۔ مولانا نے جو کیف انگیز روح ہماری شاعری کے مردہ اور بے جان جسم میں ڈالی ہے اور اردو نظم کو جس میں فحش شعروں، ناپاک واسوختوں، خرافات مثنویوں، گندگی

سے بھری ہوئی غزلوں، ہجر و وصال کے جھگڑوں، آسمان کی شکایتوں، رقیب کی برائیوں، گل و بلبل کے تذکروں۔ کنگھی چوٹی کی داستانوں، عاشق کی وفاؤں، معشوق کی کج ادائیوں، انتظار کی راتوں، فراق کی بے قراریوں، واعظوں اور ناصحوں پر صلواتیں اور پھبتیوں کے سوا بالعموم کچھ نہ تھا اور نجس اور پلید شاعری جس کا دفترِ بے پایاں مولانا کے اس مصرعے کے مصداق ہو رہا تھا کہ، عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر۔ اسے اس ادنا اور ذلیل حالت سے مولانا نے جس معراج ترقی پر پہنچایا   آپ ہی کی ان تھک کوششوں اور مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا'

شیخ صاحب یہاں حالی کی عقیدت میں اردو شاعری کی مذمت میں خود حالی سے بھی آگے نکل گئے۔ حالی نظریاتی سطح پر تمام تر عقیدت کے باوجود سرسید تحریک کی جانب ایک متوازن رویہ رکھتے تھے۔ تاہم اصلاح پسندی کے جوش میں وہ اردو شاعری کے بارے میں بعض ایسی باتیں کہہ گئے جو حدِ اعتدال سے باہر تھیں۔ اور یہی کام یہاں حالی کی عقیدت کے جوش میں شیخ چاند نے کر دکھایا۔ بہر حال ہمیں تو یہاں اس اقتباس کے ابتدائی جملے سے غرض ہے جس سے سرِ مو انکار ممکن نہیں۔ یعنی یہ کہ حالی اردو شاعری کے مجدد تھے، وہ حکیمانہ نظم کے موجد تھے اور یہ کہ وہ 'سعدی ہند' تھے۔ اس اقتباس سے ایک بات اور واضح ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اگر حالی کا رویہ اردو کے قدیم شعری سرمائے کے بارے میں اتنا شدت پسندانہ نہ ہوتا تو شاید نظم گوئی کے میدان میں وہ یہ کمال نہ کر پاتے۔ یوں بھی وہ اپنی نظم میں جس زمینی زبان میں بات کرتے ہیں وہ انہیں اور ان کے قاری کو ایک دوسرے سے اتنا قریب لے آتی ہے کہ ترسیل کی ناکامی کا کوئی امکان ہی نہیں رہتا۔ اردو کی مکتبی روایت کے تحت

ہمارے ادبی ذوق کی تربیت تو اس زبان اور محاورے میں ہوتی ہے جو ذوقؔ، مومنؔ اور غالبؔ جیسے شاعروں کا ڈکشن ہے۔ لیکن غزل اور اس کے اس ڈکشن کی حدود کو توڑ کر اپنی ایک علاحدہ راہ نکالنا بڑا فن کار ہونے کی علامت ہے۔ یہاں اس بحث میں جانے کا محل نہیں کہ آپ حالی کے اس موقف سے اتفاق کرتے ہیں یا اختلاف۔ حالیؔ دوسری بار ۱۸۶۵ء میں دلّی آئے اور سات برس شیفتہؔ کا اور ان کا ساتھ رہا۔ ۱۸۷۱ء کے آس پاس حالیؔ کو لاہور میں پنجاب بک ڈپو کی ملازمت مل گئی۔ جہاں ان کا کام انگریزی مضامین کے اردو تراجم کی عبارت کو درست کرنا تھا۔ حالیؔ ۱۸۷۱ء سے ۱۸۷۵ء تک صرف چار سال لاہور میں رہے۔ دہلی میں مغربی علوم کی جس فضا میں وہ اتنے عرصے سانس لے کر آئے تھے، اس نے یقیناً ترجمے کی اصلاح کے کام میں دل چسپی پیدا کر دی ہوگی جو ان کے لیے کسی درجہ اثر پذیر بھی ثابت ہوا ہوگا۔ لیکن یہ کہنا پھر بھی صحیح نہ ہوگا کہ حالیؔ کو حالیؔ صرف انجمنِ پنجاب ہی نے بنایا۔ البتہ شاعری سے قطع نظر آگے چل کر حالیؔ نے اپنی شاعری کا جو مقدمہ لکھا اس کی روپ ریکھا بنانے میں تراجم کا کام ان کے لیے ہو سکتا ہے مددگار ثابت ہوا ہو۔

۱۸۶۵ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر لائٹنر (Lightner) کی قیادت میں 'انجمنِ اشاعتِ مطالبِ مفیدۂ پنجاب' کے نام سے ایک سوسائٹی قائم ہوئی۔ آگے چل کر اس کا مختصر نام 'انجمنِ پنجاب' کر دیا گیا۔ ۱۸۶۷ء میں آزادؔ نے انجمنِ پنجاب کے جلسے میں 'نظمِ اردو اور کلامِ موزوں کے باب میں خیالات' کے موضوع پر اپنا تاریخی لکچر دیا۔ ۱۸۷۴ء میں کرنل ہارلائڈ کے تعاون سے جو پنجاب کے ناظمِ تعلیمات تھے نظمِ اردو کے اُس مشاعرے یا مناظمے کی بنیاد رکھی گئی جس کے ذریعے جدید شاعری کی روایت کا آغاز ہوا۔ چونکہ اس روایت کا مقصد غزل کے مقابلے میں نظم کو فروغ دینا تھا اس لیے اس میں مصرعِ طرح کے بجائے نظم کا عنوان دیا جاتا تھا اور شعرا کو اسی عنوان پر نظم کہنے کی دعوت دی جاتی تھی۔ کرنل ہارلائڈ کے مشورے کے مطابق انجمن کا پہلا باقاعدہ مشاعرہ ۳۰ مئی

۱۸۷۴ء کو منعقد ہوا۔ اس مشاعرے کا موضوع 'برکھارت' تھا۔ حالؔی نے برکھارت کے موضوع پر ایک سو بائیس شعر کی نظم کہی۔ گارساں دتاسی نے برکھارت کی تعریف کرتے ہوئے کسی پنجابی اخبار کی یہ عبارت نقل کی ہے

> ''جس نے یہ نظم نہ پڑھی ہو وہ پڑھ کر دیکھے کہ شاعر نے کس خوبی سے یہ تصویر بنائی ہے۔ جس نے شاعر کی زبان سے اسے سنا وہ مرحبا کہہ اٹھا اور کوئی صاحب ذوق اس کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا بڑی بات یہ ہے کہ شاعر نے کوئی بے موسم کی راگنی نہیں چھیڑی ہے اور نہ حسن و عشق کے چرچے کیے، پھر بھی اس کی سادگی اور رنگینی کام کر گئی ہے''

انجمن کے طرحی مناظموں کا سلسلہ ۳۰ مئی ۱۸۷۴ء سے شروع ہو کر آٹھ مشاعروں کے ساتھ ۸ جنوری ۱۹۷۵ء تک جاری رہا۔ حالؔی نے ان میں سے صرف چار مشاعروں میں شرکت کی۔ یہ مشاعرے ایک ماہ کے وقفے سے ہوتے تھے۔ حالؔی نے ان مشاعروں میں جن موضوعات پر نظمیں پڑھیں وہ ہیں برکھارت، نشاطِ امید، حبِّ وطن اور مناظرۂ رحم و انصاف۔ حالؔی کی ان نظموں کو بے حد پسند کیا گیا۔ ان کا کہنا تھا کہ انہیں اپنے کلام کی اس قدر روداد زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں ملی۔ چنانچہ حالؔی کی شاعرانہ زندگی میں انجمنِ پنجاب کا رول یہ بھی ہے کہ انجمن پنجاب کے مشاعروں کی داد و تحسین نے ان کے اندر شاعری کی اس نئی ڈگر پر خود اعتمادی کے ساتھ چلنے کا حوصلہ پیدا کیا۔ ۱۸۷۵ء میں حالؔی لاہور کو خیر باد کہہ کر پھر دلّی واپس آ گئے۔ مدّ و جزرِ اسلام، مناجاتِ بیوہ اور چپ کی داد جیسی نظمیں ان کے انجمنِ پنجاب سے اگلے شعری سفر کی سنگِ میل ہیں۔

انجمنِ پنجاب کے مشاعروں کی رودادوں سے پتا چلتا ہے کہ ان مشاعروں کی رونق آزؔاد اور حالؔی ہی تھے۔ حالؔی کی مغرب پسندی پر تنقید کرنے والوں نے یہ بات بھی کہی

ہے کہ مغربی ادبیات سے حالیؔ کی واقفیت بس واجبی ہی تھی جس کا سبب انگریزی زبان سے ان کی ناواقفیت ہے۔ ان کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ مغربیت ان کے ہاں اوپر سے اوڑھی ہوئی چیز تھی اور یہ بھی کہ مغرب کی تقلید میں انہوں نے مشرق کی شعری روایات کو ایک طرف اٹھا کر رکھ دیا تھا۔ یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ حالیؔ کو مغربی ادبیات سے واقفیت کا کوئی دعوانہیں تھا۔ وہ تو مغرب کی ایک چنگاری لے کر اپنی مشرقی شاعری کے اس آتش کدے کو روشن کرنا چاہتے تھے جو ان کے نزدیک برسوں سے ٹھنڈا پڑا تھا۔ انجمن پنجاب کے مشاعروں کے تعلق سے انہوں نے انتہائی انکساری کے ساتھ ایک جگہ کہا ہے

> ''اس مشاعرے کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی مشاعروں کا دروبست عشق اور مبالغے کی جاگیر ہو گئی ہے اس کو جہاں تک ممکن ہو سکے وسعت دی جائے۔ جدت پسند طبیعتوں پر جس قدر مغربی انشاپردازی کی لے اب تک کھلی تھی وہی ان کو لے اڑی''

آگے چل کر کہتے ہیں

> ''مجھے مغربی شاعری کے اصول سے نہ اس وقت تک کچھ آگاہی تھی اور نہ اب ہے۔ نیز میرے نزدیک مغربی شاعری کا پورا پورا تتبع ایک ایسی نامکمل زبان میں جیسی کہ اردو ہے، ہو بھی نہیں سکتا۔ البتہ کچھ تو میری طبیعت مبالغے اور اغراق سے بالطبع نفور تھی اور کچھ اس چرچے نے اس نفرت کو اور زیادہ مستحکم کر دیا۔ اس بات کے سوا میرے کلام میں کوئی ایسی چیز نہیں جس سے انگریزی شاعری کے تتبع کا دعوا کیا جا سکے یا اپنے قدیم طریقے کے ترک کرنے کا الزام

عائد ہو"

حالی کے چار سالہ قیامِ لاہور کو اس اعتبار سے اہمیت حاصل ہے کہ اس نے فکری سطح پر ان کی اس سمت کو متعین کر دیا جس کی طرف وہ سرسید تحریک سے وابستگی کے بعد نظر جمائے ہوئے تھے۔ جہاں تک لاہور کی انجمن پنجاب کا تعلق ہے اس میں تو خود حالی کی شرکت سے جان پڑ گئی۔ ہم کہہ سکتے ہیں حالی اور انجمنِ پنجاب دونوں ہی نے ایک دوسرے کو کچھ دیا۔

حالی نے نظم گوئی کے میدان میں یوں تو قصیدہ، ترکیب بند، مسدس اور مثنوی تمام ہی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن انہوں نے مسدس مدوجزرِ اسلام کو چھوڑ کر نمایاں کارنامے زیادہ تر مثنوی ہی میں انجام دیے۔ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے مثنوی کو عشقیہ داستانوں اور ہجویات کے جنجال سے نکال کر نظریاتی وابستگی کے اس تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنا دیا جس کی روشن مثالیں ہمیں آگے چل کر اقبال اور اس کے بعد بعض ترقی پسند شعرا کے ہاں ملتی ہیں۔ جس طرح دلی کے اجڑتے ہوئے لال قلعے میں بیٹھ کر ظفر، ذوق اور داغ نے اردو کو فارسیت کی چھتر چھایا سے نکال کر اس میں اردو پن کی روح پھونکی اور اسے شاعرانہ اظہار کا ایک موثر ذریعہ بنایا، ٹھیک اسی طرح حالی نے لوک بھاشا سے ملتی جلتی اپنی اردو میں وہ کرشمہ کر دکھایا کہ مسدسِ حالی کے ہزار ہا نسخے علاحدہ کتابی شکل میں چھپ کر ہندوستان کے مسلم گھرانوں میں، اور ایسے گھرانوں میں بھی جن کا ادب سے کوئی لینا دینا نہیں تھا، آسمانی صحیفے کی طرح طاق میں رکھے دکھائی دینے لگے۔ بیشتر والدین کو مسدس کے بند کے بند زبانی یاد ہوتے تھے جن کی بوچھاڑ وہ اپنے خردوں پر نصیحت یا فضیحت کی شکل میں کرتے رہتے تھے۔

حالی حقیقت پسند ہی نہیں تھے، حقیقت کے بارے میں ان کا رویہ بڑا بنیاد پرستانہ تھا۔ جس طرح اسلامی عقیدے میں کفر و ایمان کی ڈائی کاٹومی کے درمیان کوئی

بیچ کا راستہ نہیں اسی طرح اخلاقی قدروں کے بیان میں حالی کی نظم بھی خیر وشر کی ڈائی کاٹومی سے باہر نہیں آتی۔ تعصب وانصاف، مناظرۂ واعظ وشاعر، پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ اور دولت اور وقت کا مناظرہ جیسی نظمیں اس کی روشن مثال ہیں۔ چنانچہ اصلاح کے جوش میں وہ غزل سے اس لیے دور سے دور تر ہوتے گئے کہ حقیقت پسندی کے مقابلے یہ صنف شاعر کو رومانی بدعتوں کا نگارخانہ سجانے پر اکساتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اردو نظم کے بنیاد گزاروں میں جن شعرا نے اہم کارنامے انجام دیے ان میں سب سے نمایاں نام حالی کا ہے۔

اصغر عباس

حالی اور علی گڑھ

مولانا الطاف حسین حالیؔ کا ۱۸۶۷ء سے پایان عمر تک علی گڑھ سے بہت مضبوط رشتہ قائم رہا ہے اس داستان میں سرسید کے افکار بھی ہیں علی گڑھ کالج کے طلبا اور اساتذہ بھی ہیں، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور کالج کی بورڈ آف ٹرسٹیز کی سرگرمیاں بھی ہیں اور علی گڑھ تحریک کے نمائندہ اراکین بھی۔ اس شوق کے رشتے کی کہانی کا ایک مختصر حصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

سرسید سے حالی کی پہلی ملاقات نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی رفاقت میں ۱۸۶۷ء میں سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے سالانہ جلسہ میں ہوئی تھی۔ یہیں پہلی بار انہوں نے دیکھا کہ ایک مرد ہے جو ایک دشوار گذار رستے میں رہ نورد ہے، جسے مدت سے ان کا دل تلاش کر رہا تھا۔ یہیں سے دونوں کے ذہنی ارتباط کا آغاز ہوا۔ اس یادگار ملاقات کا پہلا نقش حالی کا وہ مضمون ہے جو انہوں نے مولوی سید احمد خاں اور ان کے کام کے عنوان سے لکھا جس میں ان کوششوں کا ذکر ہے جو ملک کی تہذیب و اصلاح کے سلسلے میں سرسید کر رہے تھے۔

افکارِ نو کے فروغ کے لیے جب سرسید نے پنجاب کا پہلا سفر کیا تو لاہور میں حالی سے ان کی دوسری ملاقات ہوئی۔ حالی کے خطوط سے انداز ہوتا ہے کہ مراسلت کا سلسلہ سائنٹفک سوسائٹی کے مذکورہ جلسہ سے قائم تھا۔ اس زمانے میں حالی نے ایک رسالہ ہدیۂ میور کے نام سے لکھا تھا جس کا دوسرا نام شواہد الالہام ہے۔ یہ رسالہ غیر مطبوعہ ہے۔ لاہور سے حالی سرسید کو لکھتے ہیں ہدیۂ میور کو اول سے آخر تک کمالِ شوق کے ساتھ ملاحظہ فرمانا اور دردمندانہ ایک بے جا لفظ کو اصل مسودہ سے کاٹ دینا۔ یہ سب باتیں اور بعض اور ضمنی باتیں ایسی ہیں جو بے اختیار آپ کی شکر گذاریِ پر مجبور کرتی ہیں۔ آپ کی رائے خاکسار کے حق میں بہت مفید تھی، خصوصاً یہ فقرہ کہ بڑے بڑے پادریوں نے جو اس باب میں لکھا ہے اس سے یہ مضمون اگر بہتر نہیں تو کسی طرح کم بھی نہیں۔ انگریز لوگ اگر اس کو مبالغہ نہ سمجھیں تو خدا جانے کیا سمجھیں ان کے نزدیک کوئی نیٹو کسی یوروپین کی برابری نہیں کر سکتا۔

حالی کا علمی اور ادبی ذوق خواہ کسی کی صحبت میں نکھرا ہو، چاہے وہ قاری عبدالرحمٰن پانی پتی ہوں مولوی نذیر حسین محدث دہلوی ہوں، غالب وشیفتہ ہوں، پیارے لال آشوب ہوں یا کرنل ہالرائڈ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ سرسید کا فیضان تھا جس نے ان کے ادبی اور قومی مستقبل کے رخ کو متعین کر دیا اور یہ بات ان کے ذہن نشین ہوگئی کہ جو ادیب سماجی فلاح و بہبود کے تابع نہ ہوگا وہ وقت کی رفتار پر اپنا نقش نہیں چھوڑ سکتا۔

۱۸۷۹ء میں حالی نے سرسید کی فرمائش پر مسدس لکھا۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ مغلوں کے زوال کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی حالت اتنی ابتر ہو چکی تھی کہ سرسید نے ہندوستان چھوڑ کر مصر میں سکونت کا ارادہ کیا تھا۔ اس زمانے میں روایت، جدت، مفاہمت، معیشت، سیاست، لسانی اور فرقہ وارانہ فسادات کے دیو ہندوستان میں پنجہ آزمائی کر رہے تھے۔ مسلمانوں کے مصائب اس زمانے میں زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا حل نکالنا آسان نہ تھا۔ اس زمانے میں ترکی کی محبت کا سایہ بھی ہندستانی مسلمانوں پر

پھیلا ہوا تھا۔ فسانہ آزاد میں میاں آزاد کے سامنے شرط وصل لیلیٰ یہ تھی کہ وہ ترکی جائیں، غنیم کا مقابلہ کریں اور جب فتح یاب ہوں تو اپنی مراد کو پہنچیں۔ اس زمانے میں اہل یورپ ترکی کو مرد بیمار کہتے تھے۔ مسلم ممالک کی خود فراموشیوں اور اپنی ٹکنالوجی کے زور پر اہل یورپ نے مسلم ممالک کو اپنے اپنے مفادات کے دائرہ میں تقسیم کرلیا تھا اور ان ممالک کا حال مردہ بدست زندہ تھا لیکن اکبرالہ آبادی کہتے تھے کہ

جہاں میں مظفر ہیں منصور ترک
عجب چیز ہیں چشم بد دور ترک

اسی دوران روس نے پلونا کی جنگ میں ترکی کو شکست دی، نہتے ترکوں کے قتل عام اور پلیونا کی تباہی اور بربادی سے سرسید بہت کبیدہ خاطر ہوئے۔ انہوں نے جہاں ان واقعات کا ذکر کیا ہے۔ خون کے آنسو روئے ہیں۔ اسی ذہنی اور جذباتی اذیتوں کے دوران سرسید نے اسپین کے ممتاز عالم اور مشہور شاعر سید یحییٰ قرطبی کے عربی مرثیے مصائب اُندلس کا اردو ترجمہ شائع کیا۔ سید یحییٰ قرطبی اسپین کے ہنگامۂ دار و گیر میں قید ہوگیا تھا۔ رہائی کے بعد اس نے یہ مرثیہ لکھا تھا۔ سرسید نے قرطبی کے عربی مرثیے مصائب اُندلس کے اردو ترجمہ پر یہ نوٹ لکھا یہ بات کچھ اسپین کے گذشتہ واقعات پر موقوف نہیں ہے جہاں جہاں مسلمان قومیں یا مسلمان حکومتیں اب موجود ہیں، ان سب کا یکساں حال ہے۔ مصر کی حکومت کو دیکھو کیسی ابتر حالت میں ہے۔ ایران کو دیکھو جس میں دو قدم چلنے کو امن کا رستہ نہیں ہے اور اس کی زندگی اور موت روسیوں کی خفگی اور مہربانی پر ہے۔ کابل اور وسط ایشیا کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو دیکھو کہ وحشی جانوروں سے زیادہ کچھ نہیں۔ جو قوم جس ملک میں ذلت کے گڑھے میں گرتی ہے جب تحقیق کرو کہ وہ کون ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان۔

سرسید نے اپنے شفیق حالی سے کہا کہ افسوس ہے کہ اُندلس پر تو رونے والے بھی تھے، مگر ہمارا زمانہ ایسا ہے کہ قوم کی ابتر حالت پر کوئی رونے والا بھی نہیں ہے۔ ہم نے حالی

سے کہا کہ اے میرے مخدوم خدا نے تم کو زبان دی ہے اور تم نہیں بولتے، خدا نے تم کو معجز بیانی دی ہے اور تم کوئی معجزہ نہیں دکھاتے، خدا نے تمہاری آنکھ میں ابرنیساں سے بہتر آنسو بھرے ہیں اور تم ایک بھی نہیں بہاتے، یقین کرو کہ ابرنیساں صدف کے دل میں جاتا ہے مگر تمہارا آنسو انسان کے دل میں جائے گا لِلّٰہ قوم کے حال پر روؤ اور قوم کی جو تباہ حالت ہے اس پر مثل قرطبی ایک مرثیہ لکھ دو۔ سرسید کی ترغیب، مقامی اور عالمی حالات نے حالی پر اثر ڈالا اور انہوں نے ایک وسیع پس منظر میں قوم کے لیے ایک آئینہ خانہ مہیا کر دیا۔

مسدس کا جو اثر دہقانیوں پر ہوا تھا اس کا ذکر مولوی عبدالحق نے کیا ہے لیکن اہل علم پر مسدس کے اثر کا ایک واقعہ عبدالرزاق کانپوری نے لکھا ہے۔ مولوی فرید الدین سب جج کانپور نے ایک محفل میلاد ترتیب دی جس میں مشاہیر شعرا کو مدعو کیا اور جب انہوں نے محل ولادت کے موقع کے مسدس کے بند سنائے تو ان کی حالت ویسی ہی ہو گئی جیسے شعرائے جاہلیت کی عرب میں قرآن سن کر ہوتی تھی۔ مصنف البرامکہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ مسدس کے بعض بند ایسے ہیں کہ جب تک تاریخ اسلام کے پانچ ہزار اوراق نہ پڑھے جائیں ہرگز نہیں لکھے جا سکتے۔

مدرسۃ العلوم کا افتتاح ایک تاریخ ساز واقعہ تھا۔ اس موقع پر کئی شعرا نے قطعات تاریخی پیش کیے جن کا ذکر حالی نے حیات جاوید میں کیا ہے۔ حالی نے بھی گیارہ شعر کا ایک قطعۂ تاریخ کہا جس پر سرسید نے یہ نوٹ لکھا کہ اس کے ایک ایک شعر سے مبارک، سلامت کی صدائیں نکل رہی ہیں یہی نہیں بلکہ اس سے ان کی زبان کا اعجاز بھی ظاہر ہوتا ہے۔ حالی نے ایک درجن سے زائد ایسی نظمیں کہی ہیں جن میں سرسید کی شخصیت اور علی گڑھ تحریک کے اساسی پہلوؤں کا بڑی خوبصورتی سے احاطہ کیا گیا ہے۔

حالی کو کئی مواقع حاصل تھے کہ اپنی نظموں کا حوالہ حیات جاوید میں دے سکتے تھے لیکن کسی ایک نظم کا بھی ذکر حیات جاوید میں نہیں ملتا۔ علی گڑھ کالج کی ادھوری عمارتوں کو

جب حالی نے پہلی بار دیکھا تو بے اختیار لکھا کہ جو مسرت اس مدرسہ کو دیکھ کر خود بخود جوش میں آتی ہے وہ کسی دوسری جگہ دیکھی نہیں گئی، جو شعر نظیری نے بیت اللہ شریف کی زیارت کے وقت پڑھا تھا اس مدرسہ کو دیکھ کر ہمیں یاد آیا

ایں کعبہ را بہانہ بباطل نہادہ اند
صد معنی و جمال دریں گل نہادہ اند

جب مدرسۃ العلوم کو تیسری مرتبہ دیکھا تو بے اختیار اس کی روز افزوں ترقی پر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے لکھا کہ ہم کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ اولوالعزم اور مستقل مزاج آدمی اپنے ارادوں کی مزاحمت سے اور زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔

علی گڑھ کالج کے صدر دروازے پر عربی اشعار کندہ ہیں جن کا اردو ترجمہ یہ ہے کہ قوم کے بزرگوں نے جو غفلت کے اندھیروں کے لیے مثل چراغوں کے ہیں، ایک عالی شان مکان بنایا جس کی بنیاد تقوی الٰہی پر ہے تا کہ اس میں علوم دینی اور دنیوی پڑھائے جائیں اور عالم کے اخلاق شائستہ بنائے جائیں۔ یہ عربی اشعار اصلاح کے لیے سرسید نے حالی کو بھیجے تھے۔ اپنے خط میں حالی لکھتے ہیں کہ ان دونوں شعروں میں لفظاً اور معنیً کوئی خلل معلوم نہیں ہوتا مگر پہلے تین مصرعوں کا وزن ٹھیک نہیں ہے میں نے جرأت کر کے پہلے تین مصرعوں میں کسی قدر تصرف کیا ہے اور چوتھا مصرعہ بدستور رہنے دیا ہے خدا کرے آپ کو پسند آجائے۔

سرسید کے ایما پر مولوی ذکاء اللہ نے علی گڑھ کالج کے قیام سے پہلے ہی اس کے لیے ہندوستان کی تاریخ کا نصاب تیار کر دیا تھا۔ اسی طرح مدرسۃ العلوم میں بعض جماعتوں کے لیے فارسی کا نصاب حالی نے تیار کیا تھا ایک خط میں لاہور سے لکھتے ہیں کہ جو کتابیں اور مضامین مرے نزدیک پڑھانے کے قابل ہیں وہ یہ ہیں توقیعات کسریٰ، زلیخائے فردوسی، غالب کے باقی قصیدوں کی تشبیہات، فیضی کے اکثر قصائد جن کو میں عرفی کے قصائد سے

بمراتب بہتر جانتا ہوں، نظیری کے قصائد فتح کوٹ کانگڑہ کی پانچ نثروں میں سے ایک دو نثر یہ کتاب جلالائے طباطبائی کی عمدہ منشات میں سے ہے اس میں ایک مضمون کو پانچ اُسلوب سے بیان کیا گیا ہے جن میں سے ہر اُسلوب بہ نسبت دوسرے اُسلوب کے مشکل یا آسان ہوتا چلا گیا ہے۔ اگر یہ صورت حضور کو منظور نہ ہو تو پانچ جماعتوں میں سے ایک جماعت کے لیے جس کو آپ اختیار کریں انتخاب کرنے کا میں ذمہ دار ہوتا ہوں۔ بہر حال جو کچھ آپ کی رائے مبارک میں مناسب ہو جلد تر مطلع فرمایئے۔

مغربی اور مشرقی علوم کے سنگم کی حیثیت سے جس صحت مند تہذیبی اور علمی روایت کی طرح مدرستہ العلوم نے ڈالی تھی اس نے اس کالج کو حالی کے خوابوں کا کالج بنا دیا تھا۔ وہ اسے قومی جدوجہد کا ثمرہ نئے رجحان کا ترجمان اور پستی سے عروج کی طرف حرکت کا نشان سمجھتے تھے۔ کہتے ہیں:

یہ کالج قوم کو آپ اپنے بل چلنا سکھاتا ہے
سہارا غیر کا چھوڑیں یہ ایک اک کو بجھاتا ہے

اس بیت العلم کی اقامتی زندگی کا بڑے فخر سے ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں

نہ دیکھا ہو جنہوں نے پیار ہندو اور مسلماں میں
وہ آکر مسلم و ہندو کو یک جان و دو تن دیکھیں
اگر باور نہ ہو اخلاص سنی اور شیعی کا
بہم شیر و شکر یاں چار یار و پنجتن دیکھیں
پھر ان کے بعد دیکھیں گر مربی اپنے بچوں کا
تو ایک بچوں سے بڑھ کر زندہ دل پیر کہن دیکھیں
خوشی میں رنج میں صحت میں بیماری میں دکھ سکھ میں
اسے جب آکے دیکھیں قوم کی دھن میں مگن دیکھیں

کالج کے طالب علموں میں قومی احساس اور علمی مذاق پیدا کرنے کی غرض سے حالی نے سرسید سے خواہش ظاہر کی کہ وہ کالج کیمپس میں رہنا چاہتے ہیں۔ سرسید اس کے جواب میں بے پایاں مسرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں ہماری اس خوشی اور فخر کا منشا یہ ہے کہ ہماری قوم کے باعث افتخار، مولوی خواجہ الطاف حسین حالی ایک مہینے سے زیادہ ہوا کہ یہاں تشریف رکھتے ہیں انہوں نے ایک چھوٹا بنگلہ ان بنگلوں میں سے جو احاطہ مدرسۃ العلوم کے اندر واقع ہیں، اپنے رہنے کو پسند کیا ہے اور ان کا مصمم ارادہ ہے کہ علی گڑھ کالج کے احاطہ میں رہیں جہاں کثرت سے نوجوان طالب علم جمع ہیں۔ ہم اور ہمارے کالج کے طالب علم اس پر جس قدر فخر کریں بجا ہے۔ کیا عجب ہے کے ہمارے کالج کی زمین کی قسمت میں یہ اعزاز لکھا ہے کہ وہ ایسے علم دوست بزرگ کے پاؤں تلے روندی جاوے'' حالی اور علی گڑھ کے روابط کے سلسلے میں یہ معروضات نہ مبسوط ہیں اور نہ مفصل لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ علی گڑھ تحریک کے تناظر میں حالی کے فکر وفن کے بازیافت کی باقاعدہ کوشش کی جائے۔

غالبؔ اور انقلاب ۱۸۵۷ء

مصنفہ

ڈاکٹر معین الرحمٰن

مرزا غالبؔ نے انقلاب ۱۸۵۷ء کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ اس کتاب میں ایسی تمام تحریروں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

"دستنبو" بھی مرزا غالب کا نثری کارنامہ ہے اس میں غالب نے ابتدائے ۱۸۵۷ء سے ۳۱ / جولائی ۱۸۵۸ء تک اپنی سرگزشت رقم کی تھی۔ کتاب فارسی زبان میں تھی۔ غالبؔ اور انقلاب ۱۸۵۷ء میں "دستنبو" کی پہلی اشاعت کا متن فوٹو آفسیٹ کے ذریعے شامل کیا گیا ہے اور ساتھ ہی فارسی متن کا اردو ترجمہ ہے جو رشید حسن خاں نے کیا ہے۔ مصنف نے اپنے عالمانہ تفصیلی مقدمے میں دستنبو کے زمانۂ تحریر اور وجوہ تحریر کے متعلق سیر حاصل بحث کی ہے۔

صفحات ۳۶۸ قیمت ۶۰ روپے

عبدالغفار شکیل

حالی کا لسانی شعور اور اُسلوب

حالی کے ذہنی ارتقا میں ان کے لسانی و ادبی شعور کو بڑا دخل ہے۔ اُن کی علمی لیاقت، غالب اور شیفتہ کی صحبت میں ان کے شعری مذاق کی تربیت، اردو شعر و ادب کے مطالعے کی وسعت، سرسید کی تحریک میں شرکت، کرنل ہالرائیڈ اور محمد حسین آزاد کے ساتھ لاہور میں انجمن پنجاب کے جدید نظم کے مشاعروں کے آغاز اور لاہور ہی میں اپنی ملازمت کے دوران انگریزی زبان و ادب کی خوبیوں سے واقفیت کی وجہ سے حالی کے لسانی و ادبی شعور میں پختگی، بالیدگی، گہرائی اور گیرائی آئی جس کا ثبوت ہمیں اُن کے شعری و ادبی کارناموں میں ملتا ہے۔

حالی کے فکر و فن پر ان کے بعد کئی لوگوں نے لکھا ہے مگر انہوں نے زبان و بیان کے بارے میں اپنے جو خیالات پیش کیے ہیں اس پہلو پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ مقدمۂ شعر و شاعری میں حالی نے کئی جگہوں پر الگ الگ شعر و شاعری میں زبان کے الفاظ و

تراکیب، روزمرہ، محاورں اور استعاروں کے استعمال کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ''زبان'' انسانی خیالات، جذبات اور احساسات کے اظہار ہی کا وسیلہ نہیں شعروادب کی تخلیق کا بھی ذریعہ ہے۔ شعروادب میں زبان کے استعمال کے اسرار و رموز سے واقفیت ہر شاعر اور ہر ادیب کے لیے ناگزیر ہے۔ اسی وجہ سے حالی نے مقدمۂ شعروشاعری میں اردو زبان کے لسانی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

مقدمے کے ابتدائی صفحات میں حالی نے شعروشاعری کی اہمیت وافادیت کے بارے میں عمومی بحث کی ہے شاعری میں قدماء کی تقلید کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ تقلید سے صرف شاعری ہی کو نہیں زبان کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ کہتے ہیں

> ''اب جو پچھلوں نے اگلوں کی تقلید کرنی شروع کی تو نہ صرف مضامین میں بلکہ خیالات میں، الفاظ وتراکیب میں، اسالیب میں، تشبیہات میں، استعارات میں، بحر میں، قافیہ میں، ردیف میں غرض کہ ہر ایک بات اور ہر ایک چیز میں ان کے قدم بہ قدم چلنا اختیار کیا۔ پھر جب ایک ہی لکیر پیٹتے پیٹتے زندگی اجیرن ہوگئی تو نہایت بھونڈے اختراع ہونے لگے''۔[۱]

حالی کی نظر میں بری شاعری یعنی جھوٹی شاعری سے بھی زبان کو نقصان پہنچتا ہے۔ کس طرح؟ اس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں

> ''شاعری جب بگڑ جاتی ہے تو اس کی زہریلی ہوا سوسائیٹی کو بھی سخت نقصان پہنچاتی ہے جب جھوٹی شاعری کا رواج قوم میں ہوجاتا ہے تو جھوٹ اور مبالغہ سے سب کے کان مانوس ہوجاتے ہیں۔ جس کے شعر میں زیادہ جھوٹ یا

نہایت مبالغہ ہوتا ہے اسی کی شاعری کو زیادہ داد ملتی ہے
ایسی شاعری جس میں جھوٹ اور مبالغہ ہے اور لوگ اُسے
پسند کرنے لگیں اس کا اثر مصنفوں کی تحریر اور فصحاء کی تقریر،
خواص اور اہل ملک کے روزمرہ اور بول چال تک پہنچتا ہے
اس لیے کہ ہر زبان کا نمایاں اور برگزیدہ حصہ وہی الفاظ و
محاورات اور ترکیبیں سمجھی جاتی ہیں جو شعرا کے استعمال میں
آجاتے ہیں پس جو شخص ملکی زبان کی تحریر یا تقریر یا روزمرّہ
میں امتیاز حاصل کرنا چاہتا ہے، اس کو بالضرور شعراء کی
زبان اتباع کرنا پڑتا ہے اور اس طرح مبالغے زبان کی رگ
و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔ شعراء کی ہزل گوئی سے زبان
میں کثرت سے نامہذب اور فحش الفاظ داخل ہو جاتے ہیں
کیونکہ لغات میں وہی الفاظ مستند اور ٹکسالی سمجھے جاتے
ہیں جن کی توثیق و تصدیق شعرا کے کلام سے کی گئی ہو"۔[۱]

تقلید اور جھوٹی شاعری سے شاعری چند مضامین میں محدود ہو جاتی ہے تو "زبان بجائے اسکے کہ اس کا دائرہ وسیع ہو وہ اپنی قدیم وسعت بھی کھو بیٹھتی ہے۔ زبان کا وہ حصہ جس کے ذریعے سے شاعر اپنے چند معمولی مضامین ادا کرتا ہے زیادہ تر وہی مانوس اور فصیح گنا جاتا ہے اور باقی الفاظ و محاورات غریب اور وحشی خیال کیے جاتے ہیں۔ پس سوا اس کے کچھ ان میں سے اہل زبان بول چال میں کام آئیں یا لغت کی کتابوں میں بند پڑے رہیں ایک مدت کے بعد متروک الاستعمال ہو جائیں اور کسی مصرف میں نہیں آئے۔ مصنفوں کو تحریر میں اور فصحاء کو تقریر میں ان سے کچھ مدد نہیں پہنچتی۔ قدماء کی تقلید کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ جن لفظوں میں بہ ضرورتِ شعر انہوں نے تصرف کیا ہے ان کے سوا کسی لفظ میں

کوئی تصرف نہیں کرسکتا جو محاورے جس پہلو وہ برت گئے ہیں وہ دوسرے پہلو ہرگز نہیں برتے جاسکتے۔ جو تشبیہیں اُن کے کلام میں پائی گئی ہیں اسے تجاوز نہیں کیا جاسکتا۔

حالی شاعری کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ ایک سلطنت کے مانند ہیں جس میں عالم محسوسات، دولت کے انقلابات، سیرتِ انسانی، معاشرتِ نوعِ انسانی تمام چیزیں جو فی الحقیقت موجود ہیں اور تمام وہ چیزیں جن کا تصور مختلف اشیاء کے اجزاء کو ایک دوسرے سے ملا کر کیا جاسکتا ہے سب شاعری کی سلطنت میں محصور ہیں۔ شاعری کی قلمرو اسی قدر وسیع ہے جس قدر خیال کی قلمرو۔

شاعری کے لیے حالی نے تین شرطیں لازمی بتائی ہیں (۱) تخیل (۲) کائنات کا مطالعہ اور (۳) تفحصِ الفاظ۔ پہلی شرط یعنی "تخیل (imagination) یعنی قوتِ متخیلہ کو شاعری کے لیے سب سے مقدم اور ضروری چیز قرار دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ یہی وہ چیز ہے جو شاعری اور غیر شاعری میں فرق پیدا کرتی ہے۔ تخیل کو دور از کار نہیں ہونا چاہیے اس میں وہ مشاہدے کی اہمیت پر بھی زور دیتے ہیں۔ وہ ایک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا ذخیرہ جو تجربہ یا مشاہدہ کے ذریعے سے ذہن میں پہلے سے مہیا ہوتا ہے یہ اس کو مکرر ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشتی ہے اور پھر اس کو الفاظ کے ایسے دلکش پیرائے میں جلوہ گر کرتی ہے جو معمولی پیرایوں سے بالکل یا کسی قدر الگ ہوتا ہے، تخیل کا عمل اور تصرّف جس طرح خیالات میں ہوتا ہے اسی طرح الفاظ میں بھی ہوتا ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے ایک جگہ لکھا ہے "تخیل کی شاعری چونکا دینے والی ہوتی ہے۔ یہ تشبیہہ اور استعارات سے مملو ہوتی ہے فعل کے بجائے صفات کا استعمال کثرت سے ملتا ہے۔ جس سے اکثر شعر چیستاں میں تبدیل ہو جاتا ہے"۔

دوسری شرط، کائنات کا مطالعہ اور اُس میں بھی فطرتِ انسانی کا مطالعہ شاعری میں کمال حاصل کرنے کی لیے ضروری ہے۔ انسانی فطرت اُس کی زندگی کی مختلف حالتوں کو

عمیق نگاہوں سے دیکھنا اور جو رموز مشاہدے میں آئیں ان کو الفاظ کی مدد سے ترتیب دینے سے سفر تخلیق پاتا ہے۔

تیسری شرط تفحص الفاظ ہے "تفحص" کے معنی ہیں ڈھونڈنا، تلاش کرنا، جستجو کرنا، حالی اس شرط کو شعری لسانیات کے نقطۂ نظر سے اہم قرار دیتے ہیں۔ تفحص الفاظ اس لیے ضروری ہے کہ شعر کی ترتیب کے وقت متناسب الفاظ کا انتخاب کر کے پھر ان کو ایسے طور پر ترتیب دینا کہ شعر سے معنی مقصود کے سمجھنے میں مخاطب کو کچھ تردد باقی نہ رہے اور خیال کی تصویر ہو بہو آنکھوں کے سامنے آجائے۔ اگر شاعر زبان کے ضروری حصے پر حاوی نہیں اور ترتیب شعر کے وقت صبر و استدلال کے ساتھ الفاظ کا تفحص اور تتبع نہیں کرتا تو محض قوت متخیلہ کچھ کام نہیں آسکتی۔

حالی لفظ اور خیال کے باہمی رشتے سے باخبر تھے کیونکہ یہ دونوں الگ الگ ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں کیونکہ ہر خیال اپنے ساتھ الفاظ بھی لاتا ہے الفاظ کے بغیر خیال نہیں اور خیال کے بغیر لفظ نہیں دونوں لازم وملزوم ہیں۔ حالی کا یہ خیال درست ہے کہ جو شاعر لفظ کی قدر و قیمت سے واقف ہوتا ہے وہ جانتا ہے کہ کون سا لفظ کیا اثر رکھتا ہے اور اس کے اختیار کرنے یا ترک کرنے سے کیا خاصیت بیان میں پیدا ہوتی ہے اگر چہ وزن اور قافیہ کی قید ناقص اور کامل دونوں قسم کے شاعروں کو اکثر ایسے لفظ کے استعمال پر مجبور کرتی ہے جو خیال کو بخوبی ادا کرنے سے قاصر ہے۔ ناقص شاعر تھوڑی سی جستجو کے بعد اسی لفظ پر قناعت کر لیتا ہے اور کامل جب تک زبان کے تمام کنوئیں نہیں جھانک لیتا تب تک اس لفظ پر قانع نہیں ہوتا۔ شاعر جب تک الفاظ پر کامل حکومت اور ان کی تلاش و جستجو میں نہایت صبر و استقلال حاصل نہ ہو ممکن نہیں کہ وہ جمہور کے دلوں پر بالا استقلال حکومت کر سکے۔

فکر شعر کے وقت شاعر کو جن اُمور کا لحوظ رکھنا ضروری ہے اُس کی طرف اشارہ

حالی یوں کرتے ہیں

''اول خیالات کو صبر و تحمل کے ساتھ الفاظ کا لباس پہنانا، پھر انکو جانچنا اور تولنا اور ادائے معنی کے لحاظ سے ان میں جو قصور رہ جائے اس کو رفع کرنا، الفاظ کو ایسی ترتیب سے منتظم کرنا کہ صورتاً اگرچہ نثر سے متمیز ہو مگر معنی اسی قدر ادا کرے جیسے کہ نثر میں ادا ہو سکیں۔''[۵]

حالی نے لفظ اور معنی کے رشتے کے بارے میں پہلے ابن خلدون کی رائے پیش کی ہے کہ انشا پردازی کا ہنر نظم میں ہو یا نثر میں محض الفاظ میں ہے معانی میں ہرگز نہیں۔ معانی صرف الفاظ کے تابع ہیں اور الفاظ اصل ہیں۔ اگر ضرورت ہے تو صرف اس بات کی ہے کہ ان معانی کو کس طرح الفاظ میں ادا کیا جائے۔ ابن خلدون نے الفاظ کو پیالے اور معانی کو پانی کہا ہے۔ پانی چاہے سونے کے پیالے میں بھر لو چاہو چاندی کے پیالے میں، چاہو کانچ یا سیپ کے پیالے میں یا مٹی کے پیالے میں پانی کی ذات میں کچھ فرق نہیں آتا مگر سونے یا چاندی وغیرہ کے پیالے میں اس کی قدر بڑھ جاتی ہے اور مٹی کے پیالے میں کم ہو جاتی ہے۔

حالی ابن خلدون کے ان خیالات پر اپنی رائے یوں دیتے ہیں

''ہم یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ شاعری کا مدار جس قدر الفاظ پر اس قدر پر معانی پر نہیں۔ معنی کیسے ہی بلند اور لطیف ہوں اگر عمدہ الفاظ میں بیان نہ کیے جائیں گے ہرگز دلوں میں گھر نہیں سکتے اور ایک مبتذل مضمون پاکیزہ الفاظ میں ادا ہونے سے قابلِ تحسین ہو سکتا ہے لیکن معنی سے یہ سمجھ کر کہ وہ ہر شخص کے ذہن میں موجود ہیں اور اِن کے لیے کسی

ہنر کے اکتساب کی ضرورت نہیں بالکل قطع نظر کرنا ٹھیک
نہیں۔

شعر کی تخلیقی عمل کے سلسلے میں پروفیسر مسعود حسین خاں کی یہ بات بھی یہاں قابل غور ہے کہ یہ "عام انسانی عمل سے علیحدہ حیثیت نہیں رکھتا۔ زبان کی ایک عضویاتی اور صوتی بنیاد ضرور ہوتی ہے لیکن اس میں معنیاتی تبدیلیاں ذہنِ انسانی کے اس دباؤ کے تحت ہوتی ہیں جو ہر لحظہ اظہار کے لیے الفاظ کے معنی میں توسیع پیدا کرنا چاہتا ہے۔ تخلیقی عمل کی ابتداء فن اور لفظ دونوں سے پہلے ہوتی ہے"[۵]

ابن خلدون کی اوپر کی مثال سے حالی متفق نہیں اس لیے وہ کہتے ہیں

"ہم ان کی جناب میں عرض کرتے ہیں کہ حضرت اگر پانی کھاری یا گدلا یا بوجھل یا ادھن ہو گا یا ایسی حالت میں پلایا جائے گا جب کہ اس کی پیاس مطلق نہ ہو تو خواہ سونے یا چاندی کے پیالے میں پلایئے یا بلور کے پیالے میں وہ ہرگز خوشگوار نہیں ہو سکتا اور ہرگز اس کی قدر بڑھ نہیں سکتی"[۶]

حالی اپنی مشرقی تعلیم کی وجہ سے عربی زبان و ادب کے بڑے دلدادہ تھے۔ عربی شاعری، نقد و انتقاد کے بارے میں اُن کی معلومات خاصی تھیں اُنہوں نے مقدمۂ شعر و شاعری میں کئی عرب شعراء کا نام لیا ہے۔ حالی پیرو مشرق زیادہ تھے پیرو مغرب کم۔ مقدمہ لکھتے وقت اُن کو عربی کے مشہور عالم جلال الدین سیوطی کی کتاب "المزہر" کی شدید ضرورت پیش آئی جس کے بارے میں اُنہوں نے اپنے دوست کو خط لکھا۔

شعر میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ اس عنوان کے تحت حالی نے ملٹن کا حوالہ دیتے ہوئے تین باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے "شعر کی خوبی یہ ہے کہ سادہ ہو، جوش سے بھرا ہو اور اصلیت پر مبنی ہو۔ حالی کے ناقدین پروفیسر آل احمد سرور، کلیم الدین احمد، شمس الرحمٰن

فاروقی، عبادت بریلوی، محمد حسن عسکری، وارث علوی، ابوالکلام قاسمی، حامدی کاشمیری، احتشام حسین، وزیر آغا وغیرہ نے ملٹن کے اور عربی شعرا وغیرہ کے حوالے سے جو بات حالی نے کہی ہے اُس پر خوب بحث کی ہے اور اس سے حالی کی انگریزی سے ناواقفیت کی وجہ سے جو کسر رہ گئی ہے اُس پر ناقدانہ نظر ڈال کر نئی بصیرت پہنچائی ہے۔ حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری لکھتے وقت بیشتر عربی مآخذوں سے مدد لی ہے جن کے لکھنے والے جلال الدین سیوطی، ابن خلدون وغیرہ ہیں۔ حالی ایک طرف مآخذوں اور دوسری طرف انگریزی شعراء کے تنقیدی نظریوں سے مدد لے کر اپنی بات میں ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس عمل میں کہیں کہیں حالی کو وہ خود اعتمادی حاصل نہیں جس کی ضرورت تھی وہ کہیں کہیں تذبذب کا شکار بھی ہوئے ہیں۔ حالی کے ہاں جو تنقیدی تضادات ہیں اُن کے بارے میں پروفیسر ابوالکلام قاسمی کی یہ بات قابل غور ہے کہ ''حالی کے تضادات کو اُن کے نقادوں نے مغربی ادب سے اُن کی ناواقفیت پر محمول کیا ہے مگر یہ نقص حالی کے ہاں اس لیے پیدا ہوا ہے کہ حالی کی تنقید کا پورا ڈھانچہ مشرقی ہے۔''[۵]

شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون ''سادگی، اصلیت اور جوش'' مشمولہ فکر و نظر حالی نمبر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی خصوصی شمارہ ۱۹۹۱ء اس سلسلے میں نہایت اہم مضمون ہے جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ حالی جن خیالات کو ملٹن سے منسوب کرتے ہیں وہ ملٹن کے نہیں کولرج کے ہیں۔ فاروقی صاحب کو یہ بات ممتاز حسین سے معلوم ہوئی جس کا اُنہوں نے اعتراف کیا ہے۔

حالی کے خیال میں سادگی سے مراد الفاظ اور خیالات دونوں کی سادگی ہے یہ اس لیے ضروری ہے کہ شعر سمجھنے میں آسانی ہو، اصلیت کا مطلب یہ ہے کہ شاعر جو کچھ کہہ رہا ہے اُس میں اصلیت یعنی حقیقت ہو جوش سے مراد یہ ہے کہ مضمون ایسے بے ساختہ الفاظ اور مؤثر پیرایے میں بیان کیا جائے جس سے معلوم ہو کہ شاعر نے اپنے ارادے سے مضمون

نہیں باندھا ہے بلکہ خود مضمون نے شاعر کو مجبور کر کے اپنے تئیں اُس سے بندھوایا ہے
جوش سے یہ مراد نہیں کہ مضمون خواہ مخواہ نہایت زوردار اور جوشیلے لفظوں میں ادا کیا جائے۔
ممکن ہے الفاظ نرم ملائم اور دھیمے ہوں مگر ان میں غایت درجے کا جوش چھپا ہوا ہو" مثال
میں میر کا یہ شعر حالی نے لکھا ہے

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

اس کے بعد پھر وہ کہتے ہیں "مگر ایسے دھیمے الفاظ میں وہی لوگ جوش کو قائم رکھ
سکتے ہیں جو میٹھی چھری سے تیز خنجر کا کام لینا جانتے ہیں اور اس جوش کا پورا پورا اندازہ
کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو صاحب ذوق ہیں اور جن پر بے محل ہزاروں آہیں اور نالے اتنا
اثر نہیں کرتے جتنا کہ برمحل کسی کا ایک ٹھنڈا سانس بھرنا"[9]

حالی اپنے متقدمین اور اپنے عہد کے بہت سے شعراء کے اکثر کلام سے مطمئن
نہیں تھے کیونکہ انہیں کے الفاظ میں سنیے

"ہماری موجودہ شاعری کا دارومدار من کل الوجوہ یعنی نہ
صرف الفاظ و عبارات میں بلکہ خیالات و مضامین میں بھی
محض تقلید پر ہے اور جبکہ ہمارے ہاں یہ بات بالاتفاق تسلیم
کی گئی ہے کہ احسن الشعرا اکذبہ تو ہم کو اپنی شاعری کی موجودہ
حالت میں اصلیت اور جوش دونوں سے دست بردار
ہونا چاہیے"[10]

شاعر بننے کے لیے حالی جن باتوں پر زور دیتے ہیں وہ ہیں سبق استعداد، نیچر کا
مطالعہ اور کثرت سے اساتذہ کے کلام سے مطالعہ کرنا اور ان کے برگزیدہ کلام کا اتباع
کرنا اور اگر ہو سکے تو ان لوگوں کی صحبت سے فائدہ اٹھانا جو شعر کا صحیح مذاق رکھتے ہوں عام

اس سے کہ وہ شاعر ہوں یا نہ ہوں البتہ ان لوگوں کو جو مستند زبان پر کافی عبور نہیں رکھتے ممکن ہے محاورات کے استعمال میں شبہات واقع ہوں لیکن اِن شبہات کا رفع ہونا کسی مشاق و ماہر اُستاد پر موقوف نہیں ہے بلکہ وہ ہر صاحب زبان سے یہاں تک کہ ایک دو ماماں، ایک کنجڑن بلکہ ایک حلال خورنی سے بھی رفع ہوسکتے ہیں" مگر یہ بات حالی کے زمانے میں ہوسکتی ہے موجودہ زمانے میں اَب وہ اردو کی ٹکسال کہاں' وہ معیار کہاں!

سرسید اور حالی کے عہد میں انگریزی لفظ "نیچر" کی بڑی تشہیر ہوئی اِس کے ساتھ نیچرل کی بھی۔ مقدمہ شعروشاعری میں "نیچرل شاعری" کے عنوان کے تحت اس اصطلاح کی تعریف وتشریح یوں کی ہے۔ "نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظاً ومعناً دونوں حیثیتوں سے نیچرل یعنی فطرت یا عادت کے موافق ہو۔ لفظاً نیچرل کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور ان کی ترکیب و بندش تا بہ مقدور اس زبان کی معمولی بول چال کے موافق ہو جس میں وہ شعر کہا گیا ہے کیونکہ ہر زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ اس ملک والوں کے حق میں جہاں وہ زبان بولی جاتی ہے نیچر یا سکنڈ نیچر کا حکم رکھتے ہیں پس شعر کا بیان جس قدر بے ضرورت معمولی بول چال اور روزمرہ سے بعید ہوگا اسی قدر اَن نیچرل سمجھا جائے گا۔ نیچر کے معنی سے موافق ہونے سے یہ مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ دنیا میں ہوا کرتی ہیں یا ہونی چاہئیں بس جس شعر کا مضمون اس کے خلاف ہوگا وہ اَن نیچرل سمجھا جائے گا"[۱]

نیچرل اور اَن نیچرل اشعار سے متعلق حالی نے چند شعر بھی پیش کیے ہیں لفظاً و معناً نیچرل شعروں میں مومن کا یہ شعر نیچرل ہے

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

غالب کا یہ شعر بھی

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

ناسخ کا یہ شعر صرف لفظاً نیچرل ہے

کبھی ہے دھیان عارض کا کبھی یاد مژہ دل کو
کبھی ہیں خار پہلو میں کبھی گلزار پہلو میں

آخر میں حالی کہتے ہیں "یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ متاخرین کی شاعری ہمیشہ اُن نیچرل ہوتی ہے۔ نہیں۔ بلکہ ممکن ہے کہ متاخرین میں کچھ ایسے بھی لوگ ہوں جو قدماء کی جولانگاہ کے علاوہ ایک دوسرے میدان میں طبع آزمائی کریں یا اسی جولانگاہ کو کسی قدر وسعت دیں یا زبان میں بہ نسبت متقدمین کے زیادہ گھلاوٹ اور لوچ اور وسعت اور صفائی پیدا کرسکیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں میر انیس نے مرثیے کو بے انتہا ترقی دی۔ نواب مرزا شوق نے مثنوی کو زبان اور بیان کے لحاظ سے بہت صاف کیا ہے اسی طرح دلّی میں ذوق، ظفر اور خاص کر داغ نے غزل کی زبان میں نہایت وسعت اور صفائی اور بانکپن پیدا کردیا ہے"[۱]

شاعر کو اِن دو باتوں کے علاوہ ایک تیسری بات پر بھی عمل کرنا چاہیے وہ ہے زبان کو درستی کے ساتھ استعمال کرنا۔ حالی اس کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ اگرچہ اردو کم و بیش تمام اطراف ہندوستان میں متداول ہے لیکن ممکن ہے کہ بعض جگہوں کے باشندے اپنی خاص زبان میں بہ نسبت اردو زبان کے زیادہ آسانی سے شعر سرانجام کرسکیں پس اگر ہمارے ہم وطنوں میں کوئی شخص اپنی خاص زبان میں شعر کہنا چاہے تو اس سے بہتر کوئی بات نہیں ہے کیونکہ مادری زبان سے بہتر اور سہل تر کوئی آلہ اظہارِ خیالات کا نہیں ہوسکتا۔ بس جیسا کہ ملکۂ شاعری ایک فطری جبلی چیز ہے اسی طرح اس کو کام میں لانے کے لیے ایسے آلہ کا استعمال زیادہ مناسب ہوگا جو بہ منزل فطری اور جبلی چیزوں کے ہو اور وہ مادری زبان

کے سوا کوئی اور زبان نہیں ہو سکتی ۔[۱۱]

حالی کے عہد میں اردو تقریباً پورے شمالی ہند میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان تھی کئی ایک ہندو شاعروں اور ادیبوں نے نظم و نثر میں اپنی تخلیقات سے اردو ادب کو مالا مال کیا۔ انیسویں صدی میں دِلّی اور لکھنؤ اردو زبان اور ادب بڑے مرکز تھے یہاں کی بول چال، روزمرہ، محاورے ٹکسالی مانے جاتے تھے اور پورے ملک میں ادبا و شعرا دِلّی یا لکھنؤ کی اردو زبان کو معیاری و ٹکسالی زبان تسلیم کر کے اسی کی تقلید کرتے تھے۔ حالی کہتے ہیں:

"ہندوستان میں جیسا کہ عموماً تسلیم کیا جاتا ہے صرف دو شہر ہیں جہاں کی اردو معتبر سمجھی جاتی ہے۔ 'دلی' اور 'لکھنؤ'۔ دِلّی کی زبان اس لیے ٹکسالی زبان سمجھی جاتی ہے کہ اردو کا حدوث اور نشو و نما اسی خطّہ میں ہوا ہے۔ لکھنؤ کی زبان کو اس واسطے مستند مانا جاتا ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کی ابتداء سے شرفا سے دہلی کے بے شمار خاندان ایک مدتِ دراز تک لکھنؤ میں جا جا کر آباد ہوتے رہے اور ہمیشہ کے لیے وہیں رہ پڑے پس ہندوستان کے کسی شہر کو اہلِ دِلّی سے اس قدر میل جول کا موقع نہیں ملا جس قدر کہ لکھنؤ کو ملا ہے یہاں تک کہ دونوں شہروں کی زبان میں ایک خاص مماثلت پیدا ہوگئی اور خاص خاص الفاظ و محاورات کے سوا دونوں جگہ کی بول چال اور لب و لہجے میں کوئی معتد بہ فرق نہیں معلوم ہوتا۔"

حالی کو اردو کی کم مائگی کا شدید احساس تھا کیونکہ ان کے سامنے عربی، فارسی اور

انگریزی زبانیں تھیں جو اردو کے مقابلے میں کافی ترقی یافتہ تھیں۔ اردو کی ترقی کے لیے حالی ایک جامع ڈکشنری کے تیار کرنے پر زور دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ اردو کی ایک جامع گریمر کے مرتب ہونے کی خواہش کرتے ہیں علاوہ ان باتوں کے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ''سب سے زیادہ مفید اہلِ زبان کی صحبت اور ان کی سوسائیٹی میں اتنی مدت تک رہنا ہے کہ ان کے الفاظ، محاورات بقدر معتد بہ نامعلوم طور پر زبان پر چڑھ جائیں لیکن چونکہ ایسا موقع ہر شخص کو ملنا دشوار ہے اس لیے ضرورت ہے کہ شعراء اہل زبان کا کلام جس قدر زیادہ ممکن ہو غور اور توجہ سے بار بار دیکھا جائے نہ اس ارادے سے کہ خیالات اور مضامین میں ان کی تقلید کی جائے بلکہ اس نظر سے کہ وہ الفاظ و محاورات کو کس طرح استعمال کرتے ہیں اور خیالات کو کن اُسلوبوں اور کن پیرایوں میں ادا کرتے ہیں جو لوگ محض زبان سے غرض رکھتے ہیں ان کو خیالات کی لغویت اور مضامین کی بے ہودگی سے چشم پوشی کرنا چاہیے اور نہایت صبر و تحمل کے ساتھ الفاظ و محاورات اور طرز ادا اور اندازِ بیان پر ہمت مقصود رکھنی چاہیے۔ نظم کے علاوہ اردو لٹریچر میں جس قدر علمی تاریخی مذہبی اور اخلاقی مضامین پر مستند اہل زبان نے کتابیں لکھی ہیں ان سے بھی فائدہ اٹھانا چاہیے''[۱۱]

اردو پر قدرت حاصل کرنے کے لیے حالؔی نے جن باتوں پر عمل کرنے کا مشورہ دیا ہے اُن کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ صرف دلّی یا لکھنؤ کی زبان کا تتبع ہی کافی نہیں اِن کے علاوہ عربی اور فارسی میں کم سے کم متوسط درجے کی لیاقت اور نیز ہندی بھاشا میں فی الجملہ دستگاہ بہم پہنچائی جائے۔ حالی کا لسانی شعور گہرا تھا جس نے اُن سے یہ بات کہلوائی۔ حالی زبان اور زبانوں کے معاملے میں غیر متعصب تھے اِس لیے انہوں نے ہندی زبان میں بھی مہارت پر زور دیا۔ وہ کہتے ہیں ''اردو زبان کی بنیاد جیسا کہ معلوم ہے ہندی بھاشا پر رکھی گئی ہے اس کے تمام افعال اور تمام حروف اور غالب مع اسماء کا ہندی سے ماخوذ ہے اور اردو شاعری کی بنا فارسی شاعری پر جو عربی شاعری سے مستفاد قائم ہوئی ہے نیز اردو زبان

میں بہت بڑا حصہ اسماء کا عربی اور فارسی سے ماخوذ ہے پس اردو زبان کا شاعر جو ہندی بھاشا کو مطلق نہیں جانتا اور محض عربی و فارسی کی تان گاڑی چلاتا ہے وہ گویا اپنی گاڑی، بغیر پہیوں کے منزل مقصود تک پہنچانی چاہتا ہے اور جو عربی فارسی سے نابلد ہے اور صرف ہندی بھاشا یا محض مادری زبان کے بھروسے پر اس بوجھ کا متحمل ہوتا ہے وہ ایک ایسی گاڑی ٹھیلتا ہے جس میں بیل نہیں جوتے گئے''۔[۹]

اُس وقت لکھنؤ میں ناسخ کی وجہ سے اردو زبان میں اصلاح کی جو لہر چلی اور ہندی الفاظ کو متروک قرار دے کر انکی جگہ فارسی عربی الفاظ کے استعمال پر جو زور دیا گیا وہ حالی کی نظر میں مستحسن اقدام نہیں تھا وہ کہتے ہیں کہ اس سے اردو زبان کا دائرہ روز بروز تنگ ہو رہا ہے اسی لیے وہ نیچرل شاعری میں ہندی کے عام فہم استعمال کے بھی حق میں ہیں اردو زبان میں وسعت کے لیے عربی فارسی الفاظ ہی نہیں بلکہ ہندی الفاظ کا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ حالی نے ہندی الفاظ کو اپنی شعروشاعری اور نثری تحریروں دونوں میں بے تکلفی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ حالی نے ایک اور قدم آگے بڑھایا تھا یعنی اپنی تحریروں میں یہاں تک شاعری میں بھی انگریزی الفاظ استعمال کیے۔

۱۔ مقدمہ شعروشاعری از حالی، ص۱۰۲

۲۔ مقدمہ شعروشاعری از حالی، ص۱۰۳

۳۔ مقدمہ شعروشاعری از حالی، ص۱۰۳

۴۔ شعروزباں، پروفیسر مسعود حسین خاں، ص۶

۵۔ مقدمہ شعروشاعری از حالی، ص۱۲۰

۶۔ شعروزبان از مسعود حسین خاں، ص۸

۷۔ مقدمہ شعروشاعری از حالی، ص۱۲۲

۸۔ فکرونظر، حالی نمبر مضمون مشرقی روایت اور حالی کی تنقید، از پروفیسر ابوالکلام قاسمی، مضمون مشمولہ فکرونظر حالی نمبر، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۹۱ء

۹۔ مقدمہ شعروشاعری از حالی، ص۱۳۶

۱۰۔مقدمہ شعروشاعری از حالی، ص ۱۴۹
۱۱۔مقدمہ شعروشاعری از حالی، ص ۱۵۹
۱۲۔مقدمہ شعروشاعری از حالی، ص ۱۶۷
۱۳۔مقدمہ شعروشاعری از حالی، ص ۱۶۸
۱۴۔مقدمہ شعروشاعری از حالی، ص ۱۷۰
۱۵۔مقدمہ شعروشاعری از حالی، ص ۱۷۲

غالبؔ کے چند نقّاد

مصنف: ڈاکٹر سلمان اطہر جاوید

اس کتاب کے ذریعہ غالبؔ کے نقادوں کے فن کے بارے میں مفید اطلاع ملتی ہے۔ دوسرے غالبؔ کی شخصیت اور فن کے تعلق سے بہت مفید معلومات کا وسیلہ یہ کتاب فراہم کرتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب ایک طرف تو غالب شناسوں میں اور دوسری طرف اردو کے تنقیدی ادب میں مفید اضافہ ہے۔

خوب صورت طباعت عمدہ گٹ اپ

صفحات ۲۴۴

قیمت ۶۰ روپے

اقتدار حسین صدیقی

پانی پت کی ثقافتی تاریخ

ریاست ہریانہ کا شہر پانی پت تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ پانی پت کے اردگرد کا علاقہ بارہویں صدی کے آخر تک ہندو تہذیب اور ہندو مذہبی روایت کا گہوارہ تھا۔ زمانہ قدیم میں اندر پرستھ (قدیم دہلی) تک ہندوؤں کے متعدد تیرتھ استھان موجود تھے۔ ۱۱۹۲ء تک اس علاقے کے ہندوؤں کے بیرونی یعنی اسلامی اثرات سے متاثر ہونے یا روشناس ہونے کی تاریخی شہادت نہیں ملتی ہے۔ حالانکہ آٹھویں صدی عیسوی کی ابتدا سے سندھ اور ملتان عربوں کے زیر حکومت رہے۔ گیارہویں صدی عیسوی سے شمالی اور مغربی پنجاب کے ہندو بھی سلطان محمود غزنوی اور اس کے جانشینوں کے زیر حکومت رہنے کی وجہ سے مسلم تہذیب سے متاثر ہو گئے تھے۔ پنجاب اور سندھ علاقوں کے باشندوں پر عربی اور فارسی زبانوں کے اثر کے علاوہ مسلمانوں کے لباس، رہن سہن اور لباس پر بھی گہرا اثر ہوا تھا۔ جس کے نتیجے میں مخلوط ثقافت کا فروغ ہوا۔ لیکن ۱۱۹۲ء میں ترائن کی دوسری لڑائی میں راجستھان اور ہریانہ کے فرمانروا پرتھوی راج پر سلطان معزالدین محمد بن سام کی فتح نے ہریانہ پر مسلم تسلط قایم کر دیا۔ فاتح سلطان نے ہریانہ کو اپنی سلطنت میں شامل کر کے اس کی گورنری

(سپہ سالاری) اپنے غلام جنرل ملک قطب الدین ایبک کے ذمہ کی۔ ایبک ایک اہل فوجی جنرل ہی نہیں تھا بلکہ فیاضی، علم دوستی اور مذہبی رواداری میں بھی بے مثال تھا۔

سلطان کی واپسی پر ایبک نے ہریانہ ہی میں اپنی طاقت کو مستحکم نہیں کیا بلکہ میرٹھ اور دہلی پر بھی قبضہ کرلیا۔ چونکہ شمالی ہندوستان کی فتح کے لیے قصبہ تہرام کی بجائے دہلی کا جائے وقوع فوجی نقطۂ نظر سے زیادہ اہم تھا اس لیے ایبک نے اسے فوجی مرکز بنالیا۔ اس تبدیلی کا پانی پت اور ان تمام قصبات پر بڑا اچھا اثر پڑا جو کہ لاہور سے دہلی کی شاہراہ پر واقع تھے۔ ایبک کی فیاضی اور فتوحات کی شہرت سے متاثر ہوکر غزنہ اور خراسان سے اہل دانش اور ہنر کی آمد شروع ہوگئی۔ دہلی جو کہ عصامی کے بیان کے مطابق ایک پرگنہ کا معمولی سا مرکز تھا، شہر کی صورت میں تبدیل ہوگیا۔ بیرونی ممالک سے تجارت کے کارواں بھی آنے لگے جو کہ دوران سفر شاہراہ پر مختلف قصبات میں قیام پذیر تھے۔ تجار اور دوسرے مسافروں کی سہولت اور آرام کے لیے مسلم تہذیبی روایت کے مطابق قصبات سے ملحق خانقاہیں اور کنویں تعمیر کرائے۔ امن وامان کے قیام کے لیے ہر قصبہ میں فوجی چھاونی قایم کی گئی، مسلم فوجیوں کی مذہبی رہنمائی اور ان کے بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے علما اور فضلا کو وظائف اور ملک کے طور پر زمینیں عطا کرکے آباد کیا گیا۔ اس طرح ہر اہم قصبہ میں ہندو آبادی کے ساتھ مسلم آبادی کا اضافہ ہوا۔ جلد ہی ساتھ ساتھ رہنے کی وجہ سے ہندو اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کی تہذیبی روایات سے واقف ہونے کا موقعہ ملا۔ دونوں کے مابین سیاسی اور معاشی تعلقات کے قایم ہونے کے علاوہ تہذیبی لین دین کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔

۱۲۱۰ء میں سلطان قطب الدین ایبک کی لاہور میں چوگان کے میدان میں ناگہانی موت کے بعد جب سلطان شمس الدین التمش دہلی میں تخت نشین ہوا تو دہلی اور اس کے اردگرد قصبات کی ترقی کے لیے راہ ہموار ہوئی۔ اب تک دہلی ایک معمولی قصبہ تھا۔ عصامی کے مطابق ایک معمولی پرگنہ تھا لیکن التمش کا پایہ تخت بننے کے بعد ایک عظیم شہر

میں تبدیل ہو گیا۔ سلطان التمش نے اس کو لاہور کا ہمسر بنانے کے لیے کوشش کی۔ اس کی فتوحات کے نتیجہ میں دہلی میں دولت کی فراوانی شروع ہوئی۔ خوشنما عمارتوں کی تعمیر ہوئی اور یہاں کے بازاروں نے بیرون ممالک سے آنے والے تجار کے قافلوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ جب چنگیز خان نے ۱۲۲۰ء میں وسط ایشیا اور خراسان کو فتح کیا تو منگولوں کی خونریزی اور تاخت و تاراج سے بچنے کے لیے مسلم اشراف بڑی تعداد میں پناہ کے لیے آئے۔ سلطان التمش نے سب کی پذیرائی کی۔ اور ان کو دہلی اور اردگرد کے شہروں میں آباد کیا۔ معاصر مورخ منہاج سراج جوزجانی نے اس سلسلے میں سلطان کی کوششوں کی تعریف میں لکھا ہے کہ اس نے صبح فرمانروائی کے طلوع سے نامور علما اور دوسرے صاحب کمال لوگوں کو جمع کرنے کی انتہائی کوشش کی۔ دہلی اس کے انعامات کی کثرت اور مہربانیوں کی وجہ سے دنیا بھر کے لوگوں کے لیے پناہ گاہ بن گیا۔ سب مہاجرین کا سلطان مامن اور ملجا بن گیا۔[۲]

عصامی نے مہاجروں کے بارے میں لکھا ہے۔

بسے کاسبان خراسان زمین
بسے نقش بندانِ اقلیم چین
بسے عالمان بخارا نژاد
بسے زاہد و عابد ازہر بلاد
زہر ملک و ہر جنس صفت گراں
زہر شہرو ہر اصل سیمین بران
بسے ناقدانِ جواہر شناس
جواہر فروشانِ برون از قیاس
حکیمان یونان، طبیبان روم
بسے اہل دانش زہر مرز و بوم

دران شہر فرخندہ جمع آمدند
چو پروانہ بہ نور شمع آمدند[۴]

عصامی اور ضیاء الدین برنی کے مطابق مہاجرین میں علما اور فضلا کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ سلطان نے ان کی اچھی خاصی تعداد کو شہر دہلی کے نزدیک قصبات میں گاؤں، زمینیں اور وظائف دے کر آباد کیا۔ برنی نے خاص طور پر کیتھل اور جھجر میں آباد ہونے والے فضلا کا تذکرہ قدرے تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ چنگیز خاں کے حادثہ کی وجہ سے بڑی تعداد میں علما اور فضلا نے ہندوستان کو ہجرت کی۔ ان میں بہت سے ممتاز لوگ جو کہ بزرگی حسب میں عدیم المثال تھے، کیتھل اور جھجر میں سکونت گزیں ہوئے۔ ان قصبات کو ایسے ممتاز اشخاص کی رہائش سے وقار حاصل ہوا۔ اور ان کی موجودگی سے زمانہ خیر الاعصار ہو گیا۔ اِن میں باکمال اساتذہ تھے جن کا مشغلہ درس و تدریس تھا[۵]۔ بعد میں ان کے شاگرد سلطنت دہلی کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے اور دربار شاہی سے بھی متعلق رہے[۶]۔

اگرچہ دہلی کے قرب و جوار کے قصبات اور شہروں کا تذکرہ مورخین نے اپنے دستور کے مطابق ضمناً کیا ہے۔ کسی مقام کا حوالہ کسی بغاوت، بیرونی حملہ یا کسی دوسرے اہم تاریخی واقعہ کے احوال میں ملتا ہے اس کے علاوہ قصبات اور شہروں کے حوالے فضلا اور شعرا کے ناموں کے ساتھ بھی مل جاتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ بہت سی جگہیں ادبی اور علمی مرکز تھے۔ لیکن ہمیں پانی پت کا حوالہ چودھویں صدی کی کسی تاریخ میں نہیں ملتا ہے۔ پانی پت کے کسی شخص کا بحیثیت عالم، شاعر یا امیر بھی ذکر نہیں ملتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لاہور جو کہ غزنوی سلاطین کے آخری زمانہ سے سلطان قطب الدین ایبک کی موت تک دار السلطنت اور عظیم ثقافتی مرکز تھا ۱۲۴۱ھ میں منگول حملہ آوروں کے ہاتھوں تباہ ہو گیا تھا۔ یہاں کے تجار اور دوسرے شہری قتل کر دیے گئے تھے یا پھر غلام بنا کر وسط ایشیا لے جائے

گئے تھے۔ سقوط لاہور کے بعد ملتان تجار کے مرکز کی صورت میں ابھرا تھا۔ بیرون ممالک کے تجارتی قافلے ملتان سے ہوکر دہلی اور لکھنؤ جاتے تھے۔ ملتان سے دہلی شاہراہ پر جو قصبات آباد تھے وہ ترقی کرنے لگے۔ جب ۱۳۳۳ میں ابن بطوطہ ہندوستان آیا تو وہ ملتان سے دہلی چلا اس نے اپنے سفرنامہ میں ملتان اور دہلی کے بیچ شاہراہ پر واقع شہروں اور قصبات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی تجارت کی ترقی سے ہر قصبہ میں خوشحالی بڑھی تھی۔ تجار کے کارواں کی کسی قصبہ کے نزدیک آمد اور آرام کے لیے اس کا پڑاؤ مقامی لوگوں کے لیے خوشی کا موقع ہوتا تھا۔ ایک میلہ سا لگ جاتا تھا۔ تجار خرید وفروخت کرتے تھے۔ عصامی کے مطابق سوداگروں کے آنے کی خبر سن کر غریب امیر لوگ اسپ تازی، دیبای چین، حسین کنیزیں اور دوسرے نفائس کی دید کے لیے گھروں سے نکل پڑتے تھے[1]۔

جہاں تک طبقات ناصری میں پانی پت کا حوالہ ہے وہ بہت مختصر ہے منہاج نے طبقات ناصری میں صرف ایک جگہ سلطان ناصرالدین محمود (عہد حکومت ۱۲۴۶ء تا ۱۲۶۶ء) کے احوال میں ضمناً لکھا ہے کہ سلطان کے دوسرے سال جلوس شمال پنجاب کے لیے فوجی مہم کی تیاری ہوئی اور لشکر گاہ میں سلطان کا سراپردہ اعلیٰ پانی پت کی سمت میں نصب کیا گیا[2]۔ اس حوالہ کی بنا پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ پانی پت کسی خاص اہمیت کا حامل قصبہ تھا۔ لیکن بلبن کے عہد میں یقیناً پانی پت کو اہمیت نصیب ہوئی۔ اپنی تخت نشینی کے بعد سلطان بلبن نے دہلی کے چاروں طرف مضبوط قلعے اور تھانے تعمیر کرائے تاکہ منگولوں اور راہزنوں سے شہر دہلی کا دفاع ہو سکے۔ پانی پت کا مستحکم قلعہ بھی اسی زمانہ میں تعمیر ہوا تھا۔ دوسرے سلطان بلبن کے عہد میں مسلم ممالک سے جو مہاجرین آئے ان کو بھی مختلف قصبات میں بسایا گیا تھا۔ مولانا حالؔی کی خاندانی روایت اور شجرہ کے مطابق خواجہ ملک علی جو کہ خواجہ عبداللہ انصاری کی اولاد میں سے تھے، ہندوستان آئے اور پانی پت میں سکونت اختیار کی۔

اس طرح بلبن کے عہد سے خواجہ علی انصاری کی اولاد پانی پت میں رہی۔ کچھ بعد میں چشتی صابری بزرگوں کی آماجگاہ ہونے کا بھی پانی پت کو شرف حاصل ہوا۔ شیخ علاء الدین علی احمد صابری کی روایت کے مطابق اُن کے مرید اور خلیفہ شیخ جلال الدین کبیر نے پانی پت کو اپنے چشتی صابری سلسلہ کا مرکز بنایا کیونکہ یہ چھوٹا سا قصبہ تھا۔ صابری بزرگ لوگوں کے ہجوم سے بچنے کے لیے کم معروف جگہوں کو اپنی سکونت کے لیے پسند کرتے تھے۔ شیخ جلال الدین کبیر کے جانشین شیخ شمس الدین ترک پانی پتی بھی ہمیشہ پانی پت ہی میں رہے[۵]۔ یہیں آ کر شیخ عبدالحق ردولوی ان کے مرید اور خلیفہ بنے۔ ان بزرگانِ طریقت کے علاوہ شیخ شرف الدین عرف بوعلی قلندر جو کہ اکثر "عالم وحدت" اور مقام وحشت میں رہتے تھے پانی پت ہی میں رہے۔ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری فردوسی کے ملفوظات اور ان کے خلیفہ شیخ مظفر بلخی کے مکتوبات میں قلندر صاحب کی شہرت اور مقبولیت کے ذکر کے ساتھ ان کے ہندوی اشعار بھی نقل کیے گئے ہیں۔ سیرت فیروز شاہی کے مطابق سلطان فیروز شاہ کو قلندر صاحب سے عقیدت تھی اور قلندر صاحب بھی سلطان کو پسند کرتے تھے اور محبت میں بیٹا کہتے تھے[۶]۔ غرضیکہ صوفیا کرام کی خانقاہوں اور درگاہوں کی وجہ سے چودھویں صدی سے پانی پت کو مذہبی نقطہ نظر سے فوقیت حاصل ہو گئی تھی اور یہاں کے مخدوم زادوں کا پانی پت میں شہری ثقافت کے فروغ میں اہم رول رہا۔ یہی وجہ ہے کہ پندرھویں صدی عیسوی میں جب شیخ مودود لاری مرید بابا نظام ابدال بیرونی ممالک کی سیاحت سے ہندوستان واپس آئے تو پانی پت ہی میں قیام پذیر ہوئے اور ۱۵۳۰ء میں پانی پت ان کی خوابگاہ بنا[۷]۔

پندرھویں صدی عیسوی کے نصف آخیر سے دہلی میں لودی سلاطین کی حکومت شروع ہوئی۔ سلطان بہلول لودی اور اس کے بیٹے سلطان سکندر شاہ (لودی) کے عہد میں شہر دہلی جو کہ تیمور کے حملے سے تباہ ہو گیا تھا، دوبارہ عظیم شہر بنا۔ سلطنت دہلی نے دوبارہ اپنی پرانی شان و شوکت حاصل کی۔ لودی سلاطین کی کوششوں کے نتیجہ میں معاشی اور تمدنی ترقی

کے ساتھ ساتھ علم و ادب کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ پرانے شہروں اور قصبات کی توسیع ہوئی۔ دہلی کی طرح لاہور بھی دوبارہ تجارت اور علم و ادب کا مرکز بنا۔ صدیوں بعد لاہور اور دہلی شاہراہ بیرونی سوداگروں اور ان کے کاروانوں کی رہ گذر بنی۔ کرنال، پانی پت اور سونی پت اہم قصبات کی شکل میں ابھرے۔

چونکہ مغل بادشاہ بابر اور اس کے پوتے اکبر بادشاہ کو پانی پت کے میدان میں فیصلہ کن لڑائیوں میں فتوحات حاصل ہوئی تھیں، پانی پت مغل شہنشاہوں کے لیے مبارک مقام سمجھا جانے لگا تھا۔ بابر نے اپنی فتح کی یادگار میں پانی پت میں باغ لگوایا اور مسجد بھی تعمیر کرائی تھی۔ بعد میں یہ کابل باغ کے نام سے مشہور ہوا۔ اگرچہ باغ کا نشان نہیں رہا لیکن مسجد آج بھی موجود ہے اور فن تعمیر کے اعتبار سے اہم ہونے کی وجہ سے محکمہ آثار قدیمہ کے زیر نگرانی ہے۔ باغ کی طرح مغل عہد کی سرائیں اور دوسری عمارتیں بھی کھنڈرات میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ اکبر کے عہد میں پانی پت ایک پرگنہ کی حیثیت سے سرکار دہلی میں شامل تھا۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ پانی پت کا قلعہ پختہ اینٹوں سے بنا ہوا ہے اور اس میں سو گھوڑ سوار اور دو ہزار پیدل سپاہیوں کا دستہ رہتا ہے۔ فوج کی تعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ پانی پت اہم پرگنہ تھا کیونکہ اسی زمانہ میں برن یعنی بلند شہر بھی سرکار دہلی کا پرگنہ تھا لیکن وہاں ستر گھوڑ سوار اور ایک ہزار سپاہیوں کا دستہ رہتا تھا۔ پانی پت کے بڑے زمینداروں میں گوجر، رنگڑ اور جاٹ زمینداروں کے علاوہ مسلمانوں میں افغان (پٹھان) زمیندار بھی شامل تھے[11]۔

جہانگیر بادشاہ پانی پت میں خاص دلچسپی رکھتا تھا۔ جب کشمیر اور لاہور کا سفر کرتا تھا تو پانی پت میں ٹھہرتا تھا۔ اس کا حکم تھا کہ جمعہ کی نماز بابر کے کابل باغ میں ادا کی جائے۔ اس کے زمانہ میں لاہور دہلی شاہراہ پر کوس مینار، سرائے، پل اور کنوئیں تعمیر ہوئے۔ کنویں، پل اور کوس مینار باقی رہ گئے ہیں۔ قصبے کی ترقی اور توسیع کی بنا پر اٹھارہویں صدی کے مصنفین پانی پت کو قصبہ کی بجائے شہر لکھتے ہیں۔ اسی زمانہ سے پانی پت کے فضلا اور

دانشور ملک گیر شہرت حاصل کرتے ہیں۔ یہاں قاضی ثناء اللہ پانی پتی کا مختصر ذکر بے محل نہ ہوگا۔ انہوں نے پانی پت میں مختلف اسلامی علوم میں تبحر حاصل کیا اور پھر علم حدیث کے مطالعے کے لیے دہلی جا کر شاہ ولی اللہؒ کے شاگرد بنے۔ دہلی ہی کے زمانہ قیام میں میرزا جان جاناں مظہر کے مرید ہو گئے۔ مرزا مظہر آپ کے تبحر علمی اور تقویٰ سے متاثر ہوئے اور ان کو خلافت سے نوازا۔ قاضی ثناء اللہؒ پانی پتی نے تصوف، علم فقہ، حدیث اور تفسیر پر تمیں کتابیں لکھیں۔ تفسیر مظہری عربی زبان میں لکھی جس سے محققین کے مطابق ان کو کلاسیکل عربی زبان پر قدرت حاصل تھی اور وہ تفسیر کے مطالعہ میں ناقدانہ رویہ رکھتے تھے[۱۱]۔

اٹھارہویں صدی ہی میں پانی پت بھی سلطنت مغلیہ کے دوسرے شہروں کی طرح مغل شہنشاہوں کی عسکری طاقت کے انحطاط کا شکار ہوا۔ بیرونی حملہ آوروں کی لوٹ مار سے پنجاب سے دہلی تک کے علاقے معاشی طور پر تباہ ہوئے۔ جب ۱۷۵۷ء میں احمد شاہ پنجاب سے دہلی کے لیے بڑھا تو مالدار لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر قصبات سے محفوظ جگہوں کی طرف بھاگ گئے۔ طہماس بیگ نے چشم دید حالات قلمبند کیے ہیں وہ پانی پت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جب وہ لاہور سے پانی پت پہنچے تو انہوں دیکھا ''مردم شہر پانی پت از خوف و ہراس فوج درّانی سراسیمہ شدہ گریختہ بودند''۔ پھر لکھتے ہیں کہ شہر میں صرف مفلوک الحال بے سروسامانی کی وجہ سے رہ گئے تھے[۱۲]۔

۱۷۶۱ء میں پانی پت کی تیسری لڑائی کے بعد جاٹوں اور سکھوں کی لوٹ مار سے ہریانہ کے تمام شہر اور قصبات بُری طرح تباہ ہوئے۔ مرہٹوں پر فتح حاصل کر کے احمد شاہ ابدالی نے دہلی کے نظم و نسق کی ذمہ داری نجیب الدولہ کے سپرد کی جبکہ سرہند اور ہریانہ کی حکومت اس نے اپنے گورنر زین خان درّانی کے سپرد کی۔ اس کی افغانستان واپسی پر ہریانہ کے سکھوں نے ۱۷۶۳ء میں زین خان درّانی کو شکست دے کر پانی پت اور قریب کے دوسرے قصبات پر قبضہ کر لیا۔ کچھ عرصے بعد کرنال اور پانی پت کے قصبات جند کے راجہ

گجپت سنگھ کے قبضہ میں آ گئے تھے۔ ہر جگہ سے خواص بھاگ گئے تھے۔ بدامنی کا زمانہ ۱۷۷۲ء میں شاہ عالم کے الہ آباد سے دہلی واپس آنے تک رہا۔ شاہ عالم کے زمانہ میں پانی پت، سونی پت، لوہانہ اور روہتک کے محالات میرزا نجف خان کی جاگیر میں شامل رہے[۱۳]۔ اس زمانہ میں کرنال اور پانی پت وغیرہ کے اشراف اپنے وطن واپس آ گئے تھے۔ ۱۷۸۲ء میں نجف خان کے مرنے کے بعد اس کے جانشین حکومت سے متعلق ذمہ داریاں پوری کرنے میں ناکام رہے۔ مجبوراً بادشاہ شاہ عالم نے سندھیہ سے معاہدہ کر کے پورے علاقہ کی حکومت اس کے سپرد کر دی۔ ۱۸۰۳ء میں مرہٹوں پر انگریزوں کی فتح کے بعد شاہ عالم ایسٹ انڈیا کمپنی کا پنشن خوار ہو گیا۔ انگریزوں نے پانی پت اور ہریانہ کے دوسرے قصبات کو ضلع کرنال میں شامل کر دیا۔ چونکہ انگریزوں کا انتظام اچھا تھا لوگوں کو لاقانونیت سے نجات ملی اور امن وامان سے رہنا ممکن ہوا۔

انیسویں صدی میں پہلی مردم شماری کے مطابق پانی پت کے ۲۶ ہزار لوگوں کی آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ صرف سات ہزار ہندو جن میں سات سو جین شامل تھے، باقی سب آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ شرفا میں عرب نسل کے قریشی اور انصاریوں کے علاوہ پانی پت کے مخدوم زادے بھی باوقار لوگ تھے۔ پانی پت کے باہر زرخیز زمین پٹھان، انصاری، شیخ اور ہندو راجپوتوں کی املاک میں بٹی ہوئی تھی۔ زمانہ قدیم سے یہ معافی کی اراضی تھی۔ حکومت کو مالگذاری نہیں دی جاتی تھی۔ ڈینزل ابٹسن کی پنجاب کے قبیلوں اور ذاتوں سے متعلق تحقیق میں پانی پت کے مسلمانوں کی تعریف ملتی ہے۔ کرنال کے ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں بھی پانی پت کو ایک مشہور لٹریری سینٹر کہا گیا ہے۔ خاص طور پر حالی کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کے علمی کارنامے مشہور ہیں اور ان کی کئی نگارشات کا علمی اور ادبی اہمیت کے پیش نظر انگلینڈ میں انگریزی میں ترجمہ ہوا ہے۔ حالی اور ان کے ساتھیوں کی کوشش سے مسلمانوں میں جدید یورپین تعلیم کی طرف رغبت پیدا ہوئی۔ پرانے تعلیم یافتہ

خاندانوں نے اپنے بچوں کو عربی اور فارسی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان سیکھنے کے لیے نئے اسکولوں میں بھیجنا شروع کیا۔ پانی پت سے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے مسلم طلبا ایم۔اے او کالج علیگڑھ جاتے تھے[۵]۔

صنعت و حرفت کے اعتبار سے پانی پت قینچی اور سروتہ بنانے کے ماہرین کے لیے مشہور تھا۔ میرٹھ کی طرح پانی پت کی قینچیاں بھی مشہور تھیں۔ کانچ کی چوڑیاں بنانے کے کارخانے بھی تھے۔ شہر کے باہر دیہات میں گڈریے، بھیڑیں پالتے تھے اور ان کا اون پانی پت میں کمبل بنانے والوں کو فروخت کرتے تھے۔ پانی پت میں ۱۵۰ ہینڈلومس تھے جن سے عمدہ قسم کے کمبل بنائے جاتے تھے۔ یہاں کے کمبل کی امرتسر، لاہور، پشاور، شملہ، دہلی اور آگرہ میں مانگ تھی۔ کمبل کی قیمت تین روپیہ سے پندرہ روپیہ تک ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں خوشنما پردوں کا چھپا ہوا رنگ برنگ کا سوتی کپڑا ہندوستان کے مختلف شہروں کے علاوہ بمبئی بھی جاتا تھا۔ پانی پت میں ساٹھ دوکانیں کپڑا اسپلائی کرنے والوں کی تھیں۔ کپڑے کے کاروبار میں زیادہ تر مسلمان تھے۔ پانی پت اپنے کوزہ گروں کے لیے بھی مشہور تھا۔ مٹی کے برتن جن پر پالش کیا جاتا تھا، میلوں میں بڑے پیمانے پر فروخت ہوتے تھے[۶]۔

پانی پت شمالی ہندوستان کے ان مقامات میں سے تھا جو کہ دہلی کے مخلوط کلچر اور اردو زبان کی نمائندگی کرتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد مسلمان پانی پت سے ہجرت کر کے پاکستان یا دوسری جگہوں پر پناہ گزیں ہوئے۔ جلد ہی ان کی جگہ پر پاکستانی پنجاب سے مہاجرین آ کر آباد ہو گئے۔ آبادی کی تبدیلی سے پانی پت کی پرانی ثقافتی روایات کا رفتہ رفتہ خاتمہ ہو گیا۔

۱۔ عصامی، فتوح السلاطین، مدراس ۱۹۴۸ء، ص ۱۱۴

۲۔ طبقات ناصری، مرتبہ عبدالحی، کابل، ۱۹۶۳ء، جلد اول

۳۔ عصامی، فتوح السلاطین، مدراس، ۱۹۴۸ء، ص ۱۱۴، ۱۱۵

۴۔ ضیاءالدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، مرتبہ سید احمد خان، کلکتہ، ۱۸۶۲ء، ص ۱۳۰

۵۔ ایضاً، ص ۱۷۷

۶۔ عصامی، فتوح السلاطین، مدراس ۱۹۴۸ء، ص ۹۹

۷۔ طبقات ناصری، جلد اول، ص ۴۸۰

۸۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی، انوار العیون، گلزار محمدی پریس، لکھنؤ ۱۲۹۶ھ، ص ۱۴، ۱۸، ۲۱

۹۔ لکھا ہے کہ اکثر کسی لذیذ کھانے کو یہ کہہ کر سلطان کے لیے بھیجتے تھے۔ "برای فرزند من فیروز ببرند"

۱۰۔ ابوالفضل، آئین اکبری، مرتبہ سید احمد خاں، دہلی ۱۲۷۱ھ، ص ۲۱۴۔

۱۱۔ آئین اکبری، انگریزی ترجمہ، کرنل ایچ۔ ایس۔ جیرٹ، جلد دوم، ص ۲۹۱۔

۱۲۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے میرزا جان جاناں مظہر کے خطوط کے مقدمہ میں ثناء اللہ پانی پتی کے حالات پر سیر حاصل اطلاع بہم پہنچائی ہے۔ دیکھیے "مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط، دہلی، ۱۹۶۲ء، ص ۷۷ تا ۷۹۔

۱۳۔ طہماس بیگ رومی، طہماس نامہ، مرتبہ محمد اسلم، لاہور ۱۹۸۶ء، ص ۱۴۹

۱۴۔ دیکھیے طہماس نامہ، ص ۲۹۳

۱۵۔ دیکھیے پنجاب ڈسٹرکٹ گزیٹیرس، کرنال ڈسٹرک، لاہور ۱۹۱۸ء، ص ۱۳۳، ۲۱۳

۱۶۔ گزیٹیر، کرنال ڈسٹرکٹ، ص ۱۳۴ تا ۱۳۵

خاندان لوہارو کے شعرا

مرتبہ:

حمیدہ سلطان احمد

خاندان لوہارو کی ادب دوستی اور ادبی خدمات قصہ پارینہ بن کر رہ گئی تھی۔ حمیدہ سلطان احمد کی اس کتاب میں خاندان لوہارو کے صاحبان سیف و قلم کے حالات زندگی اور ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے کلام کے نمونے پیش کیے گئے ہیں، نیز ان پر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے۔

صفحات ۱۵۶

قیمت ۳۰ روپے

ظہیر ملک

مسدس حالی کا

تاریخی پس منظر۔۱۸۷۱ء۔۱۸۸۲ء

اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں جن مصلحین واکابرین نے ملک اور قوم کی تعمیر و ترقی کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء۔۱۹۱۴ء) کا شمار اُن کی صف اول میں کیا گیا ہے۔ بالخصوص مسلم معاشرہ کی اصلاح اور جدید علم و ہنر کے فروغ کی جو تحریک اِس دور میں شروع ہوئی اُس میں حالی کا مقام نمایاں اور بلند ہے۔ وہ عظیم شاعر، دانشور، ادیب، نقاد اور سوانح حیات کی تالیف میں ماہر فن تھے۔ اُن کی شخصیت میں شاعرانہ صلاحیت کے ساتھ سماجی اصلاح کے لیے قوت عمل کا اشتراک ایک غیر معمولی وصف کا مظہر ہے جس کی نظیر شاعروں اور ادیبوں کے زمرہ میں آسانی سے نہیں ملتی ہے۔ حالی نے جدید طرز کی شاعری کے ذریعے جس کے وہ خود موجد تھے، ملت کو غفلت اور مایوسی کی تاریک راہوں سے نکال کر روشن مستقبل کے امکانات سے آشنا کرانے کی سعی پیہم کی۔ آپ کے سحر آفریں پیام نے سماج کے ہر گوشے اور ملک کے دور دراز علاقوں میں بیداری کی لہر پھیلا دی۔ اُس کی تاثیر نے ہر طبقے میں عملی قوت اور خود اعتمادی کے جذبات کو ابھارا تا کہ

نئی نسل علوم جدیدہ سے آراستہ ہو کر ملک کے دیگر ترقی پذیر فرقوں کے درمیان مہذب، باوقار، امن و آشتی کی زندگی گذار سکیں۔ حالیؔ علوم اسلامیہ کے جید عالم تھے۔ اُن کا اسلامی تاریخ کا مطالعہ وسیع اور عمیق تھا۔ وہ یورپ کی تاریخ، وہاں کے ممالک میں مذہبی، سیاسی اور عسکری تغیرات اور صنعت و حرفت میں ترقیات سے خوب واقف تھے۔ عالمی تناظر میں جس انداز سے انہوں نے ماضی و حال میں تسلسل قائم کیا، موازنہ اور فرق کیا وہ قابل لحاظ ہے اور ان کی فکری بصیرت و تاریخی ادراک کو ظاہر کرتا ہے۔ ماضی کی یاد سے اپنے دل و دماغ کو آباد رکھتے ہوئے زمانہ حال کے تقاضوں کے پیش نظر ملت کو راہ ترقی پر گامزن کرنے کے لیے مشعل ہدایت جلائی۔ ماضی کو نئی تخلیقی قوتوں کا تابعدار بنانے کی تلقین کی۔

بہ اعتبار سیرت بھی حالیؔ کا درجہ بلند پایہ ہے۔ وہ انسانی اقدار کے حامل، فرشتہ خصلت، خلوص، فراخ دلی اور انکساری کی مجسم تصویر تھے۔ صالحہ عابد حسین کے الفاظ میں ''ان کا قلب صافی حسن صداقت و شرافت کا آئینہ دار تھا''[۱]۔ خواجہ غلام الثقلین اُن کو ''صاحب باطن ولی سمجھتے تھے''[۲]۔ راس مسعود نے لکھا ہے کہ حالیؔ انسان نہیں فرشتہ تھے جن کو ان کے والد قابل پرستش تصور کرتے تھے[۳]۔ کلام حالی کا درد اور ان کی سچائی کسی ادبی اصول کی پیروی کا نتیجہ نہ تھی بلکہ شاعر کی اپنی بلند اور پاکیزہ سیرت کا عکس تھا''۔ حالیؔ کی شاعری کی وجہ تحریک ان کی طبع دردمند و دل کی لگن، مقصد تبدیلی و سدھار اور ملت کی فلاح و بہبود۔ موضوع کی بنیاد شاعر کی ذاتی تحقیقات، مشاہدہ، تجربہ اور تخلیقی توانائی تھی۔ جس جامعیت، سلاست، بے باکی، استدلال اور تمثیلات کے ذریعے حالیؔ نے اپنے موضوع کے مفہوم اور معنی و مقصد کی وضاحت کی ہے وہ بلاشبہ بے مثل اور قابل تقلید ہے۔ اُن کی کثیر التعداد نظموں میں جس طویل نظم کو عالمگیر قبولیت اور جاودانی شہرت ہوئی وہ مدوجزر اسلام معروف بہ مسدس حالی ۱۸۷۹ء میں شائع ہوتی تھی۔ ایک اندازہ کے مطابق اردو کی کوئی کتاب اتنی بار اور اتنی تعداد میں نہیں شائع ہوئی۔ ان کی حیات میں گیارہ ایڈیشن

شائع ہوئے۔ اِس کتاب کی کم از کم ۲۱ طباعتیں مشہور کتب خانوں میں موجود ہیں۔ علاوہ ازیں ۲۴ ر ایڈیشن مختلف اوقات میں شائع ہوئے[۲۳]۔

مسدس کا موضوع مسلمانوں کے عروج وزوال کی طویل داستان ہے جس کو حالی نے تاریخی واقعات کی روشنی میں مجمل اور جامع طور سے بیان کیا ہے اور زوال کے اسباب عوامل اور اثرات کی تشریح کی ہے۔ ان کی موجودہ زبوں حالت پر عبرت دلانے اور قومی حمیت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یعنی ''وہ کیا تھے اور کیا ہو گئے'' کے معنی و مطلب کو وسیع تناظر میں واضح کیا ہے

کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

دور حاضر کے نقاد و تبصرہ نگاروں نے ان کی حقیقت پسندی، صداقت اور خلوص نیت کی تعریف کی ہے۔ مولوی عبدالحق نے لکھا یہ مسدس ہماری قومی زندگی کا کامل مرقع ہے جس میں ہمارے خط و خال صاف صاف نظر آتے ہیں پھر حسن بیان نے اُسے معراج کمال تک پہنچا دیا ہے''[۲۴]۔ شیخ محمد اکرام کے الفاظ میں ''حالی کے آنسو خالص آب حیات کے چھینٹے تھے دل سے نکلے ہوئے''[۲۵]۔ سر سید احمد خاں (۱۸۱۷۔۱۸۹۸) نے جو اِس شہرہ آفاق مسدس کی تالیف کے محرک خاص تھے جس حسن خوبی سے اِس کے اثر اور تاثیر کو بیان کیا ہے وہ یہاں قابل اعادہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں

جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہوئی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی۔ اگر مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے تو بالکل بجا ہوگا متعدد بند اِس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ حق ہے جو بات دل سے

نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے۔ بیشک میں اِس کا محرک ہوا۔
اور اُس کو میں اِن اعمال حسنہ میں سمجھتا ہوں کہ جب خدا
پوچھے گا کہ تو کیا لایا تو میں کہونگا حاؔلی سے مسدس
لکھوالایا ہوں اور کچھ نہیں ۵

حاؔلی واقعی خود بھی روئے۔ مسدس کے پڑھنے والوں اور سننے والوں کو بھی رُلایا۔ عینی شہادت کے مطابق گاؤں کے ان پڑھ لوگوں پر اِس کا ساحرانہ اثر ہوا۔ وہ مسدس کے اشعار سُن کر جھومتے اور آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ اِس طرح مسدس کا پیغام بیداری دور دراز دیہاتوں میں پہنچا۔ علامہ اقبؔال نے اِسی کیفیت کا اظہار اِس صورت سے کیا ہے

آں لالۂ صحرا کہ خزاں دید و بیفسرد — سید دیگرے اورانمی از اشک سحر داد
حاؔلی زنواہاے جگر سوز نیا سود — تالالہ شبنم زدہ را داغ جگر داد

مسدس حالی کو قلیل مدت میں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ حالی نے اِس کی بابت دوسرے دیباچہ میں ۱۸۸۶ء تفصیل سے ذکر کیا ہے

تعصب کے باوجود یہ نظم ملک کے اطراف و جوانب میں
پھیل گئی۔ ہندوستان کے مختلف اضلاع میں اِس کے سات
آٹھ ایڈیشن اب سے پہلے چھپ چکے ہیں۔ بعض قومی
مدرسوں میں اُس کا انتخاب بچوں کو پڑھایا جاتا ہے۔ مولود
شریف کی مجلسوں میں جابجا اِس کے بند پڑھے جاتے
ہیں۔ اکثر لوگ اس کو پڑھ کر بے اختیار روتے ہیں اور آنسو
بہاتے ہیں قوم نے اِس کی طرف کافی توجہ کی۔ اگر قوم
کے دل میں متاثر ہونے کا مادہ نہ ہوتا تو یہ اور ایسی ہزار
نظمیں بے کار تھیں ۶

اُنیسویں صدی کے اوائل تک ہندوستانی مسلمانوں کی حالت ایک منتشر مجموعے کی تھی۔ یہ ملک کی آبادی کے پانچویں حصے پر مشتمل مختلف علاقوں میں غیر یکسانی طور سے آباد تھے۔ کہیں کم کہیں زیادہ۔ ۱۸۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق اُن کی اکثریت مغربی پنجاب اور سندھ میں تھی۔ لیکن شمالی مغربی صوبہ اور اودھ (موجودہ اتر پردیش) میں ان کی آبادی صرف ۱۳ فیصدی تھی۔ حالانکہ یہ خطہ تقریباً سات صدیوں سے (۱۱۹۲) مسلم حکومت کا انتظامی اور تہذیبی مرکز رہا تھا۔ ہر علاقے کی مقامی زبان، روایات، رسم ورواج کے اثرات وہاں کے مسلم باشندوں کی سماجی زندگی اور شخصی وضع قطع پر غالب تھے۔ مذہب کی مشترکہ اقدار اِن کو اِس عرصۂ دراز میں کل ہند سطح پر ایک مذہبی جماعت کی شکل نہ دے سکی۔ اجتماعی ملّی شناخت ظہور پذیر نہ ہوسکی۔ شمالی ہندوستان میں سب سے اول سید احمد رائے بریلوی (۱۷۷۶۔ ۱۸۳۱) کی تحریک آزادی اور احیاءِ دین نے مسلمانوں کے درمیانی، غریب، نچلے طبقوں میں اِجتماعی ملّی احساس کو اجاگر کیا۔ بنگال میں شریعت اللہ (۱۷۸۱۔۱۸۴۰) اور دادومیاں (۱۸۱۹۔۱۸۶۲) نے فرائضی تحریک کے ذریعے وہاں کے کاشتکاروں، دستکاروں اور مزدوروں کو اقتصادی حقوق کے تحفظ اور سماجی انصاف کی بحالی کے لیے عملی اشتراک سے احتجاج کے لیے منظم کیا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ناکامی اور اُس سے برپا ہوئی تباہی نے شمالی ہندوستان کے مسلمانوں پر جمود وتعطل کے بادل طاری کر دیے۔

اِن حالات میں مسدس حالی نے اِس جمود کو توڑنے اور ازسرِ نو ہمت اور حوصلہ افزائی کے عمل میں مخصوص کردار انجام دیا۔ اندرونی بیداری وجود میں آئی جس نے اجتماعی شناخت، خود آگاہی اور مشترک مفادات کے شعور کی تخلیق کی اور فروغ دیا۔ حکمراں طبقے کے اربابِ اختیار کی سوچ اور رویہ میں مثبت تبدیلی کے واضح آثار رونما ہونے شروع ہوگئے۔ ۱۸۵۷ء سے قبل انگریز حکمراں اور سیاسی مدبر مسلمانوں کو زوال پذیر نسل قرار دیتے تھے۔ جارج کیمپ بیل George Campbell کی رائے میں وہ شائستہ اور خوش اخلاق نسل کے

لوگ ہیں جو سرکاری ملازمتوں کے خواہشمند ہیں۔ ۱۸۲۸ء میں بشپ ہیبر Bishop Heber (۱۷۸۳۔۱۸۲۶) نے لکھا تھا کہ مسلمان ایک غیر پیداوار، غیر ترقی یافتہ، شاعری کے شوقین اور خود پیدا کردہ سستی کا غلط زمانی فرقہ ہے جو فی زمانہ انگریز حکومت کے لیے بیکار ہے۔ تاہم ۱۸۸۸ میں ویسرائے لارڈ ڈفرن Lord Dufferin (۱۸۲۶۔۱۹۰۲) نے مسلمانوں کے لیے قوم کی اصطلاح استعمال کی جو ہمالیہ سے کیپ کارمورن cape cormorn تک نمایاں حیثیت سے رہتے ہیں۔ اور ہندوستان میں ہمارے سامراجی کائنات کی دو بڑی طاقتور قوموں میں سے ایک ہیں[۱]۔

اٹھارویں صدی کے 'شہر آشوب' کی قسم کی نظمیں دہلی اور اُس کے اطراف و جوانب کی بربادی، مرکزی حکومت کی کمزوری اور معاشرہ کے اعلیٰ طبقوں کی معاشی بدحالی جیسے موضوعات پر محیط تھیں۔ مسدس حالی کا خطاب برعکس پوری مسلم ملت سے تھا۔ حالی نے انحطاط کے اسباب کی تلاش ملت کی اندرونی کمزوریوں، خامیوں میں کی اُن کے تعصب اور قدامت پرستی کی نشاندہی کی۔ ان کے تدارک و انسداد کی تدبیروں پر مقتضائے وقت کے لحاظ سے غور وفکر کرنے کا ماحول بنایا۔ حالی نے مسدس میں ہر ایک طبقے کی تعلیمی، معاشی اور اخلاقی حقیقت حال کی واضح، مفصل تصویر پیش کی ہے۔ ان کے خیال میں ملت کی تنزلی کا سبب اس کے سربراہوں کی اجتماعی مفاد، فلاح واصلاح کی طرف سے غیر دلچسپی اور بے رخی تھا۔ تغیرات زمانہ سے پیدا ہوئیں نئی حقیقتوں کا تحقیق واجتہاد کے ذریعے مقابلہ کرنے میں وہ ناکامیاب رہے۔ حاکم قوم کے سب لوگ، عالم اور دولت مند، ایک دوسرے کی ضروریات اور مشکلات کو رفع کرنے میں مشغول ہیں۔ ہندوستان میں دیگر فرقے زندگی کے مختلف شعبوں میں بتدریج ترقی کررہے ہیں۔ اِس لیے انہوں نے باہمی اتحاد واتفاق پر زور دیا

جہاز ایک گرداب میں پھنس رہا ہے ــــ پڑا جس سے جوکھوں میں چھوٹا بڑا
بچو گے نہ تم اور ساتھی تمہارے ــــ اگر ناؤ ڈوبی تو ڈوبیں گے سارے[۲]

حالی کی مسلم معاشرہ کی اصلاح، تعلیمی واخلاقی اور معاشی ترقی کے لیے احساس بیداری پیدا کرنے کی تحریک کو فرقہ واریت سے تعبیر کرنا یا اس میں علیحدگی کے عناصر کی دریافت منفی رویہ کے مترادف ہے۔ مسدس حالی اور دوسری نظموں میں فرقہ وارانہ رجحانات کا وجود نظر نہیں آتا ہے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے، فرقہ پرست نہ تھے۔ اُن کا قول تھا کہ بغیر باہمی اتحاد و یک جہتی کے دونوں قوموں کا باعزت رہنا مشکل ہوگا

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں
شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں

نااتفاقی کی وجہ سے باہر کی قوموں نے ہندوستان پر یکے بعد دیگرے حملے کیے اور اِس ملک پر قابض ہو گئے

ہند میں اتفاق ہوتا اگر　　کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر
سب سے آخر کو لے گئی بازی　　ایک شائستہ قوم مغرب کی[۱۳]

حالی کا نظریہ تھا کہ مذہبی اختلافات سے قومیت نہیں بدلتی۔ یہاں کے سب باشندوں کا وطن ہندوستان ہے اور اُن کی قومیت ہندوستانی ہے

ہو مسلمان اِس میں یا ہندو　　بدھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو
جعفری ہووے یا کہ ہو حنفی　　جین مت ہو یا ہو بشنوی
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو　　سمجھو آنکھوں کی پُتلیاں سب کو[۱۴]

دراصل اُس وقت کے سماجی اور اقتصادی حالات نے حالی کے احساس وادراک کو متاثر کیا اور اُن کے شعور کا تعین کیا۔ اُن کی تحریک اصلاحات بلکہ دیگر احیاءِ دین کی تحریکات مثلاً وہابی، اہل حدیث وغیرہ غیر مسلموں کے خلاف نہ تھیں[۱۵]۔ حالی نے مسدس میں مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالت کا برطانوی سامراج کو ذمہ دار قرار نہیں دیا۔ گو اُن کی دیگر تحریرات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ملک کے صنعتی استحصال، ذرائع پیداوار پر تسلط

اور یہاں کے معاشرتی ڈھانچہ کی تخریب کاری سے کما حقہ واقف تھے۔ لیکن ایک لائق، تجربہ کار انگریز افسر ولیم ولسن ہنٹر William wilson hunter (۱۸۴۰۔۱۹۰۰) نے اپنی کتاب 'ہمارے ہندوستانی مسلمان' میں مسلمانوں کی سیاسی، تعلیمی اور اقتصادی بیخ کنی کا براہ راست الزام برطانوی نوآبادیاتی نظام حکومت کے جبر و تشدد اور ناانصافی پر عائد کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے

> یہ وہ نسل ہے جسے برطانوی حکومت کے ماتحت تباہ و برباد کر دیا گیا ہے۔[۱۱]

وہ مزید لکھتا ہے۔ برطانوی حکومت نے جس حکمت عملی اور طریق کار سے مسلمانوں کے تعلیمی، مالی اور ملکی نظام میں تبدیلیاں کیں، ان کو جاداووں اور ملازمتوں سے محروم کیا گیا یا نچلے طبقے کی صنعت و حرفت اور درمیانی طبقے کے غیر سرکاری پیشے مثلاً طباعت، وکالت جو ان کی آمدنی کے ذرائع تھے، ختم کر دیئے گئے اور مزید سرکاری ملازمتوں کے دروازے اُن پر بند کر دیے گئے، اِن سب عوامل کی ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی امتیازی رنگین، مرصع زبان میں تفصیلات دی ہیں[۱۲]۔

دو سال قبل ۲۴ر فروری ۱۸۶۹ ولیم ولسن ہنٹر نے اخبار پائنیر Pioneer میں مسلمانوں کے حالات کی بابت ایک مضمون شائع کیا۔ اِس کا خلاصہ یہ ہے

> اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان جنگ کے اتفاقات کو تسلیم کر لیں۔ فاتح قوم ان زخموں کی تلافی جو ہماری حکومت نے ان کی خودداری اور مذہبی احساسات پر اس دوران میں لگائے ہیں، عمدہ حکومت، دولت پیدا کرنے کے ذرائع، مال و جان کی حفاظت، جملہ حقوق کا تحفظ سے کرے گی۔ برٹش شہری کی حیثیت سے ان کے لیے تجارتی ایشیا کے وسیع

> منظر میں ترقی کے امکانات ہیں۔ شروع میں وہ ان مواقع
> کو تذبذب کی نگاہ سے دیکھیں گے لیکن جب تک ہم جنگ
> اور انتظامیہ فنون میں حاوی ہیں اور برتر ہیں، مسلمان خود تنہا
> اپنی مدد نہیں کرسکتے ہیں [۵]۔

۳۰ر مئی ۱۸۷۱ء کو وائسرائے لارڈ میو Lord Mayo (۱۸۲۲۔۱۸۷۲) نے ولیم ولسن ہنٹر سے ہندوستان کے مسلمانوں کی بابت کتاب لکھنے کے لیے کہا۔ ہنٹر نے یہ کتاب ایک ماہ سے پیشتر مکمل کر دی۔ کتاب کی اشاعت سے تین دن پہلے ۲۶ر جون ۱۸۷۱ لارڈ میو نے مسلمانوں کے سلسلے میں حکومت کی نئی پالیسی کا اعلان کیا۔ اِس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ نئی پالیسی حکومت نے کتاب کی اشاعت سے پیشتر وضع کر لی تھی اور اس کو عملی شکل دینے کے طریقہ کار پر غور کر لیا گیا تھا۔ ہنٹر نے مندرجہ بالا مضمون اور اِس کتاب میں حکومت کی تبدیلی فکر کے جواز میں نظریاتی توجیہات پیش کی ہیں تاکہ اِس کی ضرورت کا احساس ہو اور اِس کی حمایت میں سیاسی فضا ہموار ہو سکے۔ کیونکہ ۱۸۵۷ کے ہولناک واقعات نے انگلستان کے سیاسی حلقوں میں یہ یقین قائم کر دیا تھا کہ مسلمان برطانوی حکومت سے عداوت برقرار رکھنے میں اپنے مذہبی عقیدہ کے پابند ہیں۔ یعنی غیر مسلم حکومت سے بغاوت ان کا مذہبی عقیدہ ہے۔ لارڈ میو نے اپنے اعلان ۲۶ر جون ۱۸۷۱ میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے کلکتہ مدرسہ کی ازسرِ نو تنظیم کی تجویز پیش کی۔ سرکاری اسکولوں میں عربی، فارسی زبانوں کی تعلیم کے باقاعدہ انتظام کی سفارش کی گئی اور انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں کا سرکاری اسکولوں میں تقرر اور دیگر ملازمتوں میں سہولت فراہم کرنے کا یقین دلایا گیا۔ مگر لارڈ میو نے مسلمانوں کو کل ہند سطح پر ایک سرگرم سیاسی جماعت کا درجہ دینے سے انکار کیا۔ اپنے اِس اعلان کی تمہید میں اُس نے واضح کیا کہ مسلمان امن اور خاموشی سے اِن محدود مراعات کو قبول کریں۔ اِن مراعات سے صرف وہ ہی مسلمان فیض یاب ہو سکتے ہیں جو

برطانوی فکر سے بنائے ہوئے مستقبل کے خاکہ سے اتفاق کریں گے [۵]۔

حکومت کے اِس اعلان کے تین ماہ بعد پنجاب کے ایک مسلمان عبداللہ نے کلکتہ کے چیف جسٹس جون پیکسٹن نارمن John Paxton Norman (۱۸۱۹۔۱۸۷۱) کا قتل اگست ۱۸۷۱ میں کردیا۔ اور فروری ۱۸۷۲ میں لارڈ میو کا انڈمان Andaman میں شیر علی نے قتل کیا۔ لیکن اِن سانحیات کے باوجود برطانوی حکومت [۶] کی مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے جو منصوبہ لارڈ میو نے بنایا تھا، اُس میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ اُس کے جانشین ویسرائے لارڈ نارتھ بروک نے Lord North Brook (۱۸۷۲۔۱۸۷۶) واضح کیا کہ اس پالیسی کی بنیاد مختلف قوموں میں توازن قائم کرنے کے اصول پر ہے۔ لارڈ لٹن Lord Lytton (۱۸۷۶۔۱۸۸۰) نے بھی اس پالیسی کی توجیہ میں جو دلیل پیش کی وہ مسلمانوں کی پس ماندگی و پسپائی کی حقیقت پر مبنی تھی۔ کسی محکوم فرقہ کو اِس حالت میں ہمیشہ کے لیے رکھنا سیاسی بُردباری اور حقیقت حال کے خلاف ہے۔ مسلمانوں کے اعلیٰ طبقے کی بہبودی کی طرف حکومت کی خاص توجہ اس لیے ضروری ہے کہ یہ انہیں پندرہ سال میں (۱۸۵۷۔۱۸۷۲) سب سے زیادہ تباہ و برباد کیا گیا ہے۔ اِن کے نچلے فرقوں کے خلاف کسی تعصب کی بنا پر کسی قسم کی زیادتی نہیں کی گئی ہے اور اِن کی معاشی سماجی حالت ہندوں کے نچلے طبقوں کی نسبت خراب نہیں ہے۔ حکومت ہند کے ۱۸۸۵ کے فیصلے کے مطابق ملک کی سالانہ تعلیمی رپورٹ میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کی اطلاع کے لیے ایک حصہ مخصوص کردیا گیا تا کہ حکومت اپنی پالیسی پر عملی کارروائی کے نتائج سے باخبر رہے۔ اِس سے انکشاف ہوتا ہے کہ حکومت نے اپنا موقف ترک نہیں کیا تھا۔ ولیم ولسن ہنٹر نے ایجوکیشن کمیشن کی پہلی نشست ۱۸۸۲ بحیثیت چیرمین علی گڑھ میں منعقد کرائی۔ کمیشن کے سامنے مسلم نمایندوں نے جو بیانات دیے ان سے یہ اخذ کیا گیا کہ عموی طور سے مسلمان اپنی مذہبی تعلیم کو حاصل کرنا مقدم سمجھتے تھے۔ اپنی مذہبی و ثقافتی روایات کی حفاظت کے لیے زیادہ فکر

مند تھے[41]۔

شمالی ہندوستان کے مسلمان تعلیمی میدان میں کس قدر پیچھے رہ گئے تھے اس امر کا ثبوت کافی اعداد و شمار دستیاب کر کے فراہم کیا گیا۔ ایجوکیشن کمیشن کی اس سلسلہ میں کارروائی قابل قدر ہے۔ دور حاضر کے مورخوں نے ان اعداد و شمار کو اپنی کتابوں میں اپنے زاویۂ نگاہ سے استعمال کیا ہے۔ ان تاریخی حقائق سے سب ہی واقف ہیں۔ مثلاً بیس سال کی مدت میں ۱۸۵۸۔۱۸۷۸ ملک کے ۳۷۳ ۱ بی۔ اے پاس کرنے والوں میں مسلمان ۳۰ تھے اور ۳۲۶ ایم۔ اے کے سند یافتہ نوجوانوں میں پانچ مسلماں شامل تھے۔ ۱۸۷۱۔۱۸۷۲ میں مسلمان طلبا کی تعداد سرکاری اسکولوں میں ان کی آبادی کے تناسب سے بہت کم تھی[42]۔

	شمالی مغربی صوبہ	صوبہ اودھ	پنجاب
مسلم آبادی۔	۱۳۔۵	۹۰۹	۶۰۵۱
تعداد مسلم طلبا۔	۸۰۱۸	۲۵۰۳	۹۰۳۴

مسلمانوں کی تعلیمی حالت کو سدھارنے کے لیے برٹش حکومت نے جو تدابیر اختیار کیں، دور حاضر کے مورخوں نے اِس عمل کو 'تقسیم کرو اور حکومت کرو' کی پالیسی جو سامراجیت کا ہمیشہ بنیادی اصول رہا ہے، منسوب کیا ہے۔ ولفریڈ کینٹویل اسمتھ Wilfred Cantwell Smith نے اِس نظریہ سے اتفاق کرتے ہوئے برٹش حکومت کی سیاسی مصلحت کی وضاحت کی اور محرکات و مقاصد کا بھی تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ برطانوی نوآبادیاتی طاقت نے اپنے ابتدائی دور میں ہندوں کے اعلیٰ طبقوں، زمیندار، سرمایہ دار، تجار، ملازمت پیشہ کی معاونت کی۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کو اپنا فطری دشمن سمجھتے تھے۔ اپنے مفروضہ کی دلیل میں اسمتھ نے لارڈ ایلین برو Lord Ellen borough (۱۷۹۰۔۱۸۷۱) کے خط بنام ڈیوک آف ولنگٹن Duke of Wellington مورخہ ۱۸؍ جون ۱۸۴۳ء کا حوالہ دیا ہے جس میں اُس نے لکھا تھا "چونکہ مسلمان ہمارے دشمن ہیں اِس لیے ہمیں ہندوں سے

مصالحت کرنی چاہیے"۔ حکومت نے تبدیلی پالیسی کی جو وجوہات دی تھیں اِسمتھ نے انہیں اپنی بحث میں نظر انداز نہیں کیا۔ اِن کا حوالہ اِس مضمون میں دیا جاچکا ہے۔ بحر حال حکومت کی پالیسی کے پس پشت جو بھی مقاصد کارفرما رہے ہوں، اِس متنازع مسئلہ سے قطع نظر یہ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ اِس نے آیندہ زمانہ کے لیے مسلمانوں کی تعلیم اور ملازمتوں کے لیے امکانات پیدا کردیے جو اُس سے پہلے معدوم تھے۔ تاہم اِس محدود دائرہ میں اِن معمولی مراعات سے مسلمانوں کو بحیثیت مذہبی جماعت کے سیاسی سطح پر کوئی فوقیت حاصل نہ ہوئی اور نہ ہی ملک کی ترقی پذیر جماعتوں اور فرقوں پر بالادستی یا یہ تاثر کہ اِس سے ہندو مسلمانوں کے تعلقات میں خلیج حائل ہوئی غلط ہے[۲۳]۔ حالی نے اِن حالات میں مسدس کے ذریعہ ان سہولتوں سے مستفیض ہونے کے لیے جن کو حکومت نے اپنی مصلحت کے پیش نظر فراہم کیا ہے، مسلمانوں کے ذوق عمل کو بیدار کیا۔ اور اصرار کیا کہ علم و ہنر اور محنت کے اصولوں کی بنیاد پر وہ روزی کمانے کی نئی اور معقول صورتیں اختیار کریں۔ دنیوی اور مادی ترقی پر ملّت کی بقا کا انحصار ہے

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں
کھلی ہیں سفر اور تجارت کی راہیں نہیں بند صنعت و حرفت کی راہیں
کرو قدر اِس امن و آزادی کی کہ ہے صاف ہر سمت راہ ترقی کی[۲۴]

حالی فکر مند تھے کہ کس طور ایک صدی (۱۷۷۰-۱۸۷۰) کا علمی و اقتصادی خلا جلد پُر ہوجائے

نتائج ہیں جو مغربی علم و فن کے وہ ہیں ہند میں جلوہ گر سو برس سے
زمانہ مام ہے میرا تو میں سب کو دکھا دونگا کہ جو تعلیم سے بھاگیں گے نام اُن کا مٹا دونگا

اور دوسرے فرقوں کی طرح مسلمان بھی عزت، سکون اور خوشحالی کی زندگی گذار سکیں

بہت قافلے دیر سے جا رہے ہیں   بہت بوجھ بار اپنے لدوا رہے ہیں
مگر ایک تم ہی ہو کہ سوتے ہو غافل   مبادا کہ غفلت میں ہو کھوئی منزل[۵۵]

مغربی علم و فن کے اکتساب کی ضرورت محض سرکاری ملازمت نہ تھی بلکہ ان کے شعور سے کسب معاش کے نئے ذرائع کی تلاش خصوصاً ٹیکنیکل میدان میں اور اُن سے معاشی استفادہ بھی مقصود تھا۔ حالیؔ کو پوری ملت کی معاشی بہتری کا خیال تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ملت کے سب طبقے ملازمت کے نہ اہل ہو سکتے تھے اور نہ سب کے لیے ملازمتیں دستیاب تھیں۔ اس لیے انہوں نے تجارت، صنعت و حرفت اور دستکاری جیسے آزاد پیشوں کو اختیار کرنے کی طرف توجہ دلائی[۵۶]۔

اس اثنا میں برٹش حکومت نے شمالی ہندوستان میں وہابی تحریک کی خفیہ تنظیم کو توڑنے اور نیست و نابود کرنے کی باقاعدہ مہم شروع کی تا کہ اس کے شمالی مغربی سرحد پر واقع مراکز ستانہ ملکے وغیرہ Sittana Malke کمزور اور مسمار ہو جائیں۔ ۱۸۶۴ء۔۱۸۷۰ء کے درمیان تحریک کے سربراہوں اور اراکین کی جو بنگال، بہار، پنجاب اور ملک کے دیگر علاقوں سے سرحد پر روپیہ اور رضا کاروں کی متواتر و پابندی سے بہم رسانی کے کام میں منہمک تھے بڑے پیمانہ پر گرفتاریاں کی گئیں۔ ملکہ وکٹوریہ کے خلاف بغاوت و جنگ کے جرم میں اُن پر انبالہ، پٹنہ، کلکتہ کی عدالتوں میں مقدمات دائر کیے گئے جہاں سے سخت سزاؤں کے فیصلہ جاری ہوئے۔ ان سزا یافتہ قائدین کی طویل فہرست سے چند نام بطور حوالہ دیے جاتے ہیں۔ یحییٰ علی، احمد اللہ، عنایت علی، ولایت علی، جعفر، محمد شفیع، عبدالغفار وغیرہ۔ یہ تحریک آزادی سید احمد رائے بریلوی کی شہادت کے بعد اُس وقت تک یعنی چالیس سال سے ۱۸۳۱ء۔۱۸۷۱ء کسی نہ کسی شکل اور حالت میں برقرار رہی۔ مسلم معاشرہ میں مذہبی سماجی اصلاحات اور ہندوستان کی آزادی کے لیے جہاد اِس کے دو بنیادی مقاصد تھے۔ عموماً مسلمانوں کے نچلے اور متوسط طبقے اِس سے وابستہ رہے۔ مسلمان زمیندار اور سرکاری

ملازمین کا اِس سے سروکار نہ تھا۔ لیکن ہندوستان کی اِس تحریک آزادی کا تعلق نجد کے محمد بن عبدالوہاب نجدی (۱۷۰۳۔۱۷۹۲ء) کی وہابی تحریک سے نہ تھا۔ چونکہ دونوں تحریکوں کا سرچشمہ کتاب وسنت تھا جس کی وجہ سے کافی مذہبی مسائل میں مشابہت ہے تاہم چند امور جیسے توسل فی الدعا میں اختلاف۔ اس بحث کی تفصیلات کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ دراصل سید احمد رائے بریلوی کے سفر حج سے قبل (۱۸۲۲۔۱۸۲۳) نجد میں وہابی تحریک ساکن اور خاموش ہو چکی تھی۔ ۱۸۱۸ میں نجد پر ترکی کا مکمل تسلط قائم ہو گیا تھا۔ اس تحریک کا سیاسی ہمنوا اور معاون سلطان نجد عبداللہ بن مسعود کو مصر کے ابراہیم پاشا بن محمد علی نے شکست دے کر قید کر لیا تھا۔ ۱۸۱۶ سید احمد شہید نہ اِس تحریک سے متاثر ہوئے اور نہ ہی کوئی رابطہ قائم کیا[۲۷]۔

ولیم ولسن ہنٹر نے اپنی کتاب، ہمارے ہندوستانی مسلمان'' میں وہابی تحریک کی تاسیس، ارتقا، مقاصد، تنظیم، سرگرمیاں اور اس کے مسلم سماج اور حکومت پر جملہ اثرات سے تاریخی واقعات کی روشنی میں مفصّل بحث کی ہے۔ اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ غیر مسلم سلطنت (برطانوی) کے خلاف عسکری جہاد مذہب اسلام کا بنیادی اصول ہے۔ دیگر یہ کہ ہندوستانی وہابی تحریک اور نجد کی وہابی تحریک کا باہم دیگر گہرا رشتہ ہے اِس طرح اُس نے اسلام کے نظریہ جہاد کے معنی اور مفہوم کی غلط تشریح کی اور وہابیت کا مطلب صرف تشدد، کٹرپن، سختی اور نارواداری باور کرایا۔ تاکہ عوام اِس مکتب فکر سے برگشتہ اور متنفر ہو جائیں۔ سرسید احمد خاں نے ہنٹر کے اعتراضات اور مذہب اسلام پر تنقید کی جرأت اور قوت استدلال سے تردید کی۔ اور اس کے مفروضات کو سطحی بے بنیاد اور گمراہ کن ثابت کیا۔ سرسید نے پانیئر اخبار Pioneer میں کئی مضامین لکھے جن کا مجموعہ کتابی شکل میں لندن سے ۱۸۷۲ء میں شائع ہوا[۲۸]۔ سرسید کے اِن مضامین کا انگریز حکام پر مناسب وخاطر خواہ اثر ہوا۔ الطاف حسین حالی کا بیان ہے کہ ان مضامین کی اشاعت کے بعد کسی نام نہاد وہابی کو

بنگال میں گرفتار نہیں کیا گیا۔ سر ولیم میور کی وہابیوں کی بابت رائے اہم اور دلچسپ ہے جس کو حالی نے اپنے ایک مضمون میں نقل کیا ہے

> وہابی وہ ہے جو خالصاً خدا کی عبادت کرتا ہو۔ موحد ہو اور اُس کا دل ہوائے نفسانی اور بدعت کی آمیزش سے صاف ہو۔ اُس کو یہ کہنا کہ وہ ہمیشہ در پردہ تخریب سلطنت کی فکر میں رہتا ہے اور چپکے چپکے منصوبے باندھا کرتا ہے اور بغاوت کی تحریک کرتا ہے محض تہمت ہے[۲۱]۔

اِس دور کی دوسری عظیم، عہد آفریں اصلاح معاشرہ اور جدید تعلیم کی تحریک ۱۸۶۴ء میں سرسید احمد خاں نے شروع کی۔ اپنے جاری کیے ہوئے اخبار انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ذریعہ آپ نے مسلمانوں کو تاریخی تقاضوں کے پیش نظر ملت کی سماجی، معاشرتی حالت پر غور وفکر کی دعوت دی۔ آپ نے محض "گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر اپنی تحریروں سے لوگوں کے دلوں کو اُکسانے پر اکتفانہ کیا" بلکہ اپنے خیالات[۲۲] اور منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے عملی میدان میں خلوص نیت اور ہمت سے جدوجہد کی۔ ۲۴ رمئی ۱۸۷۵ کو آپ نے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا۔ اِس کالج کا نقشہ آپ نے لندن کے قیام ۷۰۔۱۸۶۹ میں تیار کرلیا تھا۔ اِس کالج میں ۱۸۷۸ انٹرمیڈیٹ اور ۱۸۸۱ میں بی۔اے کے درجات شروع کیے گئے۔ ۱۸۹۵ میں علی گڑھ کالج کے طلبا کی تعداد ۵۶۵ ہوگئی۔ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی چند مسلم ارباب فکر اور دانشوروں نے مسلمانوں کو ذہنی، شعوری طور سے مغربی تعلیم اور حکومت سے اشتراک کی ضرورت کو محسوس کرانے کے لیے انجمنیں تشکیل کیں۔ مثلاً عبداللطیف (۱۸۹۳۔۱۸۲۸) نے کلکتہ میں محمڈن لٹریری و سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیا ڈالی، اور سید امیر علی نے (۱۹۱۳۔۱۸۴۸) کلکتہ میں نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کی ابتدا کی، اِس انجمن کی شاخوں نے امرتسر، لکھنؤ، مدراس اور بمبئی میں مفید

کام انجام دیے۔ علاوہ ازیں مذہبی علما اور معلمین نے علوم جدیدہ کی طرف مسلمانوں کی توجہ مبذول کرائی۔ مولوی کرامت علی جونپوری (۱۸۰۰۔۱۸۷۳) مولوی چراغ علی (۱۸۴۴۔ ۱۸۹۵) مولوی نذیر احمد (۱۸۳۳۔۱۹۱۲) اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی (۱۸۴۸۔۱۸۸۶) نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے مذہبی اور تمدنی عقیدہ و روایت کی حدود میں مغربی علوم و فنون کی اہمیت کو نمایاں کیا۔ اُس وقت ہندوستان پر برطانوی حکومت کا تسلّط مکمل و مستحکم ہو چکا تھا۔ اِس صورت حال میں ۱۸۵۷ کی ناکامی کی تلافی ممکن نہ تھی۔ یعنی ملک کا قدیم نظام حکومت اور سماجی ڈھانچہ اب بحال نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ خیال مسلمانوں کے دوراندیش اور ذی شعور طبقوں میں بتدریج پھیل رہا تھا۔ حالانکہ اِس تاریخی حقیقت کا انکشاف جنگ بکسر ۱۷۶۴ کے بعد ہو چکا تھا۔ سیر المتاخرین کے مصنف غلام حسین طباطبائی نے لکھا تھا۔ ۱۷۸۰ کہ ''اب شمالی ہندوستان میں کوئی ہندوستانی سردار ایسٹ انڈیا کمپنی کی افواج کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا''۔ اپنی کمزوری اور شکست کا اعتراف ایک صدی گزر جانے کے بعد کیا گیا۔ تاریخ اپنی رفتار میں۔ کبھی دھیمی کبھی تیز۔ اُن عناصر کو جو اس کے ہمسفر نہ ہوں، پیچھے چھوڑ دیتی ہے۔ حالی کے اِن اقوال کا مفہوم ''ترقی کی پہلی سیڑھی اپنے تنزل کا یقین'' اور ''زمانہ نام ہے میرا تو میں سب کو دکھادونگا'' تاریخ کے اِس سیاق وسباق میں سمجھنا زیادہ بہتر ہوگا۔

اِن دس سال ۱۸۷۰۔۱۸۸۰ کی مدت میں ممالک اسلامیہ جو گزشتہ صدی سے روبہ انحطاط تھے، فرانس اور انگلینڈ کی نوآبادیوں میں تبدیل ہو گئے۔ اُس طرف روس توسیع علاقہ اور طاقت کے منصوبہ کے تحت ترکی پر حملہ آور ہوا تاکہ اس کمزور ملک کو نیست و نابود کردے۔ لیکن فرانس اور انگلینڈ نے روس کے خلاف جنگ کر کے ترکی کی سالمیت کو برقرار رکھا۔ پہلی کریمین جنگ crimean (۱۸۵۴۔۱۸۵۶) میں واقع ہوئی۔ نپولین سوم کے عہد میں فرانس نے انگلینڈ کے اِشتراک سے روس کو شکست دی اگرچہ اول الذکر کے

ستر ہزار سپاہی مارے گئے۔ ۱۸۷۷۔۱۸۷۸ میں روس نے ترکی پر دوبارہ حملہ کیا جس کے نتیجہ میں دوسری خوفناک جنگ جو کریمین جنگ کے نام سے مشہور ہے، واقع ہوئی۔ ترکی نے انگلینڈ اور فرانس کی مدد سے روس کو شکست دی۔ برلن معاہدہ (treaty of Berlin) کے بعد ترکی کے سلطان عبدالعزیز (۱۸۶۱۔۱۸۷۶) اور اُس کے جانشین عبدالحمید (۱۸۷۶۔۱۹۰۹) نے دنیائے اسلام کا خلیفہ ہونے کا اعلان کیا۔ روس اور ترکی کے مابین دوسری جنگ کے وقت ہندوستان کے مسلمانوں نے نفسیاتی وسیاسی وجوہات سے ترکی سے اظہار ہمدردی کیا۔ انہوں نے کثیر رقم جمع کر کے ترکی روانہ کی اور حکومت ہند پر دباؤ ڈالا کہ اس جنگ میں برطانیہ ترکی کی مدد کرے۔ لارڈ لٹن نے ۱۸۷۷ لارڈ سیلس بری (Lord Salisbury) (۱۸۳۰۔۱۹۰۳) سکریٹری آف اسٹیٹ کو خط لکھا۔ ''برٹش سامراج مسلم طاقت ہے۔ اس لیے مشرق وسطیٰ میں برطانوی پالیسی کی تشکیل میں ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کا خیال رکھنا چاہیے''۔ سوئز کینال کی تعمیر ۱۸۶۹ کے بعد انگلینڈ نے مصر کے اندرونی معاملات میں جارحانہ مداخلت شروع کر دی تھی۔

مسلم ممالک میں اِن سیاسی انقلابات کی تفصیلات معاصر اردو اخبارات اور رسائل نے متواتر درج کیں اور ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات کو اُن کی غم خواری اور ہمدردی میں برانگیختہ کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ لیکن حالی نے مسدس میں اِن واقعات کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے۔ حالی کی توجہ کا خاص مرکز ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی ترقی تھا جو ان کی خوشحالی، پرسکون اور باوقار اجتماعی زندگی کی ضامن تھی۔ ترقی سے مراد سیاسی طاقت کا حصول نہ تھا بلکہ موجودہ مفلوک الحالی کے ادبار سے نکلنا تھا۔ خارزار سیاست کے پیچیدہ مسائل سے ذہنوں کو پراگندہ کرنے کی بجائے وہ ملت کی توجہ کسب معاش کا شعور اور طریقہ کار کی طرف توجہ منعطف کرنا چاہتے تھے۔ مسدس کے کافی اشعار سے حالی کے اِس بنیادی نظریہ کی تائید ہوتی ہے

بنے قوم کھانے کمانے کے قابل — زمانہ میں ہو منھ دکھانے کے قابل
تمدن کی مجلس میں آنے کے قابل — خطاب آدمیت کا پانے کے قابل[۲۱]

عروج اسلام کی سرگذشت میں جن کارناموں کو مسدس میں نمایاں کیا گیا ہے، وہ مذہبی، علمی، سائنٹفک اور ثقافتی شعبہ جات میں حیرت ناک ترقیات ہیں جن سے اہل یورپ بھی مستفید ہوئے اور مسلمانوں کے یہ علوم یورپ کے نشاۃ ثانیہ کے موجب ثابت ہوئے۔ عطار، حلاج، ابوالفضل، ابونصر، بوعلی سینا، سراج وغیرہ کا شمار اسلام کے ہیرو کی فہرست میں کیا گیا۔ مسلم علوم کے مراکز۔ قرطبہ، بغداد، بخارا وغیرہ۔ کی نشاندہی کی گئی ہے

وہ تارے جو تھے شرق میں لمعہ افگن — پہ تھا اُن کی کرنوں سے تا غروب روشن
نوشتوں سے ہیں جن کے اب تک مزین — کتب خانہ پیرس و روم و لندن
پڑا غلغلہ جن کا تھا کشوروں میں
وہ سوتے ہیں بغداد کے مقبروں میں[۲۲]

الپ ارسلاں اور طغرل کے مابین مکالمہ سے یہ اصول اخذ کیا گیا کہ اقبال مندی کی علامت یا شرط ملک پر قبضہ، سیاسی اقتدار اور جاہ و حشمت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ عناصر فانی ہیں۔ زمانہ کے حوادث و گردش سے کوئی سلطنت محفوظ نہیں رہی ہے۔ لیکن علم و فن کا جوہر باقی رہ جاتا ہے جس کو فنا نہیں

ضرورت نہیں یہ کہ فرماں رواں ہوں
رعیت ہو وہ خواہ کشور کشاں ہوں

مسلمانوں کا کوئی بھی پیشہ معاش ہو۔ سپاہی ہوں، تاجر ہوں یا ناخدا ہوں، جو بھی ہوں خوش حالی کی زندگی گذاریں۔ جس کی بنیاد محنت اور جفاکشی پر ہے۔ اِس لیے علم و فن پھیلاؤ جن سے تمہاری نسلیں ترقی کریں۔ غریبوں کو راہ ترقی آسان ہو جائے اور امیروں میں نور علم تاباں ہو[۲۳]۔

حالی نے ترقی کے مفہوم اور اُس سے متعلقہ امور کی جو اُس وقت مسلمانوں میں بحث کا موضوع تھے نہایت بسط و تفصیل سے ایک علیحدہ مقالہ میں تشریح کی ہے۔ مختلف سوالات جو زیرِ بحث تھے، اُن کا لب لباب حالی کے الفاظ میں مندرجہ ذیل تھا

> الغرض کیا پُرانے خیال والے اور کیا نئے خیال والے دونوں عموماً سعی و کوشش کو عبث و رائیگاں خیال کرتے ہیں۔ پہلے اِس لیے کہ ترقی ضروری نہیں اور پچھلے اِس لیے کہ ترقی ممکن نہیں [۳۲]۔

ان سوالات کے جواب میں حالی لکھتے ہیں کہ جن قوموں نے زمانہ حال میں قواعد جنگ و آلات حرب میں حیرت انگیز ترقی کی ہے اور فنون جہانبانی اور کشور کشائی میں بدرجہ کمال کامیابی حاصل کی، وہ مغلوب قوم کو کبھی ان وسائل میں برابر نہ ہونے دیں گے جن کے سبب سے اُن کو غلبہ حاصل ہوا۔ اس لیے تنزلی کے بعد طاقت اور اقتدار کو دوبارہ واپس لانے کے لیے جنگ سعی لاحاصل کے مترادف ہوگی۔ البتہ زندگی کے دوسرے شعبہ جات میں ترقی کے لیے امن و آزادی کا ماحول موجود ہے یہ ماحول گذشتہ صدی میں نہ تھا۔ مسلمانوں کو اپنے زوال کا پختہ یقین ہو اور مایوسی و ناامیدی جو مانع ترقی ہیں اپنے ذہن اور شعور پر طاری نہ ہونے دیں۔ جو لوگ مسلمانوں کی بہبودی سے بالکل مایوس ہو گئے ہیں اور ملت کو ایسا بیمار سمجھتے ہیں جس کی طاقت روز بروز زائل ہو رہی اور وہ چند روز کی مہمان ہے، حالی ان کی اِس رائے سے اتفاق نہیں کرتے ہیں۔ اُن کا مشورہ تھا کہ مسلمان دنیا کی ترقیات کے تناظر میں ترقی کے مواقع تلاش کریں اور اپنی اندرونی صلاحیتوں کو بروے کار لاکر اور انتھک محنت سے ترقی کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہندوستان کی بیشتر قومیں جیسے بنگال اور گجرات کے ہندو اور پارسی کس قدر پست تھے۔ اُنہوں نے امن و آزادی کے ماحول میں کس قدر ترقی کی ہے۔ ہندوستان کے باہر یہودی قوم کی ترقی اس دلیل کی روشن مثال

ہے۔ اِس قوم میں عالم فاضل، ہر ہنر میں یکتائے روزگار اور دولت مندوں کی کثیر تعداد ہے۔ ان کی تجارت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ اِس قوم کے بعض دولت مند یورپ کی چند سلطنتوں کو قرض دیتے ہیں۔ گو وہ کسی ملک کے مالک اور حکمراں نہیں ہیں اور نہ ہی جنگ و جدل اور ملکوں کی فتوحات ان کا نصب العین ہے۔ حالی نے اِس مفروضہ کی کہ مذہب اسلام مسلمانوں کی ترقی میں حائل اور مانع ہے، وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اول "اگر مسلمان اپنے مذہب سے دست بردار ہو جائیں اور قطع تعلق کر لیں تو وہ مسلمانوں کی ترقی نہ ہوگی بلکہ ایسی قوم کی ترقی ہوگی جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہ ہوگا"۔ عیسائی قومیں جس طرح دنیاوی ترقی میں سب سے زیادہ عظیم مرتبہ پر ہیں، اُسی قدر وہ اپنے دین و مذہب کی اشاعت و تبلیغ میں سب سے زیادہ سرگرم ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نہ پہلے اور نہ اب ترقی کی راہ میں رکاوٹ رہا ہے[۲۵]۔

دوسرے سوال کے جواب میں کہ اگر ترقی یافتہ قوموں کے برابر مسلمان نہیں ہو سکتے ہیں تو ترقی کے لیے کوشش فضول ہے اور سو دو سو سال میں ہزار دو ہزار تعلیم یافتہ مسلمان ممتاز ہو گئے تو اسے ترقی نہیں کہہ سکتے ہیں اس ضمن میں حالی کا جواب تھا۔ "بے شک یہ بات صحیح ہے لیکن ہماری کوشش صرف اِس بات کی ہونی چاہیے کہ ہم اپنی ہم وطن قوموں سے جنھوں نے ہم سے بہت پہلے قدم آگے بڑھایا ہے، کسی چیز میں کم نہ رہیں[۲۶]۔"

نہ ہو تاب پرواز گر آسمان تک — تو واں تک اڑیں ہو رسائی جہاں تک
کرو کچھ کہ کرنا ہی کچھ کیمیا ہے — مثل ہے کہ کرنے کی سب بدیا (علم و ہنر) ہے

دوسری قوموں کا حال کس صاف اور راست گوئی کے انداز میں کیا ہے

یہاں اور ہیں جتنی قومیں گرامی — خود اقبال ہے آج اُن کا سلامی
تجارت میں ممتاز دولت میں نامی — زمانے کے ساتھی ترقی کے حامی
نہ فارغ ہیں اولاد کی تربیت سے — نہ بے فکر ہیں قوم کی تقویت سے

حالؔی کا اشارہ بنگال اور دوسرے علاقوں میں اُن تعلیمی، سماجی اور مذہبی اصلاحی تحریکوں کی جانب ہے جو تہذیب الاخلاق کے اجرا ۱۸۷۲ سے قبل شروع ہو چکی تھیں۔ جس کے نتیجہ میں وہاں کے متوسط طبقوں نے دورِ جدید کے علوم و ہنر میں فضیلت حاصل کر لی تھی۔ راجہ رام موہن رائے (۱۸۳۳۔۱۷۷۴) نے ۱۸۲۸ میں برہمو سماج قائم کی۔ دوار کا ناتھ ٹیگور، پرسنا کمار ٹیگور، رام چندر ور ما دیا ساگر، کشیب چندر سین اور سوامی دیانند سرسوتی بانی آریہ سماج تحریک ۱۸۷۵ جیسے مصلحین نے ہندو سماج میں بیداری کی لہر دوڑا دی۔ انہوں نے وقت کا مقتضےٰ سمجھا اور اپنی قوم کو قدیم تہذیبی دائرہ میں رہتے ہوئے نئے سانچے میں ڈھل جانے کی ہدایت کی

ہر اک سانچے میں جا کے ڈھل جاتے ہیں وہ　　جہاں رنگ بدلا بدل جاتے ہیں وہ
ہر اک وقت کا مقتضےٰ جانتے ہیں　　زمانہ کے تیور وہ پہچانتے ہیں[۳۸]

جس کے نتیجہ میں ہندو کالج ۱۸۱۸، سنسکرت کالج ۱۸۵۱ء اور کلکتہ کالج ۱۸۶۱ میں قائم ہوئے۔ یہاں کے تعلیم یافتہ نہ صرف بنگال، بہار بلکہ یو۔ پی کے بڑے شہروں۔ بنارس، لکھنؤ، الہ آباد، آگرہ اور دہلی کے سرکاری دفاتر اور کالجوں میں چھوٹے اور بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ حالؔی نے صحیح لکھا

مدار اہلکاری کا ہے اب اُنہیں پر
اُنہیں کے آفس اُنہیں کے ہیں دفتر

حالؔی کا اجتماعی یک جہتی و اتحاد سے مطلب سیاسی تنظیم بنانا نہ تھا بلکہ اجتماعی مفاد کی غرض سے ملازمتوں اور روزگار کے ذرائع فراہم کرنا اور اِس سلسلے میں ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ یعنی تعلیمی ادارے، اسپتال، لائبریری اور تجارت کے مرکز قائم کرنا چاہیے تاکہ مسلمان حکومت کی نگاہ کرم پر انحصار نہ کریں بلکہ اقتصادی اور معاشی معاملات میں اپنی مدد کرنے اور خود کفیل ہونے کے قابل ہو جائیں۔ وہ ملت کی معمولی خدمت کو جو کسی نہ کسی

پیمانہ پر اُس کی فلاح و بہبود کے لیے کی جائے اہمیت دیتے تھے۔ انہوں نے اس کی مثال ایک بڑھیا کے مٹی کے دیے سے دی جو اُس نے اپنے گھر سے لاکر سرراہ روشن کیا تھا کہ رہ گیر اور پردیسی ٹھوکر نہ کھائیں۔ اجتماعی مسائل کے حل کی اجتماعی طور پر کوشش اِس وجہ سے بھی لازم تھی کہ مسلمانوں کی حکومت جس پر ان کا ملازمتوں، جاگیروں اور مدد معاش، وظیفہ انعام و اکرام کے واسطے انحصار تھا، اب موجود نہ تھی۔ یہ ایک صدی قبل ختم ہو گئی تھی۔ دراصل اِس انحصار نے مسلمانوں کے قوائے عملیہ معطل اور بے حرکت کر دیے تھے۔ اپنے جملہ کاموں اور ضروریات کے لیے وہ حکومت کی طرف دیکھنے کے عادی ہو گئے اور از خود اپنی ترقی و اصلاح کی تدبیر نہ سوچ سکے اور نہ ہی پیش قدمی کر سکے۔ اُس وقت کے سرداروں کو عوام سے ہمدردی نہ تھی اور نہ ہی اجتماعی مقاصد کا تصور یا نظریہ، ہر ایک قبیلہ، خاندان اور گروہ کے اغراض جُدا تھے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں شکست کے بعد اِن کی تباہی اور افلاس نے بھیانک شکل اختیار کر لی۔

مسدس حالی کے موضوعات کثیر، مختلف النوع اور بحث طلب ہیں۔ اِن سب کا تجزیہ اِس مختصر مضمون میں کرنا ممکن نہیں ہے۔ بہرحال حالؔی نے اپنے فلسفیانہ تخیلات، تصورات کو نہایت مدلل اور دلنشیں انداز میں پیش کیا ہے۔ تاریخی واقعات، مشاہدات، پند و نصائح کا ایک صاف شفاف دریا بہتا ہوا محسوس ہوتا ہے جس کی ہر موج تعمیری کاموں کے لیے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرتی ہے۔

۱۔ صالحہ عابد حسین، یادگار حالی، دہلی ۱۹۳۹ء، صفحات ۸، ۹۔
۲۔ مسدس حالی، خدا بخش ایڈیشن، پٹنہ ۱۹۹۵ء۔
۳۔ مسدس حالی، صفحہ ۲۱۔
۴۔ مسدس حالی، خدا بخش ایڈیشن، پیش لفظ، ڈاکٹر عابد رضا۔
۵۔ مسدس حالی، صفحہ ۱۹۔
۶۔ مسدس حالی، خدا بخش ایڈیشن، صفحہ ۱۹۔
۷۔ "حالؔی سے ہم نے کہا اے میرے مخدوم خدا نے تم کو زبان دی ہے۔ معجز بیان دی ہے۔ لِلّٰہ اپنی قوم کے حال

پر رؤو۔ قوم کی جو تباہ حالت ہے اُس پر مثل قرطبی کے مرثیہ لکھ دو" علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مرتبہ اصغر عباس، لکھنؤ۔۱۹۸۲ء، صفحہ ۶۸۔
۸۔ صالحہ عابد حسین، یادگار حالی، صفحہ ۳۲۔
۹۔ مسدس حالی، خدا بخش ایڈیشن، بہ حوالہ مولوی عبدالحق، صفحہ ۲۵۔
۱۰۔ مسدس حالی، دوسرا دیباچہ، صفحات ۹۔۱۰۔
۱۱۔ P Hardy The Muslims of British India.(Cambridge 1972)P 1-3
۱۲۔ مسدس حالی، صفحات ۵۶، ۸۲، ۸۵
۱۳۔ مسدس حالی، صفحہ ۵۶
۱۴۔ مجموعہ نظم حالی، مرتبہ مع تنقید و تبصرہ، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی (علی گڑھ، ۱۹۸۱) صفحات ۵۵، ۵۶
۱۵۔ Wilffred Cantwell Smith. Modern Islam in India. (Lahore 1943) p 188-189
Aziz Ahmad. Islamic Modernism in India and Pakistan (london, 1967) p.98,100
۱۶۔ The Indian Musalmans, p 21
۱۷۔ The Indian Musalmans, p 149, 173
ولیم ولسن ہنٹر اپنے وقت کا ممتاز ادیب، محقق اور مورخ تھا۔ اُس کی سب سے پہلی کتاب 'غیر آریائی زبانوں میں مماثلت کی لغت' A comparative Dictonary of the Non - Aryan Languages in India and High Asia کی علمی ادبی حلقوں میں کافی شہرت ہوئی۔ اس کارنامہ پر اُس کو L L D کی اعلیٰ ڈگری سے نوازا گیا۔
۱۸۔ The Muslims of British India p 91
۱۹۔ II bid. p 85
۲۰۔ Ram Gopal, Indian Muslims, A Political History, (1858-1947), (Bombay,1959), P 24,25
۲۱۔ Education Commission Report, (Calcutta, 1882) P 291,434,493
۲۲۔ Education Commission Report, 1882, P 291
۲۳۔ Modern Islam in India, P 190,191,196, S Gopal,
British Policy in India, (Cambridge, 1965) P 158, francis Robinson, Sepratism Among Indian Muslims, (Cambridge, 1975) Chapter I), Mushirul Hasan, Nationalism and Communal Politics in India, 1885-1930 (Delhi,1991), P 3-5
Muhammad Yusuf Abbasi, the Genesis of Muslim Fundamentalism in British India (New Delhi, 1987)
۲۴۔ مسدس حالی، صفحات ۸۴، ۸۵
۲۵۔ ایضاً صفحہ ۸۵
۲۶۔ مقالات حالی، حصہ اول، صفحہ ۲۴۷
۲۷۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، غلام رسول مہر، سرگذشت مجاہدین (لاہور۔۱۹۵۶) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (لکھنو ۱۹۶۸)
Qeyamuddin Ahmad, The Wahabi Movement in India, (Calcutta, 1966) Chapter VIII

۲۸۔ Dr Hunter's Gur Indian Musalmans- are they bound in conscience to rebel against the queen, compiled by Hafiz Ahmad Hasan,(London1872), Also, Z U Malik, "Historical writings of Sir Syed Ahmad Khan on the Indian Revolt," 1857-59 " Sir Syed Ahmad Khan, a centenary Tribute, edited by Aslob Ahmad Ansari, (Delhi,2001) P 159,168, 172-173

۲۹۔ مقالات حالی، حصہ اول، صفحہ ۲۱۸

۳۰۔ علی گڑھ میگزین، علی گڑھ نمبر، مرتبہ نسیم قریشی، ۱۹۵۵ء، صفحات ۱۵، ۳۶، ۷۹

۳۱۔ مسدس حالی، صفحہ ۱۲۵۔

۳۲۔ ایضاً، صفحات، ۳۵، ۳۶، ۳۹، ۱۱۳۔

۳۳۔ ایضاً، صفحات، ۹۸، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۲۵۔

۳۴۔ مقالات حالی، حصہ اول، صفحہ ۱۲۵۔

۳۵۔ ایضاً، حصہ اول، صفحات ۱۳۷۔ ۱۳۹۔

۳۶۔ ایضاً، حصہ اول، صفحہ ۱۳۶۔

۳۷۔ مسدس حالی، صفحہ ۴۷۔

۳۸۔ ایضاً۔

عبدالودود اظہر

حالی۔ حیات سعدی کے حوالے سے

حالی نے اسلوب کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ ان کے طرز کو ہی زمانہ نے قبولیت عطا کی جبکہ ان کے معاصرین آزاد، نذیر احمد، شبلی اور سرسید سب ہی اپنے زمانہ میں صاحب طرز تھے لیکن آنے والے زمانہ نے دوام کی سند حالی کو ہی دی۔ وہ شعر میں غالب کے معتقد، میر کے مقلد اور شیفتہ سے مستفید تھے لیکن نثر میں وہ غالب سے متاثر اور سرسید کے نزدیک ہیں، حالی اردو کے شرمیلے اور خاموش محسن ہیں۔ جدید شاعری ہو تو وہ آزاد کی طرف اشارہ کرتے ہیں، علمی تنقید، سیرت نگاری، اصلاح قوم، اردو نثر میں سادگی، سلاست اور پرکاری جب ان کی طرف احسان مندی کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے تو وہ سرسید کی طرف اپنی انگلی اٹھا دیتے ہیں۔

خواجہ صاحب نے فارسی ادب کے سرمایہ میں سے سعدی کا انتخاب کیا۔ ان کے پیش نظر سعدی کی تحریروں نے خاص طور سے گلستان و بوستان میں جو رول گذشتہ چھ سو برسوں میں کیا تھا اور ایک بہت بڑے خطے میں کئی نسلوں کی ذہنی تربیت کی تھی، اس وجہ سے

حیات سعدی کی طرف وہ متوجہ ہوئے۔ ظاہر ہے فردوسی، رومی یا حافظ کی زندگی یا ان کے کلام پر وہ اگر لکھتے تو ایک محدود طبقے کے لیے مفید ہوتا۔ سعدی کی تحریریں بھی اتنی ہی شگفتہ، دلچسپ، مفید، سلیس لیکن سہل ممتنع ہیں۔ جو بات وہ کہتے ہیں اس میں صرف لفاظی نہیں بلکہ اس میں ان کا سوز بھی شامل ہے۔ حالؔی کی نثر میں بھی نہ بے رنگی ہے اور نہ پھیکا پن۔ فارسی کے سینکڑوں نثر نویسوں اور ادیبوں میں یہ مقام حالی کے مورث اعلی خواجہ عبداللہ انصار کو بھی حاصل ہے کہ ان کی مناجات بھی نثر مسجع لیکن اثر آفرینی میں شعر سے زیادہ۔

گلستان کے مقدمے میں سے صرف دو سطریں بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں اور پھر حالی کے ایک مقالہ مناجات سے مقابلہ کیجیے۔

''منت خدای را عزوجل کہ طاعتش موجب قربتست و بشکر اندرش مزید نعمت۔ ہر نفسی کہ فرو میرود، مد حیاتست و چون برمی آید مفرح ذات۔ پس در ہر نفسی دو نعمت موجودست و بر ہر نعمتی شکری واجب

از دست و زبان کہ برآید
کز عہدۂ شکرش بدر آید

''الٰہی تیرا اکرم وسیع، تیری عنایت شامل، تیرا فیض عام، تیرے ہاتھ کشادہ، تیرا ملک بے زوال، تیرے خزانے بے حساب، تیری نعمتیں سرمدی، تجھ سے کیا مانگیے اور کہاں تک مانگیے''۔

مولانا حالی نے اردو کو تین سوانح عمریاں یا تذکرے دیے ہیں حیات سعدی۔ یادگار غالب اور حیات جاوید۔ ان تینوں ہیروز اور شخصیتوں سے ان کا ایک قلبی لگاؤ، ارادت اور مخلصانہ تعلق خاطر تھا۔ مرزا غالب ان کے استاد اور ممدوح تھے۔ سرسید سے دوستانہ مراسم کے ساتھ مقصد کی ہم آہنگی اور منزل مقصود کا ایک ہونا پیش نظر تھا۔ سعدی نے یہ کام کئی صدیوں پہلے انجام دیا تھا اور برابر اصلاح معاشرہ اور مکارم اخلاق کا کام ان کی تحریریں انجام دے رہی تھیں۔ اسلامی دنیا بلکہ مشرق میں مہذب و تعلیم یافتہ اشخاص سعدی کے نام

سے واقف تھے۔ بلکہ اکثر نے ان کی تحریروں سے ہی زندگی کے وہ تجربات حاصل کیے تھے جن سے مس کندن بنتی ہے۔

حیات سعدی کے دیباچے میں خواجہ صاحب نے سوانح عمری کا مختصر تعارف دیا ہے

''مشہور آدمیوں کا حال لکھنا جس کو یونانی میں بیوگرافی اور عربی میں ترجمہ یا تذکرہ کہتے ہیں، کم و بیش قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے۔ اگرچہ اس وقت زیادہ تر بہادروں کے معرکے اور دیوتاؤں کے کرشمے لوگوں کو اکثر زبانی یاد ہوتے تھے جو مناسب موقعوں پر بیان کیے جاتے تھے۔ لیکن یہودیوں کے یہاں قدماء کی سرگذشتیں بھی لکھی جاتی تھیں۔ یہودیوں کے بعد یونانیوں اور رومیوں نے اس طرف توجہ کی۔ چنانچہ یونان کے مشہور بیوگرافر پلوٹارک کی بیوگرافی جو دوسری صدی عیسوی میں لکھی گئی، اس عہد کے تذکروں میں ممتاز اور برگزیدہ ہے۔

لوگوں کے حالات محض بطور روایت کے بیان کرتے تھے، درایت کو اس میں کچھ دخل نہ دیتے تھے اور بیان میں مبالغہ کو زیادہ کام میں لاتے تھے۔ مسلمانوں کی بیوگرافی میں بھی یہی عام خاصیت پائی جاتی ہے۔ صرف رجال حدیث کے حالات جو محدثین نے لکھے ہیں، ان میں البتہ بہت احتیاط کی گئی ہے ہر ایک شخص کے اخلاق اور خصائل راست راست بے کم و کاست لکھے گئے ہیں اور ان کے عیب اور خوبیاں پوست کندہ بیان کی گئی ہیں، باقی علماء اور شعراء وغیرہ کے تذکرے اکثر ایسے نہیں ہیں اور چونکہ تذکرہ نویسی کا مدار محض نقل اور روایت پر تھا، اس لیے ان لوگوں کے سوا جن کے حالات تاریخ میں مفصل لکھے گئے ہیں، جیسے خلفا، سلاطین، وزرا اور سپہ سالار وغیرہ باقی تمام اہل کمال کے حالات مختصر طور پر تحریر ہوئے ہیں اور مشہور سے مشہور مصنف کی لائف بھی جداگانہ نہیں لکھی گئی۔ زمانہ حال میں یوروپ کے مورخوں نے خاص کر سترہویں صدی سے بیوگرافی کو بے انتہا ترقی دی ہے۔ یہاں تک کہ تاریخ کی طرح بیوگرافی نے بھی فلسفہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔

بیوگرافی ان بزرگوں کی ایک لازوال یادگار ہے جنھوں نے اپنی نمایاں کوششوں

سے دنیا میں کمالات اور نیکیاں پھیلائی ہیں اور جو انسان کی آیندہ نسلوں کے لئے اپنی مساعی جمیلہ کے عمدہ کارنامے چھوڑ گئے ہیں۔ خصوصاً جو قومیں کہ علمی ترقیات کے بعد پستی اور تنزل کے درجہ کو پہنچ جاتی ہیں، ان کے لیے بیوگرانی ایک تازیانہ ہے جو ان کو خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے۔ جب وہ اپنے اکابرواسلاف کی زندگی کے حالات اور ان کے کمالات دریافت کرتے ہیں، تو ان کی غیرت کی رگ حرکت میں آتی ہے۔ اور اپنی کھوئی ہوئی عزت اور برتری کے دوبارہ حاصل کرنے کا خیال ان کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ دنیا میں اکثر لوگ ایسے گذرے ہیں جنھوں نے بڑے بڑے آدمیوں کی زندگی کے حالات صرف کتابوں میں پڑھ پڑھ کر اپنے تئیں انسانیت کے اعلی درجہ تک پہنچایا تھا چنانچہ لکھا ہے لوتھر کے دل میں جو ایک غیر معمولی تحریک پیدا ہوئی اور بنجمن فرینکلن نے نہایت پست حالت سے اعلیٰ درجہ تک ترقی اور شہرت حاصل کی اس کا بڑا سبب یہی بیوگرانی کا مطالعہ تھا

"بیوگرانی چلا چلا کر اور سمندر کے طوفان کی طرح غل مچا کر
یہ آواز دیتی ہے کہ جاؤ اور تم بھی ایسے ہی کام کرو"

ہم نے اس خیال سے کہ شیخ سعدی شیرازی کا نام حد سے زیادہ مشہور ہے۔ شاید ان کے مفصل حالات بہم پہنچ جائیں، ان کی سوانح عمری لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔

ہندوستان میں اس سے زیادہ کوئی مسلمان مصنف مقبول اور مشہور نہیں ہے اور خاص کر فارسی زبان کے شعرا میں میرے نزدیک کوئی شاعر اس کے رتبے کو نہیں پہنچا۔

حیات سعدی کو دو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں سعدی کی سوانح عمری اور دوسرے میں تصنیفات۔ ایک حصہ خاتمہ، اس میں شاعری سے بحث کی گئی ہے۔

۔ حالی حالات زندگی، فارس اور شیراز کا حال، وہاں کا جغرافیہ، تاریخ، ماحول تا کہ قاری پورے طور پر مانوس ہو جائے وہ اشارہ کر کے اس کو چھوڑ دیتے ہیں۔ تا کہ وہ اس عہد میں پہنچ جائے اور اپنے مطالعے کے سفر کا آغاز تاریخ کے اس دور میں کرے۔ اس کے بعد

سعدی کا نام، نسب، ولادت اور بچپن۔ سعدی بچپن میں ہی یتیم ہو گئے۔ ماں نے سختی سے پالا۔ تعلیم کا حال نظامیہ بغداد میں تحصیل علم۔

تاتاریوں کے ہاتھوں خلفائے بنی عباس کے آخری خلیفہ مستعصم باللہ کا قتل، اس پر سعدی کا مرثیہ اور حالی کا ترجمہ وتبصرہ

آسمان را حق بود گر خون ببارد برزمین
برزوال ملک مستعصم امیرالمومنین
ای محمد گر قیامت می برآری سر زخاک
سر برآورین قیامت درمیان خلق بین
نازنینان حرم را خون خلق نازنین
ز آستان بگذشت و مارا خون دل از آستین

شیخ نے حقیقت میں مستعصم باللہ کا مرثیہ نہیں لکھا بلکہ اسلام کا مرثیہ لکھا ہے۔ اور اگر اس موقع پر حسان بن ثابت موجود ہوتے تو ان کو بھی ایسا ہی مرثیہ لکھنا پڑتا۔ مستعصم کے حال پر یہ شعر صادق آتا ہے

ہمارے بعد بہت روئے ہم کو اہل وفا
کہ اپنے مٹنے سے مہر و وفا کا نام مٹا

دوسرے باب میں شیخ کی تصنیفات سے بحث کی گئی ہے

گلستان کے تتبع میں بہارستان، خارستان اور پریشان، اسی طرح بوستان کا مقابلہ نظامی کے سکندرنامہ سے کیا گیا ہے۔

مطائبات و ہزلیات ومضحکات۔ شیخ کی کلیات کا سب سے اخیر حصہ مجموعۂ ہزلیات ہے جو تیس بتیس صفحہ سے زیادہ نہ ہوگا۔ یہ مجموعہ فی الحقیقت شیخ کے عارض کمال پر ایک نہایت بدنما سہ ہے جو شیخ کی شان سے نہایت بعید اور اس کے فضل وکمال و بزرگی کے

بالکل منافی ہے۔

خلقت کی خیر خواہی اور ہمدردی خدا تعالیٰ نے اس کی سرشت میں ودیعت کی تھی۔ اس کے نصائح اور مواعظ ہرگز اس قدر مقبول نہ ہوتے اگر انسانی ہمدردی کا جوش اس کے دل میں نہ ہوتا۔ اس نے اپنی زبان اور قلم کو پند و نصیحت کے لیے وقف کر دیا تھا اور حق بات کہنے سے خطرناک موقعوں پر بھی نہ چوکتا تھا۔ غرض کہ اس کی تمام عمر فضائل انسانی اور نیرنگی روزگار کے مطالعے میں بسر ہوئی تھی، اسی سبب سے یوروپ کے بعض مصنفوں نے اس کو گریٹ مورلسٹ، کہا اور اسی وجہ سے اخلاق بشری کی تصویر جس عمدگی سے اس نے اپنے کلام میں کھینچی ہے ویسی آج تک ایران کے کسی شاعر سے نہیں کھنچ سکی۔

شعر العجم کی دوسری جلد میں مولانا شبلی نے شیخ کے حالات لکھتے وقت فٹ نوٹ میں تحریر کیا ہے

> ''مولوی الطاف حسین صاحب حالی نے حیات سعدی میں سعدی کے حالات اور شاعری پر جو کچھ لکھ دیا اس کے بعد کچھ لکھنا بے فائدہ ہے، لیکن بعض تعلیم یافتہ دوستوں نے حد سے زیادہ اصرار کیا اور آخر مجبوراً لکھنا پڑا''

خواجہ صاحب نے حیات سعدی ٹکڑے ٹکڑے مختلف تذکروں اور ان کے کلام سے جمع کر کے اس طرح سے پڑھنے والوں کے سامنے پیش کی ہے کہ

ما نامہ بہ او سپردہ بودیم
او نافۂ مشک اذفر آورد

ا۔ عیسائی مذہب کا مبلغ و مصلح پیدائش ۱۴۸۳ء، وفات ۱۵۴۶ء

۲۔ از مولانا عبدالرحمٰن جامی ۳۔ از مجد الدین خوافی در دور اکبر ۴۔ از آئی

صغرا مہدی

تحریک نسواں کے علمبردار:

خواجہ الطاف حسین حالؔی

جدید خیالات اور نئے زمانے کی آمد سے لوگوں کو سماج میں عورتوں کی ابتر حالت کا احساس ہونا شروع ہوا اور دنیا بھر میں عورتوں کی تعلیم اور آزادی کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ انگریزی میں اس کے لیے (famanism) فیمنزم کا لفظ استعمال ہونے لگا۔ اس کی توجیہات الگ الگ وقتوں الگ الگ ملکوں میں مختلف تھیں۔ اس کی صاف وجہ ہے کہ وقت کے ساتھ اس کا تصور بدلتا گیا اور اس میں وسعت آتی گئی۔

ہندوستان میں انیسویں صدی میں اس کی ابتدا ہوئی۔ برہمو سماج، آریہ سماج، تھیوسوفیکل سوسائٹی کے ذریعے عورتوں کی تعلیم اور آزادی پر زور دیا جانے لگا۔ اِن رسموں کے خلاف آواز اٹھائی گئی جن کے نام پر عورتوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا جارہا تھا جس میں سب سے بھیانک رسم ''ستی'' کی تھی۔

۱۸۵۷ء کے بعد سرسید نے ہندوستان، خاص طور سے شمالی ہندوستانی کے

مسلمانوں میں تجدّد کی تحریک شروع کی مگر اس سے عورتوں کو بالکل الگ رکھا۔ اس لیے کہ ان کے ذہن میں عورتوں کے مقابلے میں مردوں کی برتری اور اہمیت کا خیال بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس سوال پر کہ عورتوں کے لیے بھی تعلیم ضروری ہے اور ان کو زمانے کے بدلنے کی ضرورت ہے، کبھی تو یہ جواب دیتے تھے کہ جس ملک میں مردوں کی اتنی ابتر حالت ہے اس میں عورتوں کی ترقی اور تعلیم کا کیا سوال ہے۔ جب عورتوں نے ان سے اس کی شکایت کی تو انہوں نے یہ جواب دیا "میری پیاری بہنوں! یقین جانو دنیا میں کوئی ایسی قوم نہیں ہے، جس میں مردوں کی حالت درست ہونے سے پہلے عورتوں کی حالت درست ہوگئی ہو عورتوں کی تعلیم کی نسبت میرے وہی خیالات ہیں جو قدیم بزرگوں کے تھے پس جو علوم اس زمانے میں مفید تھے وہ صرف دینیات اور اخلاق تھے۔

مولوی ممتاز علی جو تحریک آزادیٔ نسواں کے بہت بڑے حامی تھے، انہوں نے عورتوں کی تعلیم اور حقوق پر کتاب کا مسودہ خوش ہو کر دکھایا کہ سرسید خوش ہوں گے مگر ان کو اس پر اتنا غصہ آیا کہ انہوں نے اسے پھاڑ ڈالا کیونکہ ان کا یہ خیال تھا کہ اس سے ان کی تحریک کو نقصان پہنچے گا۔

انگلستان جا کر وہاں کی لیڈیوں کی علمیت اور کارکردگی سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کا اظہار کرتے ہیں کہ ان خواتین کو جب ہندوستان کی عورتوں کی جہالت کا علم ہوتا ہے تو وہ بہت تعجب کرتی ہیں۔ پھر مولوی ممتاز علی کو لکھتے ہیں "عورت کی تعلیم قبلِ مہذّب مردوں کے ہونے کے نہایت ناموزوں اور عورتوں کے آفتِ درماں ہے۔ یہی باعث ہے کہ میں نے عورتوں کی تعلیم کے لیے کچھ نہیں کیا۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں "امریکہ یورپ کی حالتِ معاشرت کے خیال سے شاید وہ علوم لڑکیوں کے لیے ضروری ہوں۔ وہاں عورتیں پوسٹ ماسٹر اور ٹیلی گراف ماسٹر یا پارلیمنٹ کی ممبر ہوں ہندوستان میں یہ زمانہ سینکڑوں برس بعد آنے والا نہیں"۔

سرسید عورتوں کی تعلیم کے خلاف تھے۔ عورتوں کے لیے ان کے ذہن میں جدید تہذیب اور بدلتی ہوئی دنیا کا کوئی نقشہ نہیں تھا۔ جب لوگ ان سے اس سلسلے میں کہتے تھے تو وہ اس کے مختلف اسباب بتا دیتے تھے۔ بقول حالی، سرسید ایک ایسے ہیرو تھے کہ جن کا راگ صدیوں تک گایا جائے گا، یہ مان لینے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ عورتوں کی آزادی اور تعلیم کا مسئلہ ان کے دل کے قریب نہیں تھا۔ اس سے ان کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا ہے۔ اس لیے اس قسم کے بیانات دے کر حقائق مسخ کرنے کی ضرورت نہیں" مسلمانوں میں سرسید وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے عورتوں کے استحصال کے خلاف آواز اٹھائی اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ انہیں اپنی ماں سے بے پناہ محبت اور عقیدت تھی جس کا اعتراف ''سیرتِ فریدہ'' میں انہوں نے کیا ہے۔ ماں کی محبت اور عقیدت تو سبھی کو ہوتی ہے، علّامہ اقبال نے بھی ''مادر مرحومہ'' کو کیا زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، مگر عورت کے لیے وہ آزادی زمرّد کا گلوبند ہی پسند کرتے تھے۔ انہوں نے تو ان مردوں کو زن قرار دیا جو عورتوں کے پردوں کے خلاف تھے اور پھر یہ اشعار

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
قوم نے ڈھونڈھ لی فلاح کی راہ
یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

یہ اشعار اکبر الہ آبادی سے منسوب کر پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالوں میں کوڈ کیے جاتے ہیں۔ نقاد اپنی تقریروں میں کوڈ کرتے ہیں اور جب ہم جیسے کم سواد طالب علم دبی زبان سے اس کا احساس دلاتے ہیں تو خفا ہو جاتے ہیں۔

ہے یوں کہ سرسید کے ہم عصروں میں بہت سے لوگ تعلیم نسواں کے حامی تھے۔ مولوی نذیر احمد کسی حد تک شبلی، مولوی ذکاء اللہ، عبدالحلیم شرر مگر ان میں سب سے اہم نام خواجہ الطاف حسین حالی کا ہے۔ ''لاہور میں ایک عورتوں کی تعلیم کے لیے قصّے کے پیرایے

میں موسوم بہ مجلس النساء لکھی تھی ۔ جو اودھ اور پنجاب کے مدرسوں میں مدت تک جاری رہی۔'' اس کتاب میں حالی انگریز قوم کے مہذب ہونے کی وجہ یہ بتاتے ہیں ''وہاں لڑکیوں کو پڑھانے کا دستور قدیم سے چلا آتا ہے۔ وہی لڑکیاں جب صاحب اولاد ہوتیں تو انہوں نے اپنی اولاد کو تعلیم دینا شروع کیا، یہی بات تو ہے کہ مرد اور عورت ایک سانچے میں ڈھلے ہیں، بغیر ماں کی تعلیم کے کسی کو تعلیم نہیں آتی ہے''۔ یہی نہیں وہ صاف صاف لفظوں میں کہتے ہیں ''ساری قوم سے میری یہ عرض لڑکیوں کی تعلیم میں کوشش کریں اور خدائے تعالیٰ نے جو جوہر قابل انہیں دیا ہے، اس کو خاک میں نہ ملائیں۔''

بات یہ ہے کہ حالی نے اپنا دل دیرینہ پیر سال کو ضرور دے دیا تھا اور وہ جو قومی بھلائی کے کام کر رہا تھا، اس میں وہ دل و جان سے شریک تھے، مگر اس کے ہر خیال سے وہ متفق نہیں تھے، اسی میں ایک مسئلہ عورتوں کی تعلیم کا بھی تھا۔ ان میں قائدانہ صلاحیتیں نہیں تھیں کہ وہ سرسید سے الگ ہو کر کوئی تحریک چلاتے، انہوں نے یہ طے کیا کہ وہ اپنے خیالات کی اشاعت اپنے طور پر نظم و نثر تحریر و تقریر میں کریں گے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی عملی زندگی میں لوگوں کو کر کے دکھائیں گے۔

انہوں نے ایک مضمون لکھا ہماری معاشرت کی اصلاح کیسے ہو سکتی ہے۔ ہمارا معاشرہ اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک ہماری عورتوں کی تعلیم نہیں ہوگی۔ سماج سے غلط رسوم کا خاتمہ نہیں ہو سکتا ہے۔ جب تک عورتیں تعیم یافتہ نہ ہوں، وہ خود ان کو غلط نہ سمجھیں ان کی اور دلچسپیاں نہ ہوں۔ انہوں نے ''چپ کی داد'' نظم لکھی جو دراصل عورت نامہ ہے۔ اس میں عورت کی عظمت و اہمیت کا احساس لوگوں کو دلایا اور ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کیا

اے ماؤ، بہنو، بیٹیوں، دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تم ہی قوموں کی عزت تم سے ہے

نیکی کی تم تصویر ہو عفت کی تم تدبیر ہو

ہو دین کی تم پاسباں ایماں سلامت تم سے ہے

فطرت تمہاری ہے حیا طینت میں ہے مہر و وفا

گھٹی میں ہے صبر و رضا انساں عبارت تم سے ہے

عورتوں کوظلم وستم برداشت کرنے کی داد یوں دیتے ہیں

کی تم نے اس دارالمحن میں جس تحمل سے گذر

زیبا ہے گر کہیے تمہیں فخر نوع بشر

--

دنیا کے دانا اور حکیم اس خوف سے لرزاں تھے سب

تم پر مبادا علم کی پڑ جائے نہ پرچھائیں کہیں

ان اشعار کو دیکھیے اوران کے بارے میں ایک جدید نقاد کی رائے ''مرد کی انا و مفادات کے تحفظ اور بالادستی کو برقرار رکھنے کی کوشش میں عورت کے تئیں یہ حکم صادر فرمایا کہ

اے ماؤ بہنو بیٹیو دنیا کی زینت تم سے ہے۔

فاطمہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے۔

حالؔی نے ''بیوہ کی مناجات'' کے دیباچہ میں اس وقت ہندوستان میں بیواؤں کی جو تعداد تھی اس کے اعداد و شمار خوف ناک حد تک زیادہ ہیں، جن میں بہت سی بال ودھوا بھی تھیں۔ وہ جن حالات میں زندگی گذار رہی تھیں اس کا بیان اس طرح حالی نے کیا ہے کہ کوئی درد مند بغیر چشم پرنم کے اسے پڑھ نہیں سکتا۔ اس میں انہوں نے بیواؤں کی جنسی محرومی کا ذکر بھی صاف صاف کیا ہے

دولھا نے جانا نہ دلہن کو دلہن نے پہچانا نہ سجن کو

دل نہ طبیعت شوق نہ چاہت مفت لگائی بیاہ کی تہمت
شرط سے پہلے بازی ہاری بیاہ ہوا اور رہی کنواری
سیلانی جب باغ میں آئے پھول ابھی کھلنے نہ پائے
پھول کھلے جس وقت چمن میں جائے سوئے سیلانی بن میں
ہوش سے پہلے ہوئی میں بیوہ کب پہنچے گا پار یہ کھیوا

حالیؔ کے بارے میں ناقدین کی یہ رائے ہے کہ مہدی افادی نے حالیؔ کے متعلق کہا ہے کہ ''وہ چھوٹے کپڑوں سے ڈرتے تھے'' اس میں اتنا اضافہ اور کر لینا چاہیے کہ وہ رنگین کپڑوں سے بھی ڈرتے تھے'' جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے!

حالیؔ عورتوں مردوں کی مساوات کے دل سے قائل تھے اور اپنے زمانے کے لحاظ سے ترقی پسند نظریہ رکھتے تھے۔ انہوں نے لڑکیوں کی کم عمری کی شادی، ان کی نسبت کرتے وقت صرف حسب نسب کا خیال رکھنے کی مخالفت کی۔ انہوں نے لڑکی کی مرضی شادی کے لیے ضروری قرار دی۔

اپنے ایک مضمون ''قرونِ اولیٰ میں مسلمان عورتوں کی حق گوئی'' کے عنوان سے لکھا اور اس میں یہ بتایا کہ

عورتیں جنگ کے معرکوں میں شریک ہوتی تھیں
اپنے جتھوں کا ساتھ دیتی تھیں
فصیح و بلیغ خطبات دیتی تھیں، شاعری کرتی تھیں
خلیفہ کے دربار میں بے حجابانہ حاضر ہو کر سوال و جواب کرتی تھیں۔

۱۹۰۵ء میں حالیؔ حیدر آباد گئے تو صغرا ہمایوں مرزا نے اپنی تصنیف ''مشیر نسواں'' کا مسودہ دکھایا جس کا موضوع عورتوں کی تعلیم اور آزادی تھا۔ حالی نے کتاب کی تعریف لکھتے ہوئے کہا ''صدیاں گذر گئیں کہ مستورات عموماً علومِ دینی و دینوی سے محروم چلی آتی

ہیں۔ان سے کسی تصنیف وتالیف کا ظہور میں آنا ایسا مستبعد معلوم ہوتا تھا کہ شاید کسی کے دل میں یہ خیال بھی نہ گذرتا ہوگا مگر خدا کا شکر ہے کہ کچھ مدت سے زمانے نے کروٹ بدلی ہے اور مسلمان شریف زادیوں میں (بغیر اس کے ان کی تعلیم وتربیت کا کوئی معقول انتظام قوم نے کیا ہو) علم کا شوق بتدریج ترقی کرتا جاتا ہے۔وہ اب گھر بیٹھے اپنی تعلیمی ضرورتیں پوری کرنے لگی ہیں۔"

یہی نہیں حالی نے ۱۸۹۴ء میں پانی پت میں لڑکیوں کا اسکول کھولا جو چند سال بعد بند کرنا پڑا کہ مسلمان استانیاں پڑھانے کو نہیں ملیں اور عیسائی استانیاں رکھی جاتیں تو مسلمان وہاں اپنی لڑکیوں کو نہ بھیجتے۔

رواج کے خلاف انہوں نے اپنی پوتی مشتاق فاطمہ کو لکھنا سکھایا۔ان کے خاندان کی عورتیں صاحب جائیداد ہوتی تھیں اور صاحب رائے بھی۔وہ مولانا حالی کے کلام سے اپنی گفتگو میں مثالیں دیتی تھیں ان کی شاعری کے بعض موضوعات سے اتفاق اور بعض سے نااتفاقی رکھتی تھیں اور ان میں آپس میں بحث ہوتی تھی مثلاً کچھ خواتین کا خیال تھا کہ انکی وہ نظمیں جو نچلے طبقے کی حمایت میں ہیں، ان سے غلط اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ان میں سے بعض یہ دلائل دے کر ان کو قائل کرتی تھیں یہ اسلام کی رو سے بھی جائز ہے اور زمانے کے لحاظ سے بھی۔

سرسید نے سچ کہا تھا کہ مرد جب تعلیم پالیں گے تو وہ عورتوں کی تعلیم کا خود انتظام کرلیں گے۔ان ہی کے کالج کے پڑھے ہوئے طالب علموں نے تحریک نسواں کو تقویت دی، چاہے خواجہ غلام الثقلین ہوں یا سجاد حیدر یا شیخ محمد عبداللہ۔مگر مسلمانوں میں تحریک نسواں کی ابتدا کرنے والے خواجہ الطاف حسین حالی تھے۔

علی احمد فاطمی

حالؔی کی معنویت

اُردو شعر و ادب میں حالؔی کی معنویت اور قدر و قیمت کے معاملات عجیب و غریب ہیں اور ایک حالؔی پر کیا محمول، اردو کے جس مفکر و دانشور نے فکر انگیز، انقلاب آمیز اور ہنگامہ کُن قسم کے کام کیے اور کہنہ روایات سے منحرف ہو کر اپنے بیان و کلام کو عام کیا، عام طور پر یہی ہوا ہے کہ اردو کے مہذّب اور معیار پرست سماج نے اس کا استقبال سنجیدگی اور فکر انگیزی کے ساتھ کم مضحکہ خیزی سے زیادہ کیا۔ اس کی بھی اپنی ایک تاریخ ہے، روایت ہے کہ جس نے بھی قدیم مذاقِ سخن اور معیارِ سخن میں تبدیلی لانی چاہی، مقصدیت و افادیت کی باتیں کرنی چاہیں، جذبات کے مقابلے عقل کو ترجیح دی، خواص کے مقابلے عوام کو اہمیت دینی چاہی، شرفائے ادب کے ایک خاص گروہ کی طرف سے اسے کہیں آڑی ترچھی اور کہیں غضبناک نگاہوں سے دیکھا گیا۔ لعن طعن کیا گیا اور اگر اتفاق سے بغاوت کرنے والا تخلیق کار اور شاعر ہے، تو اس پر کچھ زیادہ ہی بارشِ سنگ ملامت ہوئی اور خرد کے پتھراؤ ہوئے۔ ایسے قابلِ مذمّت لیکن ادب کی تاریخ میں جرأت مند اور پختہ ارادہ و عمل کے فنکاروں اور دانشوروں کی فہرست تیار کی جائے تو خواجہ الطاف حسین حالؔی اس میں ایک اہم نام ہوں

گے۔ تاریخ ادب نے ہمیشہ ایسے بانکے، حوصلہ منداور بے باک ادبا و شعرا کو ہی اپنے دامن میں جگہ دی اور مخالفین و معترضین کو وقت کی گرد میں دبا دیا۔

حالؔی کے تعلق سے ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ وہ اپنی تمام تر روایتی، مذہبی اور مشرقی تعلیم و تربیت سے آراستہ ہونے کے باوجود، حالؔی روایت اور قدامت کے خلاف کیوں کر ہوئے؟ علم و عمل کے پُر خطر راستے پر کیوں چلے؟ مخالفت اور ملامت کا نشانہ کیوں بنے؟ کیا اس کے پس پردہ اس عہد کے مطالبات کا زور اور دخل تھا اور یقیناً دخل تھا تو سوال یہ ہے کہ اس عہد میں حالؔی، سرسید، آزاد وغیرہ کے علاوہ اور بھی تو شاعر اور ادیب تھے لیکن تاریخ نے ان کو وہ حیثیت نہ دی جو ان ادیبوں و شاعروں کو نصیب میں آئی۔ اس میں تھوڑی سی افتادِ طبع کو بھی دخل ہے اور شاید ان کے گھریلو حالات اور ماحول کا بھی۔ آخر کوئی تو بات ہے کہ ایک سترہ سال کا نوجوان اپنی نوخیز بیوی کو چھوڑ کر، محلہ انصار سے نکل کر پانی پت کی ان پتھریلی سڑکوں پر روانہ ہو جاتا ہے جو دہلی کو جاتی ہے۔ نہ سواری نہ مال وزر، پچاس پچپن میل کا سفر۔ لہولہان حالی اور لہولہان دہلی۔ نہ کوئی یار و مددگار، بس آزار ہی آزار، ایک مدرسے میں داخل ہوئے اور اس کے صحن میں اینٹوں کا تکیہ لگا کر سوئے۔ مولانا حسین بخش نے سہارا دیا، تو علم کا دریا بہا دیا۔ شعر و سخن اور علم و ادب کا ذوق شیفتہ اور غالبؔ تک لے گیا اور غالب کی زبان سے وہ مشہور فقرہ نکلا۔ ''تم شعر نہ کہو گے تو اپنے پر ظلم کرو گے۔'' واپس پھر پانی پت آئے تو مذہب، منطق، فلسفہ، ادب وغیرہ میں ڈوب گئے۔ غدر کے ہنگامے نے ایک بار حالؔی اور دہلی کو ویران کر دیا لیکن غالب سے ملاقاتوں کا سلسلہ پھر سے شروع ہوا اور پھر یہ شعر کہہ دیا

حالؔی سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں
شاگرد میرزؔا کا مقلّد ہوں میرؔ کا

اس شعر سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ حالؔی بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے اور ان

کی غزلیہ شاعری کے محرکات میں شیفتہ، غالب وغیرہ کی شاعری اور صحبت کا بڑا اور براہِ راست اثر تھا۔ کبھی کبھی خود شاعر کا بیان شاعر کے شعری سفر اور نقطۂ نظر کو سمجھنے میں رکاوٹیں پیدا کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کی ابتدائی غزلیہ شاعری کو لے کر یہ بات کسی حد تک درست ہو لیکن اہلِ علم وادب واقف ہیں کہ اردو ادب کی تاریخ میں حالی کو جو عزت وحیثیت حاصل ہوئی ہے وہ ان کی کتاب مقدمہ شعروشاعری، ان کی سوانح عمریاں، ان کے مقالات اور ان کی نظمیہ شاعری بالخصوص مسدس مدوجزر اسلام، مناجات بیوہ، چپ کی داد، حب وطن وغیرہ سے اس امر میں اختلاف کی گنجائش کم ہے کہ ان کی ادبی وتاریخی حیثیت کا اصل سبب ان کی تنقید نگاری اور نثر نگاری ہے تو پھر ایسے میں اس شعر کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔ ایک لمحے کے لیے ہم اس شعر کی صداقت مان بھی لیں تو یہ سچائی ان کی زندگی کے ان ابتدائی حصوں تک محدود ہوکر رہ جاتی ہے جہاں وہ قدیم وکلاسیکی ماحول میں سانس تو لے رہے ہیں لیکن اپنی مخصوص افتادطبع، دردمندی، انسان دوستی اور روشن خیالی کے تحت غیر معمولی جدوجہد کے دور سے گذرتے ہوئے اپنے ملک ومعاشرہ کے ماحول سے متاثر ہوتے ہیں اور ایک نئے احساس وشعور اور نئی پرواز کے لیے پرتول رہے ہوتے ہیں۔ حالی نے جس وقت آنکھیں کھولیں اور جو زمانہ پایا، خود حالی کی زبان میں ملاحظہ کیجئے

> ''قوم کی حالت تباہ ہے۔ عزیز ذلیل ہوگئے ہیں۔ شریف خاک میں مل گئے ہیں۔ علم کا خاتمہ ہوچکا۔ دین کا صرف نام باقی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جارہے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ رسم ورواج کی بیڑی ایک ایک پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ امرا جو قوم کو بہت فائدہ پہنچا سکتے ہیں، غافل اور بے پروا ہیں۔ علما جن کو قوم کی

اصلاح میں بڑا دخل ہے زمانہ کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے
ناواقف

(بحوالہ مضمون غلام السیدین)

اب ذرا خواجہ غلام السیدین کے یہ جملے بھی ملاحظہ کیجئے

کیا حالؔی کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ ملّتِ اسلامی کے اِس اُجڑے باغ کا نظارہ دیکھنے کے بعد گُل و بُلبُل کی شاعری میں نازک خیالیاں دکھاتے، "بے شک ایسے شعراء کرام بھی اس زمانے میں گذرے جن کے پاس آنکھیں تھیں لیکن انہوں نے دیکھا نہیں۔ کان تھے لیکن سنا نہیں۔ دل تھا لیکن کچھ محسوس نہیں کیا، قوم کا گھر جلتا رہا اور وہ روم کے شہنشاہ کی طرح بیٹھے بانسری بجایا کیے۔"

(محسنِ قوم۔ حالؔی)

یہی وجہ ہے کہ حالؔی کا حساس و سنجیدہ ذہن، تخلیقی مزاج غالبؔ اور شیفتہؔ کی علمی صحبتوں کے فیوض و اثرات قبول کرنے کے باوجود اُس وقت زیادہ متحرک اور سرگرم ہو جاتا ہے جب انہیں صحبتوں کی وساطت سے ۱۸۶۸ء میں ان کی ملاقات سر سیّد سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد اسی ابلتے ہوئے جذبات اور تبدیل ہوتے خیالات کو اس وقت مزید استحکام ملا جب وہ بغرض ملازمت لاہور پہنچے اور انجمن پنجاب اور محمد حسین آزادؔ کے قریب آئے۔ انجمن کے زیر اہتمام منعقدہ مناظموں میں شرکت کی۔ ہم سب واقف ہیں کہ حالؔی کی معرکہ آرا اور شہرت یافتہ نظمیں 'برکھا رُت، مناجات بیوہ، حب وطن' وغیرہ انجمن اور آزاد کی دین ہیں اور مسدس سر سیّد کی دین۔ اور یہیں سے شروع ہوتا ہے تاریخ کا ایک ایسا موڑ جو صرف حالؔی کی زندگی کا نہیں بلکہ پورے اردو شعر و ادب کا مقدر بدل دیتا ہے۔ لیکن یہ سب

کام یونہی تو نہیں ہوئے۔

حالؔی نے جس طرح کا علمی و مذہبی گھرانہ پایا تھا اور جس طرح کی پرورش ہوئی تھی، وہ خانقاہ بھی جا سکتے تھے اور ایک کاروباری مولوی بھی بن سکتے تھے یا دوسرے فائدے کا کھیل کھیل سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا اور ایک ایماندار اور سچے قلمکار اور فنکار کی حیثیت سے فرض اور نقصان کا راستہ اپنایا۔ زندگی بھر پریشان رہے۔ ٹھوکریں کھائیں لیکن اپنی سچائی، سادگی، ادب کے تئیں صحت منداور نیچرل نظریہ سے ذرا بھی نہیں بہکے۔ جلد ہی انہیں اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ ملک و ملّت کے جو مسائل ہیں انہیں غزل کی روایتی شاعری اور فرسودہ اندازِ فکر سے نہیں بدلا جا سکتا۔ انسان کے سیاسی اور سماجی مسائل کو انسانی سطح پر ہی حل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ذہن، اخلاق اور اطوار کو بدل کر ہی ماحول بدلا جا سکتا ہے۔ اسی لیے وہ انسان کی بنیادی خصوصیت حمیت کو جگانے میں مصروف ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ ان کاموں کے لیے اردو کی علامتی والہامی شاعری اور اس کا رومان پرور مزاج و مذاق ان کے ساتھ نہیں چل سکتا تھا۔ اسی لیے حالؔی، غالبؔ اور شیفتہؔ کی صحبتوں اور مروتوں کی وجہ سے اعتراف کریں یا نہ کریں لیکن ان کا ذہن لاشعوری طور پر کبیرؔ اور نظیرؔ کی شاعری سے اثر قبول رہا ہے۔ مجنوں گورکھپوری نے یونہی نہیں کہا تھا کہ اگر نظیرؔ کی آدمی نامہ، مفلسی جیسی نظمیں وجود میں نہ آئی ہوتیں تو برکھا رُت، مناجات بیوہ، جیسی نظموں کے آنے میں ابھی اور دیر لگ جاتی۔

حالؔی نے جہاں ایک طرف نظمیہ شاعری اور اس کی افادیت و مقصدیت پر زور دیا تو دوسری طرف روایتی اور غیر افادی شاعری کی مخالفت بھی کی، ظاہر ہے کہ اس مخالفت کی زد میں غزل کے ساتھ ساتھ مثنوی بھی آئی۔ جہاں وہ ایک طرف مسدّس، چپ کی داد جیسی نظمیں لکھ کر اردو شاعری میں ایک عوامی قسم کی تاریخ مرتب کر رہے تھے وہیں مقدمہ لکھ کر اردو شاعری کی تہذیب و تحریم کی دنیا میں طوفان بھی کھڑا کر رہے تھے، جو اردو کے نام نہاد و

معیار پرست طبقہ کو پسند نہیں آرہا تھا چنانچہ جہاں ایک طرف حالی کو غیر معمولی عوامی مقبولیت حاصل ہورہی تھی وہیں خواص کے بعض طبقے سے مخالفت کے دریا بہہ نکلے۔ بالخصوص لکھنؤ سے اس لیے کہ لکھنؤ اسکول کی ایک مخصوص تہذیب اور فکر، تاریخ ادب میں جس قدر مقبول ہے اسی قدر غیر مقبول اور بدنام بھی۔ ایسے نزاعی معاملات میں اودھ پنچ ہمیشہ پیش پیش رہا، جہاں ایک طرف اُس نے سرسیّد کا مذاق اڑایا وہیں حالؔی کو بھی نہیں بخشا۔ یہ شعر لکھنؤ کے بطن سے ہی پھوٹا

ابتر ہمارے حملوں سے حالؔی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

اور یہ شعر بھی دیکھیے

خزاں کے دور کے مانند دورِ حالؔی ہے
سمجھ لو بُلبُل و گُل سے یہ باغ خالی ہے

اسی سرزمین پر برج نرائن چکبستؔ جیسا وطن پرست شاعر بھی ہوا جس میں لکھنوی عناصر ذرا کم کم تھے لیکن حالؔی اپنے مقدمہ میں جہاں مثنوی کی مخالفت کرتے ہیں تو اس مخالفت کی زد میں پنڈت دیاشنکر نسیم بھی آتے ہیں تو ان کے اندر کا برہمن جاگ پڑتا ہے اور اپنے پیش رو برہمن شاعر کی ہتک برداشت نہ کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں نہایت ڈرامائی انداز میں حالؔی اور نسیم کی تکرار دکھاتے ہیں اور نسیم، حالؔی سے یہاں تک کہہ دیتے ہیں

"گستاخی معاف، آپ شاعری کا دم بھرتے ہیں مگر آپ اصول شاعری سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ آپ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعری اور نثر میں کچھ فرق نہیں۔ حالانکہ کئی اعتبار سے دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ہمارے حالؔی صاحب تو نظم و نثر میں سوائے ردیف اور قافیہ کی

پابندی کے کوئی فرق ہی نہیں سمجھتے۔ آپ تو انگریزی کے
ترجمے پڑھتے ہیں۔" اور چونکہ غیر زبان میں ترجمہ ہونے
سے ان نظموں کی نازک خیالی اور بلند پروازی کے جوہر
تشریف لے جاتے ہیں لہٰذا آپ سمجھتے ہیں کہ مغربی شاعری
ویسی ہی ہے جیسا کہ آپ سمجھتے ہیں۔ آپ کے نزدیک تو نظم
کرنا اور شعر کہنا ایک ہی چیز ہے۔"

ظاہر ہے کہ نسیم کی آواز میں چکبست بول رہے ہیں۔ یہ تحریریں چکبستؔ کے ایک کمیاب مضمون حالیؔ کا ہوا سے لڑنا سے مستعار ہیں یہ مضمون بھی ۱۹۰۳ء میں اودھ پنچ میں شائع ہوا۔ لیکن یہی چکبست ۱۹۱۸ء میں صبح امید میں اردو شاعری کے عنوان سے مضمون لکھتے ہیں تو صاف اعتراف کرتے ہیں

"اردو زبان پر مولانا حالیؔ کا جو احسان ہے اس کی یاد دلوں
میں ہمیشہ تازی رہے گی۔ مولانا مرحوم پہلے شخص ہیں جنہوں
نے یہ آواز بلند کی کہ زمانے کے ساتھ اردو شاعری کو بھی نیا
لباس بدلنا چاہئے اور یہ معمولی بات نہ تھی۔"

یہ مضمون مضامین چکبست میں شامل ہے۔ اس سلسلے میں ۱۹۲۵ء میں مسعود حسین رضوی ادیب نے ایک قدم اٹھایا اور حالیؔ کے خلاف پوری ایک کتاب بعنوان "ہماری شاعری" لکھ ڈالی جس کے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں

"انگریزی کی مزاولت اور اردو سے غفلت نے ہم کو اردو
شاعری کے صحیح مذاق سے بیگانہ کردیا ہے جذبات کی
افسردگی، طبیعت کی دورنگی، یورپ کی فضیلت کا اعتماد
اور مذاق سخن کی نادرستی ان سب کے مجموعی اثر نے شعر کے

حسن پر غلط فہمیوں کا پردہ ڈال دیا ہے اور اردو شاعری کو
بالخصوص ہماری نگاہوں میں سبک کر دیا ہے تعلیم یافتہ
طبقے میں قدیم طرز کی اردو شاعری کی حقارت اور اس سے
تنفر روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ اس کے خاص سبب تو وہی
ہیں جو اوپر بیان ہو چکے یعنی ہماری پوری یورپ زدگی اور
اپنی زبان وادب سے ناواقفیت۔ ان کے علاوہ ایک چیز اور
بھی ہے جس نے تعلیم یافتہ طبقے میں اردو شاعری سے بدظنی
پھیلادی ہے اور وہ شعر و شاعری یعنی خواجہ حالؔی کا دیوان۔
اس کی تالیف کا خالص مقصد یہ ہے کہ اردو شاعری کے
نقائص دکھائے جائیں اور ان کی اصلاح کی تدبیریں بتائی
جائیں۔ فاضل مولف نے اپنے مقصد کو پیش نظر رکھ کر اردو
شاعری کے اس حصے کو نمایاں کیا ہے جو ان کی اصلاح کا
محتاج تھا اور اس حصّے میں عمداً چشم پوشی کی ہے جو انکے
نزدیک اصلاح سے مستغنی اور تعریف کا مستحق تھا۔"

یہ کتاب صرف اعتراض نامہ ہوتی تو بھی غنیمت تھا لیکن وہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ہماری شاعری، شعر و شاعری، کا جواب نہیں تتمہ ہے۔ آگے چل کر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کتاب کا ایک حصہ انہوں نے ۲۵ مارچ ۱۹۲۵ء میں انجمن اردو لکھنؤ کے ایک عام ادبی جلسے میں پڑھ کر سنایا جس میں عبدالحلیم شررؔ، عبدالماجد دریا آبادی جیسے بزرگ اور ممتاز ادیب شریک جلسہ تھے۔ لیکن وہ نہیں لکھتے کہ اس کو پڑھنے کے بعد ان بزرگ ادیبوں بالخصوص شررؔ جیسے روشن خیال مفکر کا کیا ردِ عمل رہا۔ کتاب کے بقیہ حصے بھی دو ایک برسوں میں شائع ہوئے اور ایک نئی طرح کی بحث اس کتاب کو لے کر چل پڑی۔ یہاں اس کتاب کا تجزیہ

مقصود نہیں تاہم یہ ضرور ہے کہ مسعود صاحب نے جس طرح پوری کتاب میں ترتیب وار ابواب میں حالی کے خیالات کے جوابات دیئے ہیں، عقل کے مقابلے جذبات، فکر کے مقابلے تخیل کو اہمیت دی ہے ان پر اب بحث کرنا بھی فضول ہے اس لیے کہ دبستانِ لکھنؤ کا شعری مزاج و مذاق اور مسعود صاحب کا معیارِ نقد یہ سب کل بھی غور طلب تھا اور کسی حد تک آج بھی ہے، مستقبل ان پر غور کرے گا کہا نہیں جاسکتا اس لیے کہ شاعری کی عالمیت و آفاقیت کے پیش نظر ان بحثوں پر پڑتی ہوئی گرد اور رد ہوتا ہوا سبک خیال فکر کو کم مضحکہ کو ضرور ظاہر کرتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری نے ادب اور مقصد کے خطبہ میں ایک بات بڑے پتے کی کہی ہے۔ ''ادب کیا ہے اور شاعری کسے کہتے ہیں۔ اب جبکہ ہم ایلیٹ، مہابھارت سے لے کر شاہنامہ، سکندر نامہ، ڈیوائن کمیڈی پیرڈائز لاسٹ کے دور سے گزر چکے ہیں یہ سوال کچھ مضحکہ خیز سا لگتا ہے اور سوال کرنے والے کی منطق کی نہیں بلکہ اس ذہنیت کی دلیل ہے جس کو کارلائل نے منطق تراشی (logic chopping) کہا ہے اور جس کے لیے عام فہم محاورہ بال کی کھال نکالنا ہے'' اور آگے وہ کہتے ہیں ''لے ادب لے ادب کی ہانک لگانے کا نام ادب نہیں ہے''۔ من قاش فروش دل صد پارۂ خویشم۔'' کا نعرہ لگا کر ہم زیادہ عرصے تک گاہکوں کو دھوکہ نہیں دے سکتے اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو ہمارے تربوز کے ٹکڑوں کو بھی کوئی نہیں پوچھے گا''۔

حالی کے افکار و خیالات کو لے کر کل بھی مخالفت تھی اور کسی حد تک آج بھی ہے اگر ایک طرف جدید رویوں اور ادیبوں نے انہیں آج بھی نہیں بخشا ہے (ملاحظہ کیجیے فاروقی، شمیم حنفی، سلیم احمد وغیرہ کی تحریریں) جس کا جواب بعض ترقی پسند ادیبوں نے بالعموم اور وارث علوی نے بالخصوص اپنی کتاب حالی۔ مقدمہ اور ہم، میں اپنے مخصوص انداز میں دیا ہے۔ تو دوسری طرف بعض بزرگ، قدیم مزاج کے محققین آج بھی ان کو ناپسند زیادہ کرتے ہیں۔ ۱۹۸۷ء میں دیوان حالی کو مرتب کرتے وقت ممتاز محقق رشید حسن خاں اپنے

مقدمہ میں لکھتے ہیں

> ''حالی مصلح قوم بن سکتے تھے اور واعظِ قوم ہو سکتے تھے اور ہوئے مگر ایسا مجتہد یا مجدّد بننا ان کے قابو سے باہر کی بات تھی کہ ایک صنف کے مزاج، انداز، اس کی اندرونی فضا اور اس کے ٹھاٹھ کو آسانی سے بدل دیں اور اس میں ایسے مضامین شامل کرنا چاہیں جو کتنے مفید کیوں مگر غزل کو اپنے موضوعات کے مقابلے بالکل بے رنگ بلکہ بدرنگ نظر آئیں۔ اتنی بڑی روایت کو اس قدر ہلکے پھلکے عناصر بدل ہی نہیں سکتے تھے۔''

رشید حسن خاں اردو کے قابلِ احترام محقق ہیں لیکن صرف محقق، جب جب انہوں نے تنقید کے شعبہ میں قدم رکھا تنقیص سے زیادہ کام لیا۔ جوش، فیض، فراق وغیرہ پر ان کے مضامین گواہ ہیں۔ اوپر کے اقتباس میں دو الفاظ پر غور فرمایئے ''ٹھاٹھ'' اور ''ہلکے پھلکے عناصر''۔ وہ غزل کی انسانی و اخلاقی روایت کو ٹھاٹھ کے حوالے سے زیادہ دیکھتے ہیں اس ٹھاٹھ میں ان کی فکری تہذیب بول رہی ہے اور انیسویں صدی کے غیر معمولی نشاۃ الثانیہ کو وہ ہلکے پھلکے عناصر قرار دیتے ہیں جس نے پوری اردو دنیا ہی نہیں ملک و ملّت کی تاریخ بدل کر رکھ دی۔ دراصل مسئلہ صرف رشید حسن خاں یا مسعود حسن رضوی کا نہیں اور نہ ہی شاہ جہاں پور اور لکھنؤ کا ہے بلکہ پوری اُس روایت پرست تہذیب اور ایک مخصوص و مجہول نظامِ فکر کا ہے جو ہمیشہ سے انسان کی اصل حقیقت، شعر و ادب کی صداقت، ارضیت اور مقامی ثقافت سے منہ چراتا رہا ہے۔ معاشرتی حقائق سے رشتہ منقطع کر کے اسے ایک مخصوص ذوق و شوق بلکہ عیش وَ ہوس سے وابستہ کر کے اسے محدود و مجہول کر دینا ہی اس کا مقصود رہا ہے۔ میں یہاں ان تمام اعتراضات کا تفصیل سے جواب نہیں دے سکتا اور نہ ہی ترقی پسند افراد و

افکار کی مثالیں دوں گا بلکہ میں تو یہاں جملہ معترضہ کے طور پر کہتا چلوں کہ خود ترقی پسند مفکرین نے بھی حالی پر کم سے کم لکھا تھا شاید اس لیے کہ وہ شعوری یا لاشعوری طور پر اپنے آپ کو حالی سے الگ نہ سمجھتے تھے اور اپنی فکر کو حالی کی فکر کی توسیع و ترقی سمجھتے تھے۔ ایک ملاقات میں ممتاز ترقی پسند شاعر و مفکر علی سردار جعفری نے راقم الحروف سے فرمایا تھا کہ یہ کہنا کہ ادب کو پورے طور پر ترقی پسند فکر ہم نے دی غلط ہے۔ ہم نے ترقی پسند فکر کو ایک پلیٹ فارم دیا۔ کچھ نئی تعریفیں دی لیکن اردو میں پختہ طور پر ترقی پسند فکر تو غالب اور حالی ہی سے شروع ہو چکی تھی ہم نے تو اپنے آپ کو سر بلند و سرخرو اس طرح سمجھا جیسے باپ کے کندھے پر بیٹھ کر بیٹا اپنے آپ کو باپ سے زیادہ بلند و بالا سمجھنے لگتا ہے۔ اسی مزاج کا ایک واقعہ اور یاد آتا ہے۔ ایک بار میں نے فراق صاحب سے پوچھا تھا کہ آپ کو تو میر کا مقلد اور پیرو کار سمجھا جاتا ہے آپ خود کہتے ہیں۔ ''ان غزلوں کے پردے میں تو میر کی غزلیں بولے ہیں۔'' پھر آپ کے تنقیدی مضامین میں میر پر ایک بھی مضمون نہیں ملتا۔ اقبال اور انیس پر بھی ایک مضمون نہیں ہے، غالب پر ایک مضمون ہے لیکن سرسری اور معمولی۔ اس کے برعکس مصحفی، ذوق، حالی جیسے شعرا پر آپ نے طویل اور عمدہ مضامین لکھے ہیں۔ اس کی کیا وجہ؟ جواب ملا

> ''کسی بھی آفاقی شاعر پر مضمون لکھنا مشکل تو ہے لیکن ایک معنی میں آسان بھی کیونکہ آفاقی شاعری کی اپنی کچھ مخصوص قدریں ہوتی ہیں جو تمام آفاقی شعرا میں مشترکہ طور پر پائی جاتی ہیں، اگر آپ کو اپنے ملک و معاشرہ کی ثقافت اور ارضیت تلاش کرنی ہے تو ان کے بعد کے شعرا کو پڑھیے اور ان میں جھانکیے۔ مصحفی، ذوق اور حالی کو میں نے اسی لیے پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کی بلکہ اور آگے بڑھ کر جلیل

مانکپوری، آسی غازی پوری جیسے شعرا کو بھی پڑھا۔ ذوق اور
حالی پر تو میں نے دو دو مضامین لکھے جو ایک کتاب کی
حیثیت رکھتے ہیں۔"

حالی پر فراق نے دو مضامین لکھے ہیں جو تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہیں اور یہ ایک ایسے شاعر و دانشور کے قلم سے نکلے ہیں جو انگریزی، ہندی، سنسکرت غرضکہ پوری ہندوستانی تہذیب کے ساتھ ساتھ غزلیہ تہذیب میں بھی رچا بسا نظر آتا ہے، اسے پورے طور پر ترقی پسند کہا جا سکتا ہے اور نہ دہلی، لکھنؤ دبستان کا نمائندہ، حالی کی شاعری سے متعلق اور ان کی سادگی اور نیچرل نظریہ کے تعلق سے فراق جیسے بڑے شاعر اور دانشور کی چند مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں

"جو لوگ حالی کی شاعری کو خاطر میں نہیں لاتے، کیا انہوں نے اپنے سے کبھی یہ سوال کیا ہے کہ غالب کی نظروں میں حالی کی شاعری کیا چیز تھی، حالانکہ روایتی اور عقیدتی شاگردی اور ہر طرح کی ہم نشینی اور ہم آہنگی کے باوجود حالی کی قدیم غزلوں پر پرچھائیں تک نہیں پڑی ہے۔"

"حالی کی غزلوں اور نظموں کے متفرق اشعار الگ الگ چھل بل نہیں دکھاتے ان کا اثر تدریجی طور پر آہستہ آہستہ ہوتا ہے۔ میں نے خود جب حالی کی نظم چپ کی داد کا مطلع دیکھا

'اے ماؤ بہنو بیٹیو دنیا کی عزت تم سے ہے'

"میں نے کہا یہ کیا شاعری ہے کہیں ماؤ، بہنو، بیٹیو پر شعر لکھا جاتا ہے لیکن روکھا سوکھا آغاز، نظم میں رفتہ رفتہ

نشتریت میں بدلنے لگا اور بادلِ نخواستہ بالکل نیم شعوری
طور پر مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ نظم ایک کارنامہ ہے جس میں
شعریت کی دیوی کل سنگھار اُتار کر اپنے بھولے بھالے
حسن کا وہ کرشمہ دکھا رہی ہے جس سے متاثر ہو کر وجدان
بچوں اور فرشتوں کی معصومیت حاصل کر لیتا ہے۔"

"اردو شاعری میں تین سو برس کے اندر عورت پر کئی نظمیں
کہی گئی ہیں لیکن حالی کی اس نظم کے مقابلے میں ان کا حال
یہ ہے کہ سو تکلف اور اس کی سیدھی بات" لیکن افسوس ہے
کہ حالی کی حقیقت کو لوگ اُس زمانے میں سمجھے ہی نہیں "

سوال یہ ہے کہ حالی کی حقیقت اور اس کی معنویت کو لوگ کیوں نہیں سمجھ سکے یا سمجھنا چاہتے ہی نہ تھے۔ کچھ تو نہ سمجھنے کے عمل میں ارادہ، شعور یا فرار کا دخل تھا جس کے پیچھے ایک زوال پذیر احساس کام کر رہا تھا جس نے صرف زندگی کا ہی نہیں شعر و ادب کا بھی اپنا ایک معیار و میزان بنا رکھا تھا جہاں شعریت، مسرّت، مجہولیت، فراریت سب باہم شیر و شکر ہو چکے تھے۔ جہاں شعری نقطۂ نظر کا اظہار یوں ہو رہا تھا

شاعری کیا ہے دلی جذبات کا اظہار ہے
دل اگر بیکار ہے تو شاعری بیکار ہے
صفی

جہاں نثر میں یہ کہا جا رہا ہو کہ۔"جذبات جب لفظوں کا لباس پہن لیتے ہیں تو شعر کہلاتے ہیں۔" ظاہر ہے ایسے میں حالی کی سادگی، جوش اور اصلیت کی باتیں، مقصدیت اور افادیت کی بحثیں خشک اور بے کیف تو لگنی ہی تھیں۔ ان باتوں کو بھی فراق صاحب نے یوں

سمیٹا ہے

لوگوں نے حالی کی سادگی کو کبھی خشکی اور کبھی بے کیفی اور بے رنگی سمجھا، اس کا سبب یہ تھا کہ لوگ شعروادب کو یا تو گدی گدی پیدا کرنے والی چیز سمجھتے تھے جس میں کچھ رنگ رلیاں ہوں یا پھر آسمانوں سے پر اڑا لے جانے والی چیز سمجھتے رہے۔ معمولات سے آئے دن کی باتوں سے ادب کا ہم کوئی تعلق نہیں سمجھتے تھے۔ حالی کے اعتدال نے ان کے وجدان میں واقعیت کے عنصر نے ان کی سلامت روی اور میانہ روی نے اور بقول مجنوں ان کے ماتھے پر بغیر بل ڈالے بات کہنے کے انداز نے مانوس باتوں کو مانوس الفاظ میں کہنے کی ادا نے ہمارے لیے غیر مانوس بنا دیا تھا۔"

اور آخر میں فراق کے یہ جملے دیکھیے اور سر دُھنیے

حقیقی ادب ادبیت سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ زندگی اور آدمیت سے پیدا ہوتا ہے۔ زمانہ تیزی سے بدل رہا ہے۔ اقبال کی شاعری کا نظریہ کل کی چیز معلوم ہونے لگا۔ اکبر الہ آبادی کا پیغام کل بھی معمہ تھا اب تو اور بھی معمہ ہو چلا ہے۔ چکبست کی قومی شاعری بھی کمھلا چکی ہے۔ شاید اس دور کی انقلابی شاعری مزدور اور سرمایہ داری کی شاعری بھی بہت حد تک بدل چکی ہے لیکن حالی ایک مخصوص ملت کے افراد کو مخاطب کرتا ہوا ازلی وابدی انسانیت کا ثبوت دے گیا۔ عورت پر جس نظریہ سے اکبر، اقبال اور دوسروں نے نظمیں کہی

ہیں اس سے حالی کا نظریہ کہیں زیادہ پاکیزہ ہے۔ چپ کی
داد میں جو نظریہ ہے وہ ابھی بھی بیکار نہیں ہوا ہے۔ جب دنیا
بدل چکی ہوگی تو بھی حالی کے بارے میں یہ کہا جاسکے گا کہ
کتنا شریف دل اس شخص کے سینے میں دھڑکتا تھا۔ حالی
اردو شاعری اور اردو نثر میں ایک حساس عقلیت کا پیغمبر
ہے۔"

حالی پر یہ مضامین آج سے تقریباً ساٹھ سال قبل لکھے گئے۔ اس درمیان دنیا واقعی بدل چکی ہے۔ بیسویں صدی کے نصف دوئم میں تیزی سے بدلتے ہوئے ماحول، نت نئے علوم و فنون نے بہت کچھ بدل دیا۔ ترقی پسند تحریک نے فکر وفن کے معیار بدلے۔ جدید دور نے اپنے منصوبے تیار کیے۔ آج مابعد جدیدیت کا دور ہے لیکن ان سب کے پیچھے انیسویں صدی کا نشاۃ الثانیہ بہر حال اپنا کلیدی رول ادا کر رہا ہے۔ حالی اور ان کے رفقا کی نگاہیں دور تک نظر رکھتی تھیں۔ انہیں مستقبل کی تبدیلیوں و ترقیوں کا احساس ہو چلا تھا اسی لیے انہیں اصلاح اور اخلاق کے پہلو اختیار کرنے پڑے ورنہ ایسا نہ تھا کہ حالی کو اخلاق اور ادب کے رشتوں اور نزاکتوں کا شعور نہ تھا۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں

"شعر اگرچہ براہ راست علم اخلاق کی طرح تلقین اور
تربیت نہیں کرتا لیکن از روے انصاف اس کو اخلاق کا نائب
مناب اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں۔"

لیکن ہم نے اپنی رومانی اور من مانی روایت کے پیشِ نظر حالی کی اخلاقیات کو نظر انداز کیا بلکہ مذاق اُڑایا جبکہ سچ یہ ہے کہ دنیا کا ہر بڑا شاعر، فنکار، اخلاقیات کو برتتا ہے۔ بقول وارث علوی۔ "ہر بڑا شاعر و نقاد ادب، زندگی، سماج ادب اور اخلاق کے مسائل سے الجھتا ہے اور ہر دور میں الجھتا ہے۔ بڑا فنکار جب انسان کے اخلاقی مسائل کو ادب میں برتتا ہے تو

شکسپیر کے المیے اور دستوئسکی کے ناول جنم لیتے ہیں۔" علوی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ آدمی کے پاس سے اس کا اخلاقی شعور لے لیجیے تو وہ ایک جگالی کرنے، رفع حاجت کرنے اور مجامعت کرنے والا جانور رہ جاتا ہے۔" بڑی شاعری اور بڑا ادب ہمیشہ تہذیب نفس، تالیف قلب اور تعمیر خلق کا حوالہ بنتا آیا ہے۔ ایلیٹ نے تو سیاست دانوں کو مشورہ دیا تھا کہ سیاسی کتابیں پڑھنے سے پہلے وہ علمی و ادبی کتابیں پڑھیں تاکہ وہ سمجھ سکیں کہ انسان کی اصل تاریخ و تہذیب کیا ہے اور انسان کے مقدروں کی تعمیر و تشکیل میں شعر و ادب کا رول کیا ہے۔ انسانی فکر، تجربات اور اس کی صلاحیت اظہار کے لیے ہمیشہ بیتاب و بیقرار رہتی ہیں، اس اظہار میں چونکہ سب سے اہم رول خود انسان کا ہوتا ہے اس لیے انسان کا انسان ہونا اور سمجھدار و درد مند ہونا اصل کارنامہ ہے۔ آج اظہار کے ذرائع و رسائل بدل گئے ہیں، چونکہ انسانی ذہن اپنے آپ میں ارتقا و وسعت کا لامحدود تصور رکھتا ہے اس لیے آج کے ترقی یافتہ ماحول میں ادب، صحافت، میڈیا کی نجانے کتنی صورتیں اور پرتیں ہمارے سامنے آچکی ہیں اس لیے آج ہمارے مفکرانہ و دانشورانہ اور شاعرانہ اظہار کے ادب و آداب بدل چکے ہیں لیکن حالؔی پر گفتگو کرتے ہوئے ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ یہ وہ دور تھا جب تجربات و تخلیقات کے اظہار کے زیادہ ذرائع نہ تھے اس لیے دنیا کی تہذیب میں شاعری اور عوامی شاعری ہی ایسے حوالے تھے جہاں وہ ادب، اخبار، میڈیا، مدرسہ سبھی کا کام کرتے تھے اور جذبات و احساسات کے اظہار کا بھی، اخلاقیات اور معاشیات کا بھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ انیسوی صدی کے سربرآوردہ فنکاروں پر غور کریں تو وہ بہ یک وقت شاعر، ادیب، مدیر، مدرس، مصلح، وطن پرست وغیرہ غرضکہ کیا کیا نہ تھے اور ایک سنجیدہ، ذمہ دار ادیب کو کئی محاذ پر کام کرنا پڑتا تھا۔ سرسید، حالؔی، شبلؔی، آزادؔ، شررؔ سے لے کر ابوالکلام آزاد اور پریم چند تک چلے آیئے ایسا ہی کچھ نظر آئے گا۔ حالؔی ان سب میں نمایاں اور ممتاز تھے اور اسی لیے وہ کئی محاذ پر نہ صرف مصروف و مشغول تھے بلکہ اکثر کی بنیاد بھی ڈال رہے

تھے۔ لیکن یہ بھی ایک فطری عمل ہے کہ اگر ایک طرف ذی علم اور ہوش مند انسان نے کہنہ پرستوں اور فرسودہ عقیدتوں سے لڑائی لڑی ہے تو اسی انسان نے اس کی مخالفت کی ہے۔ اقبال نے یونہی تو نہیں کہا تھا

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

لیکن ان سب کے باوجود انسانی فکر و تخیل سے شعر و ادب کے روایتی، مروجہ مزاج و مذاق، ہیئت و اسلوب سے آزاد ہونے یا تبدیلی ہونے کے لیے شعوری یا لاشعوری طور پر قدم اٹھائے ہیں بلکہ یوں کہا جائے کہ موضوع کی تبدیلی اور شکل و صورت کی تبدیلی اس کی بنیادی فکروں میں سے ایک ہے۔ بس خیال یہ رہے کہ انسان کی حقیقت اور ملک و معاشرہ کی مقامیت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ آخر کوئی تو وجہ ہے کہ حالی پیروئی مغرب تو کرتے ہیں لیکن اپنی زیادہ تر نظموں میں مقامی و ملی مسائل اٹھاتے ہیں اس لیے کہ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ پیروئی مغرب کا کوئی تابناک پہلو مقامیت و ارضیت کے بغیر سامنے نہیں آسکتا۔ بڑا اصلاحی و اخلاقی ذہن پیدا کرنے کی شرطِ اولین یہی ہوا کرتی ہے کہ اس کے پیر اپنی دھرتی پر ہوں اور اس کی سانسوں میں ملک کے مسائل رچے بسے ہوں اور وہ گہرا معاشرتی شعور رکھتا ہو۔ تبدیلی اور ترقی کا مطلب صرف باہر جھانکنا نہیں بلکہ ان ہواؤں کا استقبال کرنا ہوتا ہے جو اپنی تہذیب و معاشرت کے کمھلائے ہوئے پودوں کو سرسبز و شاداب کردے۔ حالی کو اس بات کا اندازہ تھا اس لیے وہ نہ پورے طور پر مذہبی انسان بنے اور نہ پورے طور پر سر سیّد کی مغرب کے پرستار۔ یہیں سے وہ سر سیّد سے الگ بھی ہوتے ہیں اور ان کی تنقید۔ شاعری، سب کہ سب ایک توازن، سنجیدگی اور سچائی کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ یہ سادگی صرف زبان و بیان کی نہیں بلکہ فکر و خیال کی بھی ہے۔ وہ اخلاقی اور سماجی عمل کو پیچیدہ نہیں بناتے بلکہ اپنے وطن اور ابنائے وطن سے بے لوث محبت کرکے ان میں

تاریخی اور قومی شعور بھرتے ہیں۔ یہ وہ سنجیدگی ہے جو اس عہد کے غیر سنجیدہ اور کربناک ماحول سے پھوٹ رہی ہے اور یہ وہ توازن ہے جو ایک عدم توازن اور تکرار و تصادم سے پر معاشرہ سے جنم لے رہا ہے۔ اسی لیے فراقؔ جیسے غزل کے نازک شاعر اور دوسرے شعرا نے حالیؔ کو ایک مکمل انسان اور شاعر کہا ہے۔ وارث علوی ہلچل و متزلزل شخصیت بھی یہ کہنے پر مجبور ہوئی

''حالیؔ پورے آدمی تھے جب کہ ہم لوگ ادھورے آدمی ہیں۔ ہمارے پاس کوئی نظام اقدار نہیں، تاریخی مناظر نہیں، روایت کا شعور نہیں، کھرے کھوٹے کے پیمانے نہیں۔ روشن خیالی کی جگہ تنگ نظری اور انتہا پسندی ہے، علمی خلوص کی جگہ سنابری ہے اور سوفسطائیت ہے۔ ہیومنزم کی جگہ جبلیت ہے۔ فکر ایسی جو قوتِ عمل کو مفلوج کردے اور عمل فکر سے بے نیاز ہے اور اسی لیے دہشت پسندی، بربریت اور تشدّد کا دور دورہ ہے کہ عمل کی کسوٹی انسانی اقدار نہیں بلکہ کامیابی اور حریف کی شکست رہ گئی ہے

حالیؔ انفرادیت سے بھی بڑی چیز کی تعمیر کر رہے تھے اور یہ چیز تھی ایک ایسا متین۔ دردمند اور مستحکم کردار جو ذہنی اور جذباتی توازن گنوائے بغیر پورے ایک دور کی اضطراب کو اپنی ذات میں جذب کر سکے۔ کیسا زلزلہ خیز تھا مشرق و مغرب کا پہلا تصادم اور حالیؔ کیسے شانت سبھاؤ سے اس کی ہر لرزش کو ادبی، سماجی اور اخلاقی سطح پر اپنے فکری اور جذباتی نظام میں جذب کرتے رہے حالیؔ کے غم میں سمندروں

کی گہرائی تھی کیوں کہ یہ غم اس ذات کی شکست کا غم تھا جو
تیرہ سو سال کے تہذیبی اور تمدنی مد و جزر سے گذر کر گوہر بنی
تھی۔ عرب و عجم و ہند کی روایات کو ٹوٹتے دیکھنا اور ان کے
صالح عناصر کو لے کر ایک نئی روایت کی داغ بیل ڈالنا بڑی
حوصلہ مندی کا کام تھا۔ ہم تو حالیؔ کی روایت تک کو نہ سنبھال
سکے۔"

(حالی، مقدمہ اور ہم، ص ۸۵)

سچ بات یہ ہے کہ زمانۂ قدیم سے شاعری ایک علم، ایک تاریخ اور ایک سماجی دستاویز کے طور پر کام کرتی رہی ہے۔ شاعری صرف جذبات کے اظہار اور تخیل کے پرواز کا نام نہیں بلکہ زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت اور انسان کی بہت بڑی ضرورت کے علاوہ ایک بیحد موثر میڈیا بھی ہے۔ شاعری لفظوں سے بنی جاتی ہے اور لفظوں سے بڑا کوئی کیمرہ نہیں ہوتا۔ آج کی شاعری کا سب سے بڑا چیلنج یہی ہے کہ وہ انسان کی برق رفتاری اور کج رفتاری دونوں کے درمیان اپنی راہ طے کرے اور انسانی فکر و ذہن کی ہم سفر بنے۔ کیا آج ادب کا یہ اہم مسئلہ نہیں ہے کہ وہ اپنے قارئین پیدا کرے اور ان سے زندگی کے روزمرّہ کو لے کر ان کے ذہن اور زبان پر محاورے کی طرح موجود رہے لیکن کیا آج اردو شاعری ایسا کر پارہی ہے؟ ایسے میں حالی جیسے مخلص و ہمدرد شاعر کی یاد آنا، حالیؔ کی عام فہم اور روشن خیال نظموں کا یاد آنا فطری ہے کہ جس کے گھر گھر چرچے تھے۔ عام آدمیوں کے ہونٹوں پر، عورتوں اور بچوں کی زبانوں پر حالی کے مصرعے بطور محاورہ رٹے ہوئے تھے۔ آج کی معاشرتی الجھنوں اور ادب اور عوام کے درمیان بڑھتے ہوئے فاصلوں کو دیکھتے ہوئے حالیؔ کو دریافت کرنے اور حالیہ تناظر میں ان کی معنویت و افادیت کی شدید ضرورت ہے۔ ان کی شاعری کو نئے سرے سے پڑھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے یقین ہے کہ موجودہ ادب کے

پراگندہ اور بے ہنگم شور وغل میں ان کی بامقصد اور پاکیزہ شاعری نشاط و انبساط، حرکت و حرارت بخشے گی۔ آخر کوئی تو بات ہے کہ حالی کی کتابوں کے صدہا ایڈیشن سستے داموں میں آج بھی بازار میں خوب فروخت ہوتے ہیں۔ ان کی نظمیں تمام جامعات و مدارس کے تمام مدارج پر آج بھی پڑھائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی ہزار نکتہ چینیوں اور کج بحثیوں کے باوجود ان کتابوں نے ہر معنوں میں ایک روایت اور تاریخ مرتب کی۔ ان کتابوں کو پڑھے بغیر نہ تو ہم اردو ادب کی تاریخ سمجھ سکتے ہیں اور نہ اردو تنقید کی توسیع اور نہ ہی اردو شاعری کی روایت اور بغاوت۔ مجنوں گورکھپوری نے جو بات کہی تھی کہ اگر نظیر کی نظمیں نہ ہوتیں تو حالی کی نظموں میں ابھی اور وقت لگ جاتا، اب یہ بات کہی جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اگر حالی کی مسدس، مناجات بیوہ، چپ کی داد، برکھارت وغیرہ نہ ہوتیں تو صبح وطن، برقِ کلیسا، گاندھی نامہ، ساقی نامہ، کسان، الیلی صبح، آوارہ، صبح آزادی، پرچھائیں جیسی دوسری ترقی پسند نظموں کے آنے میں دیر لگ سکتی تھی۔

حالی نے اردو شاعری کی مشکل پسندی و معیار پرستی کو جو سادگی اور سچائی عطا کی، فکر و خیال کو جو متانت اور پاکیزگی بخشی اور اردو تنقید کو ایک صنف و معیار کا درجہ دیا اور بہ حیثیت مجموعی ادب کو جو تاریخی، اخلاقی اور انسانی شعور عطا کیا اور جو وژن بخشا وہ ہمارے لیے دہائیوں تک نہیں صدیوں تک مشعلِ راہ کا کام کرتے رہیں گے۔

ظفر احمد صدیقی

مقالاتِ حالؔی

حالؔی، غالبؔ کے نامور شاگرد، عظیم المرتبت ناقد اور جدید اردو نثر کے معماروں میں ایک نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کی شاعری، ان کی تنقید اور ان کی نثر تینوں قدر اول کی چیزیں ہیں۔ ہمارے یہاں حالؔی پر اب تک جو کچھ کام ہوا ہے، وہ بیشتر 'مقدمہ شعروشاعری'، 'یادگارِ غالب' اور 'حیات جاوید' سے تعلق رکھتا ہے۔ 'حیات سعدی' بھی ان کی نہایت وقیع اور گراں قدر تصنیف ہے، لیکن فارسی کا چلن اٹھ جانے کی وجہ سے اس کی طرف کماحقہ توجہ نہیں کی گئی۔ مستقل تصانیف کے علاوہ حالی نے مختلف موضوعات پر درجنوں چھوٹے بڑے مقالات بھی تحریر کیے ہیں۔ یہ بہت اہم اور قیمتی مقالات ہیں۔ افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ اب تک یہ ہماری ادبی بے اعتنائی کا شکار رہے ہیں۔ اس لیے ضرور ہے کہ ان مقالات کو بحث و تمحیص کا موضوع بنایا جائے۔

مولوی عبدالحق کی اطلاع کے مطابق حالؔی کے مضامین کا پہلا مجموعہ مولوی وحیدالدین سلیم نے شائع کیا تھا، لیکن یہ بہت مختصر اور ناقص تھا۔ اس کے بعد شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے ایک مدت کی تلاش وجستجو کے بعد انہیں دو حصوں میں اس طرح مرتب کیا کہ

پہلے حصے میں عام مضامین رکھے اور دوسرے حصے میں کتابوں کے تبصرے، تقریظیں اور مختلف تقریریں شامل کیں۔ اس کے علاوہ شیخ صاحب نے ان دونوں حصّوں میں جابجا حواشی اور تمہیدی نوٹ بھی لکھے۔ مولوی عبدالحق نے ان پر بعض مضامین کا اضافہ کیا اور اپنے تین صفحے کے دیباچے کے ساتھ ''مقالات حالی'' کے عنوان سے ۱۹۳۴ء میں انجمن ترقی اردو ہند کی جانب سے شائع کر دیا۔ اس کتاب کا ایک اور ایڈیشن ۱۹۵۷ء میں انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ سے منظر عام پر آیا۔ اس کا پہلا حصہ اس وقت میرے سامنے ہے۔ ۱۹۶۴ء میں مجلس ترقی ادب لاہور نے یہی مقالات ''کلیاتِ نثر حالی'' کے نام سے حسب سابق دو حصوں میں شائع کیے۔ حالی کے معتبر پاکستانی محقق ڈاکٹر عبدالقیوم کے بیان کے مطابق حالی کی بعض تحریریں اب بھی ان مجموعوں میں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں۔

اہل علم حضرات واقف ہیں کہ اردو میں مضمون نویسی اور مقالہ نگاری کا رواج علی گڑھ تحریک کے زیر اثر ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں میرِ کارواں کا فریضہ سرسید نے انجام دیا۔ انہوں نے سفر لندن سے واپسی کے بعد رسالہ تہذیب الاخلاق کا اجرا کیا اور اس میں علمی، ادبی، مذہبی، سیاسی، سماجی ہر طرح کے موضوعات پر کثرت سے مضامین لکھے۔ ان کے جن نامور رفقا و معاصرین نے مقالہ نگاری کی اس روایت کو آگے بڑھایا، ان میں محسن الملک، محمد حسین آزاد، عبدالحلیم شرؔر، حالی اور شبلی کے نام نمایاں اور سرفہرست ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے مقالات کا طرز و انداز ایک دوسرے سے جداگانہ اور مختلف ہے۔ ان سب کا تفصیلی و تقابلی مطالعہ یقیناً دلچسپی اور افادیت سے خالی نہیں۔ لیکن ہم اپنے موضوع کے دائرۂ کار میں رہتے ہوئے یہاں صرف حالی کے مقالات سے بحث کریں گے۔

مقالاتِ حالی کے تعلق سے سب سے اہم اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان کے مطالعے کے بغیر حالی سے ہماری واقفیت سرسری اور ادھوری رہتی ہے۔ حالی کی سیرت اور افکار و نظریات کے نہاں خانوں میں اترنے کے لیے مقالاتِ حالی کے دریچوں کا وا کرنا از

بس ضروری ہے۔ آئندہ سطور میں اس سلسلے کی بعض تفصیلات پیش کی جاتی ہیں۔ انسانی نفوس کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک نفس امارہ یعنی وہ نفس جو انسان کو بغاوت، سرکشی اور نافرمانی پر آمادہ کرتا رہتا ہے۔ دوم نفس لوامہ یعنی وہ نفس جو کسی گناہ کے صدور کے بعد اپنے کیے پر پچھتاتا اور لعنت و ملامت کرتا ہے۔ سوم نفس مطمئنہ یعنی وہ نفس جو طاعات پر راضی اور مطمئن ہو جاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حالی نفس مطمئنہ کے مالک تھے تو یہ بیجا اور غلط نہ ہوگا۔ اس کا اندازہ حالی کی اس مناجات سے بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے، جو مقالاتِ حالی میں سرفہرست ہے۔ حالی کا اپنے خالق و مالک سے سرگوشیوں کا انداز ملاحظہ ہو

الٰہی! تیرا کرم وسیع، تیری عنایت شامل، تیرا فیض عام، تیرے ہاتھ کشادہ، تیرا ملک بے زوال، تیرے خزانے بے حساب، تیری نعمتیں سرمدی۔ تجھ سے کیا کیا مانگیے؟ اور کہاں تک مانگیے؟ تجھ سے دولت کونین پر راضی ہونا ایسا ہے جیسے بحرقلزم سے پیاسا پھرنا۔ تجھ سے دنیا و آخرت مانگنی ایسی جیسے خوان یغما سے بھوکا اٹھنا۔ تیرا گدا نہیں جو ہفت اقلیم کی سلطنت پر لات نہ مارے۔ تیرا بھوکا نہیں جو نعیم جنت کے لیے ہاتھ پسارے۔ جس نے تجھ سے تیرے سوا آرزو کی اس نے آرزو کرنی نہ جانی۔ جس نے تیرے ہوتے عرش اور مادون العرش پر خاک نہ ڈالی اس نے تیری قدر نہ پہچانی

آنچہ خواہند و بیابند نخواہند آنرا
ویں سخن شمہ ای از ہمتِ درویشانست

(مقالات حالی، ص ۹۔۱۰)

حالی نے تہذیب الاخلاق میں ۱۸۷۹ میں ایک مضمون "الدین یسر" کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس میں انہوں نے اپنا یہ نقطۂ نظر پیش کیا ہے کہ دین اپنی اصل کے لحاظ سے سہل، سادہ اور ہر شخص کے لیے قابل عمل ہے۔ اس کی دشواریاں درحقیقت علما کی تدقیقات اور صوفیا کی تکلیفات کا نتیجہ ہیں۔ اس مضمون کے بعض اقتباسات ذیل میں ملاحظہ ہوں۔ لکھتے ہیں

> افسوس ہے کہ ہمارے علما نے احکام ظاہری میں تعمق اور تدقیق کو اس قدر کام فرمایا کہ شریعت کا موضوع بالکل بدل گیا اور جس دین کی نسبت "الدین یسر" کہا گیا تھا، وہ "الدین عسر" کہنے کا مستحق ہو گیا۔ طہارت اور نجاست کی تحقیق میں اتنا کچھ لکھا گیا کہ انسان کی تمام عمر اس کے دیکھنے، پڑھنے اور سمجھنے کے لیے کفایت نہیں کر سکتی۔ اگر فقط آمین اور رفع یدین اور قرأت فاتحہ کی تحقیقات میں کوئی شخص اپنا تمام وقت صرف کرے تو اس کی عمر کا ایک بڑا حصہ اس میں تمام ہو جائے گا۔ اگر کوئی شخص ایک سجدۂ سہو کی تمام جزئیات کو از بر کرنا چاہے اور اس نالائق دنیا کی ضروریات بھی سرانجام دیتا رہے تو نہایت دشوار معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام جزئیات کو احاطہ کر سکے امام شعرانی نے میزان میں لکھا ہے کہ "دین میں جتنی آسانیاں ہیں وہ خدا کی، رسول کی طرف سے ہیں اور جتنی دشواریاں ہیں، وہ علما کی طرف سے ہیں۔" واقعی یہ قول نہایت صحیح ہے کیونکہ ہم اپنے عہد کے علما کا حال ایسا ہی دیکھتے ہیں۔
>
> (ص ۷۸۔۷۹)

آگے لکھتے ہیں

> مگر اس تعمق اور تشدد میں علما کے ساتھ حضرات صوفیا کو بھی شامل کرنا ضرور ہے۔ جنہوں نے عباداتِ شاقہ اور بے انتہا اذکار و اشغال اور دائمی روزے اور سخت سے سخت ریاضتیں اختیار کر کے اوروں کو ریس دلائی اور امت کو اور بھی زیادہ بوجھل اور گراں بار کر دیا اور تحریفِ دین کی ایک دوسری بنیاد ڈالی۔

(ص ۸۰)

حالی کا متذکرہ بالا مضمون خاصا مفصل اور توجہ سے پڑھے جانے کے لائق ہے۔ اس کی بعض جزئیات سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے، لیکن اس کی فی الجملہ صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بلاشبہ یہ ایک فکر انگیز مقالہ ہے۔

حالی کا ایک اور توجہ طلب مضمون ہے ''تجارت کا اثر عقل اور اخلاق پر'' اس میں انہوں نے اس عام خیال کی تردید کی ہے کہ تجارت اور دکان داری سے قوائے ذہنی اور عقل و اخلاق کو نقصان پہنچتا ہے۔ لکھتے ہیں

> جس طرح بڑے بڑے کامیاب تاجر نوکری کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کو ایک ادنیٰ درجے کی غلامی اور آزادی کی برباد کرنے والی سمجھتے ہیں، اسی طرح وہ لوگ جنہوں نے علم و فضل یا مناصب و خدمات کی وجہ سے امتیاز حاصل کیا ہے، بیوپار اور دکان داری کو قوائے ذہنی اور عقل و اخلاق کے حق میں نہایت مضر بتاتے ہیں۔ مگر حق یہ ہے کہ تجارت میں ہمیشہ وہی لوگ کامیاب ہوئے ہیں اور

ہوتے ہیں جن کے اخلاق درست اور عقل سلیم ہوتی ہے۔

(ص ۲۲۷)

یہ مضمون بھی مفصل، مدلل اور تمثیلوں سے پُر ہے۔

حالی کا ایک اور دلچسپ مضمون ہے ''مسلمانوں میں عملی قوت کیوں نہیں رہی؟'' اس کے علاوہ انہوں نے تدبیر و توکل، حسب اور نسب، مذہبی مناظروں، اصلاح معاشرت اور مسلمانوں میں خیرات و گداگری کے مسائل پر بھی نہایت پُرمغز اور جچی تلی باتیں کہی ہیں اور جیسا کہ ابتدا میں کہا گیا حالی کے افکار و نظریات سے واقفیت بہم پہنچانے کے لیے ان مقالات کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

حالؔی کے بارے میں یہ بات معلوم و معروف ہے کہ وہ حد درجہ متواضع اور منکسر المزاج واقع ہوئے تھے۔ تعلّی اور ادعائیت سے انہیں دور کا بھی علاقہ نہ تھا، بلکہ اسکے برعکس وہ اپنے علم اور فضل و کمال پر ہمیشہ پردہ ڈالتے رہتے تھے۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام تو عوام خواص کو بھی ان کے تبحر و کمال اور رسوخ فی العلم کا اندازہ نہ ہو سکا۔ لیکن حالی کے مقالات گواہی دیتے ہیں کہ وہ عربی زبان و ادب کے علاوہ اپنے عہد کے علوم متداولہ یعنی تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، منطق اور فلسفہ کلام وغیرہ میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کے مقالات سے بعض اقتباسات ملاحظہ ہوں ء

> خدا تعالیٰ نے اس دین کے آسان ہونے کو اپنے کلام پاک میں طرح طرح سے جتایا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے (۱) یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر (بقرہ) (۲) لا یکلف اللہ نفسا إلا وسعھا (بقرہ) (۳) ما جعل علیکم فی الدین من حرج (الحج) یعنی (۱) خدا تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے، دشواری نہیں چاہتا (۲) خدا کسی کو اس کی طاقت

سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا (۳) خدا نے دین میں تم پر کسی
طرح کی تنگی نہیں کی۔

آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے استدلال کا یہ انداز حالی کی شخصیت کے عالمانہ رخ کو نمایاں کرتا ہے۔ اس ضمن میں تاویلِ متشابہات سے متعلق ایک اقتباس بھی نقل کیے جانے کے لائق ہے۔ لکھتے ہیں

یہاں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر تاویلِ متشابہات کا علم خدا تعالیٰ کے ساتھ مخصوص نہ تھا تو سلفِ صالح تاویل کرنے کو کیوں ناجائز سمجھتے تھے اور جو تاویل کا مرتکب ہوتا تھا اس سے کس لیے مواخذہ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے صبیغ بن عسل کو اتباعِ متشابہ پر سزا دلوائی اور مدینہ منورہ سے جلاوطن کر کے بصرہ کو بھجوا دیا اور جب امام مالک سے استواء علی العرش کا مطلب پوچھا گیا تو انہوں نے اس کے سوا کوئی جواب نہیں کہ "استواء کے معنی معلوم ہیں اور اس کی کیفیت مجہول ہے اور اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس سے سوال کرنا بدعت ہے۔"

سو اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ جس زمانے میں قرآن نازل ہوا، اس وقت اہل کتاب تحریفِ کتب مقدسہ کے سبب سے نہایت بدنام تھے۔ وہ اکثر اپنے اغراض فاسدہ کے لیے کتب مقدسہ کے معنی لوگوں کو غلط بتاتے تھے اور اس طرح دین میں رخنہ ڈالتے تھے

اسی بنا پر سلف صالح متشابہات کی تاویل سے کوسوں

دور بھاگتے تھے۔ باوجودیکہ وہ تشبیہ کے عقیدے سے
بالکل مبرّا تھے اور جس بات میں تشبیہ کا ادنیٰ شائبہ پاتے
تھے، اس سے حذر کرتے تھے۔ پھر بھی جو آیتیں تشبیہ پر
دلالت کرتی تھیں، ان کی تاویل سے ہمیشہ سکوت کرتے تھے
اور ان کے ظاہری معنوں سے ہرگز تجاوز نہ کرتے تھے۔

(ص ۲۷۴۔۲۷۶)

یہ اقتباس حالی کے جس مضمون سے ماخوذ ہے، اس کا عنوان ہے "قرآن مجید میں اب نئی تفسیر کی گنجائش باقی ہے یا نہیں؟" یہ پورا مضمون تفسیری مباحث پر مشتمل اور قرآن و احادیث کے حوالوں سے پُر ہے اور اس سے علوم دینیہ میں حالی کی پختگی اور استعداد کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں اس سلسلے کے بعض اقتباسات نقل کرنے سے اس طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ حالی کی شخصیت کا یہ عالمانہ رخ ان کی متداول تصانیف کے بجائے صرف ان کے مضامین و مقالات ہی سے نمایاں ہوتا ہے۔ اس لیے مطالعۂ حالی کے ضمن میں مقالات حالی کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

حالی کے مضامین و مقالات اس لیے بھی اہمیت کے حامل اور توجہ کے طالب ہیں کہ انھیں ہم مقالہ نگاری کے مثالی نمونوں کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ حالی اپنا نقطۂ نظر ابتدا ہی میں وضاحت اور قطعیت کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد دلائل اور مثالوں کے ذریعے اپنی بات کو آگے بڑھاتے جاتے ہیں۔ اس دوران ان کا انداز گفتگو ادعائی کے بجائے تجزیاتی ہوتا ہے اور لہجہ دھیماپن لیے ہوئے لیکن متانت و جزالت سے پُر ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ جوش بیان، عبارت آرائی اور مرادفات کے بیجا استعمال سے مکمل احتراز کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک اچھے مقالے کی یہی شان اور پہچان ہے۔

حالی کا ذہن بہت مرتب اور منظم تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے خیالات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے سے قبل مرتب و منضبط کر لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین و مقالات میں ژولیدگی، پیچیدہ بیانی اور تضاد کا عیب نظر نہیں آتا۔ بلکہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ ابتدا ہی میں قاری پر واضح اور منکشف ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے بعض مضامین کی ابتدائی سطروں کا نقل کرنا یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اپنے مضمون ''نبی کی ضرورت پر ایک وجدانی شہادت'' کا آغاز وہ اس طرح کرتے ہیں

> جو باتیں انسان کو مذہب نے تعلیم کی ہیں اور جن کو وہ الہامی جانتا ہے، وہ عموماً یا تو خدا تعالیٰ کی ذات و صفات سے علاقہ رکھتی ہیں یا اس سزا و جزا سے جس کا وقت موت کے بعد مقرر کیا گیا ہے اور اس لیے ہم تمام مذہبی تعلیمات کو علم مبدأ و معاد کہتے ہیں۔
>
> پس نبی کی ضرورت ثابت کرنے کے لیے ہم کو دو باتوں کا ثبوت دینا کافی ہے۔ ایک یہ کہ مبتداء و معاد نفس الامر میں ایسی دو حقیقتیں ہیں جن کا علم حاصل کرنا، انسان پر واجب ہے۔
>
> دوسرے یہ کہ مبدأ و معاد کا علم نبی کے سوا کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

(ص ۱۹)

مضمون ''مزاح'' کی ابتدائی سطریں اس طرح ہیں

مزاح جس کو غلطی سے مذاق کہنے لگے ہیں، انسان کی ایک جبلی خاصیت ہے، جو کم و بیش تمام افراد میں پائی جاتی ہے۔

مزاح کو عربی، فارسی اور اُردو میں تین مختلف القاب دیے گئے ہیں، یعنی

۱۔ مطائبہ
۲۔ خوش فعلی
۳۔ خوش طبعی

یہ تینوں لقب اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ مزاح کا موضوع لہ "خوشی" کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔

(ص ۱۳۸)

"موت کے یقین سے ہم کو کیا سبق لینا چاہیے؟" اس کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں

بے شک ہر شخص کو جس طرح اپنے ہونے کا یقین ہے، اسی طرح اس بات کا بھی یقین ہے کہ ایک دن ہم نہ ہوں گے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس پچھلے یقین سے ہم کو کیا سبق لینا چاہیے؟ کیا یہ سبق کہ تمام دنیا کو مع اپنی ہستی کے ناپائدار سمجھ کر جیتے جی مر جائیں اور خاک ہونے سے پہلے خاک ہو جائیں؟ یا یہ نصیحت کہ اس ناگزیر وقت کے آنے سے پہلے جس قدر مہلت ملے، اس کو غنیمت سمجھ کر کچھ ہاتھ پاؤں ہلائیں اور خدا کی اس نعمتِ عظمٰی سے جہاں تک ہو سکے آپ بھی فائدہ اٹھائیں اور اپنے ہم جنسوں کو بھی فائدہ پہنچائیں؟

(ص ۱۹۴)

حالی کی نثر کو عام طور پر روکھی پھیکی نثر کہا جاتا ہے۔ لیکن مقالات و مضامین میں حالی کی نثر نہایت شگفتہ، رواں دواں اور متین ہے، جیسا کہ اوپر دی گئی مثالوں سے واضح

ہے۔ بلکہ "مقالاتِ حالی" میں بعض ایسے مضامین بھی شامل ہیں، جن پر ادبیت اور انشا پردازی کا رنگ غالب ہے۔ اس ضمن میں "مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات" "مزاح" اور "زبانِ گویا" خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ "مناجات" کی آخری سطریں ملاحظہ ہوں

> الٰہی جس طرح اپنے شریک کو صفحۂ امکان سے مٹایا، اسی طرح نقشِ غیر ہماری لوحِ خاطر سے محو فرما۔ الٰہی! جس طرح ستاروں کو سورج کی روشنی میں کھپایا، اسی طرح ہم کو انوارِ ذات میں مضمحل کر۔ الٰہی! وہ جلوہ دکھا جس کا حجاب اسی کی یکتائی ہے، جس کی اوٹ دیدۂ تماشائی ہے، جو علم و ادراک کے پردوں میں مستور ہے، جس کا منشاے خفا غائت ظہور ہے۔ جس کے طالب کو وصول سے قطع نظر ہے، جس کا ملنا حوصلۂ توقع سے باہر ہے۔ جو تقریر میں نہ آئے، جو تحریر میں نہ سمائے
>
> وہ مانگتا ہوں جس کے بیاں سے زباں ہے لال
> اے وائے! گر روا نہ ہو مطلب فقیر کا
>
> (ص ۱۰)

اب "مزاح" کا یہ اقتباس پڑھیں

> مزاح جب تک مجلس کا دل خوش کرنے کے لیے (نہ کہ کسی کا دل دکھانے کے لیے) کیا جائے ایک ٹھنڈی ہوا کا جھوکا یا ایک سہانی خوشبو کی لپٹ ہے، جس سے تمام پژمردہ دل باغ باغ ہو جاتے ہیں اس سے جودت اور

ذہن کو تیزی ہوتی ہے اور مزاح کرنے والا سب کی نظروں
میں محبوب اور مقبول ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے جب وہ
اس حد سے بڑھنے لگتا ہے تو دمبدم ہولناک ہوتا جاتا ہے
اور آخر اس سے بجائے محبت کے دشمنی اور بجائے خوشی کے غم
پیدا ہوتا ہے۔ وہ اخلاق کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے لوہے
کو زنگ یا لکڑی کو گھن۔ مزاح کرنے والا ایسا بے دید
ہو جاتا ہے کہ غیروں کو ہنسانے کے لیے اپنے عزیز دوست
کا خاکہ اڑانے لگتا ہے۔ وہ ایسا بے باک ہو جاتا ہے کہ خدا
اور رسول پر بھی ایک آدھ پھبتی ہوئے بغیر نہیں
رہتی۔ (ص ۱۳۹)

آخر میں ''زبان گویا'' کا بھی ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ یہ پورا مضمون ہیئت اور
مواد دونوں لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ لکھتے ہیں

اے میری بلبل ہزار داستان! اے میری طوطی شیوا بیان!
اے میری قاصد! اے میری ترجمان! اے میری وکیل!
اے میری زبان! سچ بتا تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا
پودا ہے؟ کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل
میں ایک نیا مزا ہے۔ کبھی تو ایک ساحرِ فسوں ساز ہے جس
کے سحر کا رونہ جادو کا اتار۔ کبھی تو ایک افعیِ جاں گداز ہے
جس کے زہر کی دارو نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے کہ
بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی
لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی

تھی۔ تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے
دلوں کا شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے دلوں کو فگار
کرتی تھی۔

گذشتہ صفحات میں جو کچھ عرض کیا گیا، اس کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حالی کے مقالات علمی و ادبی ہر دو لحاظ سے اہم ہیں اور ان کے مطالعے کے بغیر حالی کے ساتھ انصاف ممکن نہیں۔

دیوانِ غالب

(ہندی)

از نور نبی عبّاسی

ہندی رسم خط میں دیوان غالب کے مستند ایڈیشن کی ضرورت عرصۂ دراز سے محسوس کی جارہی تھی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کا دیوان غالب (ہندی) اسی ضرورت کی تکمیل کے لئے اٹھایا جانے والا عملی قدم ہے۔ اس میں ہر صفحے پر حاشیے میں مشکل الفاظ کے ہندی معنی دیئے گئے ہیں۔

فوٹو آفسیٹ طباعت، دیدہ زیب گٹ اپ۔

صفحات ۲۵۶

قیمت ۶۰ روپے

شین کاف نظام

مقدمہ شعروشاعری اور شعری زبان

"مقدمہ شعروشاعری" میں حالی لکھتے ہیں

"اگر ہمارے ہم وطنوں میں کوئی شخص اپنی خاص زبان میں
شعر کہنا چاہے تو اس سے بہتر کوئی بات نہیں ہے کیوں کہ
مادری زبان سے بہتر اور سہل تر کوئی آلہ اظہار خیالات
کا نہیں ہوسکتا۔"

لیکن اگر کوئی شخص مادری زبان میں شعر نہ کہنا چاہے یا نہ کہہ سکے، وہ کیا کرے؟
اس سوال کے جواب میں حالی کہتے ہیں کہ اسے اُردو ہی میں شعر کہنا چاہیے۔ ایسے میں یہ
سوال پیدا ہوگا کہ اردو ہی میں کیوں؟ حالی کہتے ہیں کہ

"اُردو زبان ہندوستان کی اور تمام زندہ زبانوں کی نسبت
بالاتفاق زیادہ وسیع اور خیالات ادا کرنے کے زیادہ لائق
ہے۔ تمام اطراف ہندوستان میں عموماً بولی اور سمجھی جاسکتی
ہے۔ اور اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ اس کو ہندوستان

کی قومی زبان بنایا جائے اور جہاں تک ممکن ہو اسی کو ترقی
دی جائے نیز اس کا حاصل کرنا اور اس میں کافی مہارت بہم
پہنچانا ہندوستان کے باشندوں کو اتنی دشوار نہیں ہے جتنی کہ
اور غیر مادری زبانوں میں دشوار ہوتی ہے۔"[۲۲]

آگے بڑھنے سے پہلے حالی کا یہ قول بھی دیکھ لیں۔ لکھتے ہیں

"اس کے سوا ہندوستان کی تمام زندہ زبانوں میں بالفعل
کوئی زبان ایسی نہیں معلوم ہوتی جس میں اردو کے برابر
شعر کا ذخیرہ موجود ہو۔ اس لیے یہ زیادہ مناسب معلوم
ہوتا ہے کہ ہمارے ہم وطنوں میں جو شخص شعر کہنا
اختیار کرے وہ اردو ہی کو اپنے خیالات ظاہر کرنے کا آلہ
قرار دے۔"[۲۳]

اِن اقتباسات سے مندرجہ ذیل نکات سامنے آتے ہیں

۱۔ مادری زبان سے بہتر، شعر کہنے کے لیے کوئی زبان نہیں ہے۔

۲۔ اگر مادری زبان میں شعر کہنا ممکن نہ ہو تو اُردو کو ذریعۂ اظہار بنانا چاہیے۔

۳۔ اُردو کے انتخاب کا سبب یا جواز یہ ہے کہ یہ زیادہ وسیع اور خیالات ادا کرنے کے زیادہ لائق ہے۔

۴۔ وہ یعنی اُردو پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاسکتی ہے۔

۵۔ اُردو قومی زبان بننے کی مستحق ہے۔ اس لیے اسے ترقی دی جانی چاہیے۔

۶۔ اس، اُردو، کا حاصل کرنا اور اس میں کافی مہارت حاصل کرنا

ہندوستان کے باشندوں کے لیے اتنا دشوار نہیں جتنا کہ دیگر، غیر مادری زبانوں کو حاصل کرنا ہے۔

حالی کی پہلی بات بہت مناسب ہے لیکن اچھا ہوا کہ علامہ اقبال نے ان کا کہا نہیں مانا ورنہ اُردو ایک بڑے شاعر سے محروم ہو جاتی۔ اس ضمن میں اور بھی نام لیے جا سکتے ہیں۔ ہاں، بہ ظاہر یہ بات معقول اور مدلّل معلوم ہوتی ہے۔ ان کی دوسری باتوں سے بھی اتفاق کیا جاتا ہے لیکن ان کی آخری بات بحث طلب ہے۔ اس لیے بھی کہ خود حالی لکھتے ہیں

"اُردو پر قدرت حاصل کرنے کے لیے صرف دلّی یا لکھنؤ کی زبان کا تتبع ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ عربی اور فارسی میں کم سے کم متوسط درجہ کی لیاقت اور نیز ہندی بھاشا میں فی الجملہ دستگاہ بہم پہنچائی جائے۔ اُردو زبان کی بنیاد جیسا کہ معلوم ہے ہندی بھاشا پر رکھی گئی ہے۔ اس کے تمام افعال اور تمام حروف اور غالب حصہ اسما کا ہندی سے ماخوذ ہے اور اردو شاعری کی بنا فارسی شاعری پر جو عربی شاعری سے مستفاد ہے، قائم ہوئی ہے نیز اُردو زبان میں بہت بڑا حصہ اسما کا عربی اور فارسی سے ماخوذ ہے۔ پس اُردو زبان کا شاعر جو ہندی بھاشا کو مطلق نہیں جانتا اور محض عربی و فارسی کے تان گاڑی چلاتا ہے وہ گویا اپنی گاڑی غیر پہیوں کے منزل مقصود تک پہنچانی چاہتا ہے اور جو عربی و فارسی سے نابلد ہے اور صرف ہندی بھاشا یا محض مادری زبان کے بھروسے پر اس بوجھ کا متحمل ہوتا ہے وہ ایک ایسی گاڑی ٹھیلتا ہے جس میں بیل نہیں جوتے

گئے ہیں۔"

مجھے احساس ہے کہ اقتباس طویل ہوگیا ہے لیکن آپ نے دیکھا کہ وہ اُردو زبان جس میں کافی مہارت بہم پہنچانا ہندوستانی باشندوں کے لیے، دیگر مادری زبانوں کے، کم دشوار بتایا گیا وہ بذاتِ خود کس قدر دشوار ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص مادری زبان کی بجائے اُردو زبان میں شعر کہنا چاہے تو اُس میں کم سے کم چار زبانوں میں متوسط درجہ کی لیاقت ہونی چاہیے اور وہ زبانیں ہیں ہندی، عربی، فارسی اور اُردو۔ ان زبانوں پر معمولی دسترس، یا بقول حالی دست گاہ بہم پہنچانا، بھی ہم جانتے ہیں کہ کس قدر مشکل ہے۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک زبان پر دست رس یا متوسط درجہ کی لیاقت ہونا بھی آسان نہیں ہے۔

شیفتہ کے انتقال (۱۸۶۹ء) کے بعد حالی لاہور میں پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازم ہوگئے تھے اور ان کے ذمہ انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوئی کتب پر نظرِ ثانی کرنے کا کام تھا۔ اسی کام کے دوران انہوں نے اردو کے ذریعہ بہت سی انگریزی کتب کا مطالعہ کیا۔ انگریزی ادب میں ایک ایسا دور رہا ہے جس میں لوگوں کا یہ ماننا تھا کہ انگریزی میں دست گاہ حاصل کرنے کے لیے لیٹن (latin) یا کسی ایک کلاسکل زبان سے کما حقہ، واقفیت ضروری ہے۔ بہت ممکن ہے حالی اس نظریے سے متاثر ہوئے ہوں۔ یہ تو ایک قیاس ہے جو غلط بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن کیا کسی زبان میں شعر کہنے کے لیے اتنی زبانیں جانی جاسکتی ہیں۔ کسی شخص کو چار کیوں چالیس زبانوں پر دسترس ہو اس سے اس کی معلومات میں اور کسی حد تک تخلیقی توانائی میں بھی اضافہ ہوگا لیکن کسی زبان میں شعر کہنے کے لیے چار چار زبانوں سے واقف ہونا ناممکن حد تک دشوار ہے۔

حالی کا دیوان ۱۸۹۳ء میں منظرِ عام پر آیا اور مولانا محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" ۱۸۸۰ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ دونوں حضرات نے زبان کی اصل اور اساس تو اسی

زمین کی خوبو رکھنے والی زبان کو قرار دیا لیکن شعریات کی بنیاد عرب و عجم کو بنایا۔ آزاد کی تصنیف تو تذکراتی نوعیت کی تھی اس لیے اس میں شعریات اور علمیات کی باتیں بہت ضروری نہیں تھیں لیکن حالی کی کتاب کا مقدمہ تو شعریات ہی کے متعلق ہے۔ شعریات میں سب سے پہلی یا اساسی اہمیت کی چیز زبان، شعری زبان ہے۔ اس لیے ہم بھی یہاں اردو کی شعری زبان (عہدِ حالی تک) کے متعلق گفتگو کریں گے اور یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ حالی نے شعری زبان کی تشکیل و تعمیر میں اور شعری زبان کی ''اصلاح'' کے باب میں مقدمے کی وساطت سے کیا رول ادا کیا ہے اور اس رول کی ہماری ادبی تاریخ اور شعری زبان کی مزاج شناسی میں کیا اہمیت ہے اور اگر حالی نے یہ آواز نہ اٹھائی ہوتی تو ہماری شعری زبان کا حشر کیا ہوا ہوتا۔

ہماری زبان میں بھی مختلف زبانوں کے الفاظ ہیں۔ ہم نے ان کے استعمال میں دو طریقے اختیار کیے ہیں۔ ایک وہ جس میں معنوی و تلفظی تصرّف و تبدّل کو روا رکھا گیا ہے۔ دوسرا وہ جس میں لفظ کے اصل تلفظ و معنی کے مطابق استعمال کو مستحسن مانا ہے۔ زندہ زبانوں میں دونوں ہی طریقوں کو صحیح مانا جاتا ہے۔ تصرّف و تبدّل کے جائز و ناجائز کا فیصلہ استعمالِ عام اور روزمرہ کی روشنی میں ہوتا ہے۔ شاہ حاتم، شاید پہلے شخص تھے جنھوں نے اس بات پر زور دیا کہ عربی اور فارسی الفاظ کو ان کے اصل تلفظ کے لحاظ سے نظم کیا جائے لیکن خود انھوں نے وضع کردہ اصول کی پابندی نہیں کی۔ شاہ حاتم سترہویں صدی میں ہوئے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ولی کے بعد سے زبان میں اصلاح کرنے کا کام شروع ہوا اور عربی و فارسی الفاظ کو اصل کے مطابق استعمال کرنے پر زور دیا جانے لگا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں سیّد انشا نے اپنی تصنیف ''دریائے لطافت'' (جو لکھی ۱۸۰۸ء میں گئی لیکن شائع ۱۸۴۹ء میں ہوئی) جو اردو صرف و نحو کی پہلی ایسی کتاب ہے جسے کسی ہندوستانی اہلِ زبان نے سپردِ قرطاس کیا، میں اس قضیّہ کا فیصلہ کرتے ہوئے لکھا کہ

"جاننا چاہیے کہ جو لفظ اُردو میں آیا وہ اُردو ہو گیا خواہ وہ لفظ
عربی ہو یا فارسی ترکی ہو یا سریانی پنجابی ہو یا پوربی، اصل کی
رو سے غلط ہو یا صحیح، وہ لفظ اُردو کا لفظ ہے۔ اگر اصل کے
موافق مستعمل ہے تو بھی صحیح اور اگر اصل کے خلاف ہے تو
بھی صحیح۔ اس کی صحت اور غلطی اس کے اُردو میں رواج
پکڑنے پر منحصر ہے، کیونکہ جو چیز اُردو کے خلاف ہے وہ غلط
ہے گو اصل میں صحیح ہو، اور جو اُردو کے موافق ہو وہی صحیح ہے
خواہ اصل میں صحیح نہ بھی ہو[۵]"

اتنی وضاحت کے باوجود ہمارے اساتذہ میں اختلاف آرا اور معرکہ آرائیاں رہیں۔ آتش و ناسخ کے دور میں آتش کے کلام پر اعتراض کی نوعیت اسی ڈھب کی رہی۔ صرف ایک مثال ملاحظہ ہو۔ آتش کا مطلع ہے:

دخترِ رز مری مونس ہے مری ہمدم ہے
میں جہاں گیر ہوں وہ نور جہاں بیگم ہے

اعتراض کیا گیا "بیگم" ترکی لفظ ہے۔ اہلِ زبان گاف پر پیش بولتے ہیں (لہٰذا قافیہ غلط)"۔ آتش نے جواب دیا "ہم ترکی نہیں بولتے ترکی بولیں گے تو بیگم (بہ گاف مضموم) کہیں گے۔ مولوی عبدالباری آسی نے لکھا ہے:

آتش کا جواب صحیح ہے کیوں کہ اہلِ ہند کا یہی محاورہ ہے، اور
کلام اساتذہ میں بھی بضمِ کاف فارسی کہیں نہیں دیکھا گیا۔
علاوہ اس کے مصنف غیاث اللغات لکھتے ہیں "بیگم" بکسرِ
کاف فارسی زن محمودو فتح کاف فارسی بمعنی امیر۔ من لغات
ترکی" اگر بفرض محال اس کو باضم مان لیا جائے تو بھی کوئی

حرج نہیں۔ قدما میں اختلافِ توجیہ کو بڑا عیب نہ سمجھتے تھے۔
آتش، ناسخ، غالب وغیرہ کے زمانہ تک یہ جائز تھا۔ غالب
کا شعر ملاحظہ ہو

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

"صاحب"۔ رب۔ سب وغیرہ کا ہم قافیہ رکھا گیا ہے۔ حالانکہ
صاحب بکسرِ حائے حطی صحیح ہے اور بفتح غلط ہے۔"

یعنی آسی صاحب کے نزدیک بھی آتش کا شعر اور جواب دونوں صحیح ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے غیاث اللغات میں مندرج بیگم کے تلفظ و معنی سے متعلق کچھ نہیں کہا اور اختلافِ توجیہ کو بھی ایک عہدِ خاص تک ہی جائز مانا ہے۔ غالب کا، مثال میں دیا گیا شعر، اس کی تصدیق کرتا ہے اور یہ بات بھی صاف نہیں ہوتی کہ اگر "بیگم" صحیح ہے تو صاحب بکسر حائے حطی کیوں غلط ہے؟ پھر انہوں نے معترض سے یہ نہیں پوچھا کہ حضرت یہ بیگم بہ ضمِ گاف کہاں سے لائے؟ یہ تو خیر جملۂ معترضہ تھا۔ حالی، صحتِ الفاظ کے باب میں انشاء ہی کے پیرو معلوم ہوتے ہیں اور آسی صاحب بھی، جزوی طور پر ہی سہی، اس بات سے متفق معلوم ہوتے ہیں۔ حالی، اصل میں انیسویں صدی میں چلائی جانے والی اس روش کے خلاف ہیں جو زبان میں بہ نامِ اصلاح طہارت پسندی کا اظہار کر رہی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"لکھنؤ میں ایک صاحب نے ۱۸۹۰ء میں ایک رسالہ
شعر و سخن کے متعلق لکھا ہے اس میں کچھ اوپر پچاس لفظ
ایسے لکھے ہیں جن کو خود صاحبِ رسالہ اور اہلِ لکھنؤ
واجب الترک خیال کرتے ہیں بعضے ان میں سے خاص لکھنؤ

کے ساتھ مختص ہیں۔ اس رسالہ میں بعضے ایسے الفاظ کو
واجب الترک قرار دیا ہے جو اصل زبان کی گریمر یا قیاس
لغوی کے خلاف ہوتے اور بولے جاتے ہیں جیسے موسم بفتح
سین یا میت بفتح یا، یا نشا بروزنِ وفا کہ عربی گریمر یا لغت
کے موافق موسم بروزن مسجد اور میت بکسرہ یا اور نشاۃ
بروزن وحدت ہے لیکن فی الحقیقت یہ ایک غلطی ہے
جو اکثر ہمارے عربی دانوں کو علم لسان کی ناواقفیت سے پیش
آتی ہے۔ اُن کو یہ معلوم نہیں ہے کہ ایک زبان کے الفاظ
دوسرے زبان میں منتقل ہو کر کبھی اصل صورت پر قائم نہیں
رہ سکتے۔ الا ماشاء اللہ، دور کیوں جاؤ ہماری اُردو ہی میں
ہزاروں لفظ سنسکرت، پراکرت اور بھاشا کے داخل ہیں۔
باوجود اس کے شاذ و نادر ہی ایسے الفاظ نکلیں گے جو اپنی
اصل صورت پر قائم ہوں گے۔

حالی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اصلیت سے عدم واقفیت کے سبب اہلِ اُردو ان کو صحیح سمجھ کر بے تکلّف بولتے برتتے ہیں لیکن عربی یا فارسی جس سے کہ ان کو واقفیت ہے، اصل زبان کے خلاف برتے جانے پر معترض ہو جاتے ہیں۔ لیکن خود عربی کے بہت سے الفاظ اصل وضع کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً غش بجائے غشی۔ مسلمان بجائے مسلم وغیرہ۔ یہی حال فارسی الفاظ کا ہے۔ اپنی بحث کا اختتام وہ ان الفاظ پر کرتے ہیں

بات یہ ہے کہ ایسے لفظوں کو جو کہ عربی یا فارسی یا انگریزی
سے اردو میں لیے گئے ہیں اور اصل وضع کے خلاف عموماً
مستعمل ہوتے ہیں یہ سمجھنا ہی غلطی ہے کہ وہ موجودہ

صورت میں عربی یا فارسی یا انگریزی کے الفاظ ہیں نہیں بلکہ
ان کو اردو کے الفاظ سمجھنا چاہیے۔ جو اصل کے لحاظ سے
عربی یا فارسی یا انگریزی سے ماخوذ ہیں [۵۳]"

حالی کا یہ خیال نیا نہ سہی لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے پہلے نظریہ ساز نقاد نے اس طرف خاطر خواہ توجہ صرف کی اور نام نہاد ناقدین کی غیر منطقی تاویلات اور دلائل کے خلاف آواز بلند کی جسے مابعد عہد میں سیّد سلیمان ندوی نے توسیع دی اور ان کے بعد رشید حسن خاں صاحب اور شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے جس کی طرفداری کی۔

ہر زبان کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ وہ دخول الفاظ کو اپنے مذاق و معیار کے مطابق استعمال کرتی ہے۔ ایسے میں ایک سامنے کا سوال ہے کہ اگر عربی اور فارسی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنے مزاج، مذاق اور معیار کے مطابق ڈھال لے اور ڈھلے ہوئے الفاظ کو معرب و مفرس کا نام دے لے تو یہ حق اردو کو کیوں حاصل نہیں کہ وہ دیگر زبانوں کے الفاظ کو اپنے مذاق اور تلفظ کے نظام کے مطابق ڈھالے یعنی انہیں مورد بنائے۔ تماشا یہ ہے کہ یہ پابندیاں اور اعتراض نہ اہلِ عرب نے کیا ہے نہ اہلِ عجم نے کہ صاحب آپ ہمارے الفاظ کو کیوں بگاڑ رہے ہیں۔ یہ اعتراض یا احتیاط یا امتیازی سلوک کی سفارش خود اہلِ اُردو نے کی ہے۔ پھر ایسا بھی نہیں کہ ہم نے ہر دخیل لفظ کو اصل کے مطابق استعمال کیا ہو۔ ہم نے سنسکرت، انگریزی، یونانی، ہندی اور دوسری زبانوں کے انگنت الفاظ کو مورد کیا ہے اگر ہمیں دیگر زبانوں کے الفاظ کو مورد کرنے کا حق حاصل ہے تو عربی، فارسی اور ترکی کو کیوں نہیں؟ حالی نے اردو معاشرے کو اس کی اصل سے آشنا کرایا جس کی اس اصلاح پسندی اور طہارت پسندی کے عہد میں اشد ضرورت تھی۔ متروکات کی فہرستیں مرتب کرنے والے زبان کو مصنوعی بنا رہے تھے۔ تکلف اور تصنع زبان سے اس کا فطری

حسن چھین لینے کے درپے تھا۔

حالؔی کو اندیشہ تھا کہ اتنی وضاحت کے باوجود اغلاطِ عام باقی رہنے کے امکان ہیں اور الگ دکھائی دینا چاہنے والوں کی طہارت پسندی پھر مین میکھ نکالے گی اس لیے انہوں نے عام اور عوام کی غلطی کے باب میں مزید وضاحت کی اور لکھا کہ:

> ''جو غلط الفاظ خاص و عام دونوں کی زبان پر جاری ہو جائیں وہ عام غلطی میں داخل ہیں ایسے الفاظ کا بولنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ صحیح بولنے سے بہتر ہے۔ ہاں جو غلط الفاظ صرف عوام اور جہلا کی زبان پر جاری ہوں نہ کہ خواص اور پڑھے لکھوں کی زبان پر البتہ ایسے الفاظ کو ترک کرنا واجب ہے[۹]۔''

یہاں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ ''عام'' کون ہیں؟ سیدھا سا جواب یہ ہے کہ اردو کے اہلِ علم عام کہیں گے۔ اس میں دہلی اور لکھنؤ کی تخصیص بے معنی ہے۔ اس ضمن میں صرف دو مثالیں ملاحظہ کر لیں۔ پہلا لفظ ہے ''مشکور'' اکثر اساتذہ نے اس لفظ کو ممنون کے معنوں میں غلط قرار دیا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ اور نوراللغات کے مطابق بھی یہ استعمال غلط ہے، لیکن شبلی کا مشہور شعر ہے

> آپ کے لطف و کرم سے مجھے انکار نہیں
> حلقہ در گوش ہوں، ممنون ہوں، مشکور ہوں میں

شبلی، مکتوباتِ امیر مینائی، مرتبہ مولوی محمد احسن اللہ خاں ثاقبؔ، پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

> بہرحال جو خدمت ہمارے دوست نے اُردو علم ادب کی کی ہے، اہلِ زبان اس کے ہمیشہ مشکور ہوں

گے تھے۔

امیرؔ مینائی، زاہدؔ کو ایک خط مرقومہ ۱۳ جنوری ۱۸۹۲ء میں لکھتے ہیں

"امیر اللغات میں مدد لینے سے ہاتھ نہ روکو یعنی جو کچھ ہو سکے وہ لکھا کرو اور ممنون و مشکور کیا کرو"۔

اس باب میں علامہ سید سلیمان ندوی کا قول بھی دیکھ لیں، وہ لکھتے ہیں

"عربی میں 'مشکور' اس کو کہتے ہیں جسکا شکریہ ادا کیا جائے، مگر ہماری زبان میں اس کو کہتے ہیں جو کسی کا شکریہ ادا کرے، اسی لیے بعض عربی کی قابلیت جتانے والے، اس کو غلط سمجھ کر صحیح لفظ شاکر یا متشکر بولنا چاہتے ہیں مگر ان کی یہ اصلاح شکریے کے ساتھ واپس کرنا چاہیے"۔

معلوم نہیں ہمارے عالموں اور نقادوں کی نظر میں امیرؔ مینائی، شبلی اور سید سلیمان ندوی کا مقام اور مرتبہ کیا ہے اور ان کی رائے میں انہیں اہلِ علم کا درجہ حاصل ہے کہ نہیں اور ہماری قائم کردہ تعریف کے مطابق وہ "عام" ہیں کہ نہیں۔ ہماری رائے میں تو یہ حضرات نہ صرف معتبر و مستند ہیں بلکہ ایسے ابواب میں ان کا کہا اور کیا قابلِ تقلید ہے۔

دوسرا لفظ قرآن/قران ہے۔ ہمارے یہاں یہ لفظ دونوں طرح مستعمل ہے۔ یعنی قرآن بھی اور قران بھی۔ میرؔ کا مشہور شعر ہے

مت مانیو کہ ہوگا یہ بے درد اہلِ دیں
گر آوے شیخ پہن کے جامہ قران کا

ہمارے عہد کے ممتاز شاعر محمد علوی نے لکھا ہے

منہ زبانی قران پڑھتے تھے
پہلے بچے بھی کتنے بوڑھے تھے

اس ضمن میں مزید تفصیلات کے لیے رشید حسن خاں صاحب کی کتاب ''زبان اور قواعد'' دیکھی جا سکتی ہے۔ نقوشِ سلیمانی اور شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی کتاب ''اردو کا ابتدائی زمانہ'' کا مطالعہ بھی مفید مطلب ثابت ہو سکتا ہے۔

حالی نے ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:

> ''اہلِ لکھنؤ جو زبان کے دائرہ کو روز بہ روز تنگ کرتے جاتے ہیں یہ امر مقتضائے وقت کے بالکل خلاف ہے۔''[۴۱]

اس سے بعض حضرات نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ حالی لکھنوی شعرا یا لکھنؤ کے خلاف ہیں۔ یہ بالکل غلط نتیجہ ہے۔ حالی ہمارے پہلے نظریہ ساز نقاد ہیں۔ انہوں نے زبان اور موضوع کو الگ الگ کر کے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بات یقیناً بحث طلب ہے یہ دونوں الگ الگ ہیں کہ نہیں، لیکن عملی اور اطلاقی تنقید میں انہوں نے زبان پر جس طرح توجہ کی ہے اس کی اوّلیت اور اہمیت سے انکار کرنا انصاف کو منہ دکھانا ہے۔ اس عمل میں وہ لکھنؤ کے بعض شعرا کے موضوعات کو تو ناپسند کرتے ہیں لیکن ان کی زبان کی تعریف کرتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ تعریف کرتے ہیں بلکہ اتباع کرنے کی سفارش بھی کرتے ہیں۔ شعری زبان کی تفہیم کے لیے وہ اہلِ زبان کی صحبت کو مقدم مانتے ہیں لیکن دور دراز علاقوں میں رہنے والوں کو وہ اساتذہ کے دواوین دیکھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ دلّی اور لکھنؤ کے شعرا کی ایک فہرست دینے کے بعد وہ لکھتے ہیں

> ''اور سب سے زیادہ اہم اور ضروری خلیق، ضمیر، انیس، دبیر اور مونس وغیرہ کے مرثیوں کا مطالعہ ہے۔''[۴۲]

ظاہر ہے کہ سارے شاعر لکھنؤ کے ہیں۔ اس لیے یہ بات بے بنیاد ہے کہ انہیں لکھنوی شعرا سے کد ہے۔ ہاں وہ اس کے آگے یہ ضرور لکھتے ہیں کہ

> اگرچہ بعضے دیوان اور مثنویاں جن کا اوپر ذکر کیا گیا سراسر لغو

> خیالات اور بیہودہ مضامین سے بھری ہوئی ہیں لیکن جو لوگ
> محض زبان سے غرض رکھتے ہیں ان کو خیالات کی لغویت
> اور مضامین کی بیہودگی سے چشم پوشی اور اغماض کرنا چاہیے
> اور نہایت صبر و تحمل کے ساتھ الفاظ و محاورات اور طرزِ
> ادا اور اندازِ بیان پر ہمت مقصود رکھنی اور خذ ما صفا و دع ما کدر
> پر عمل کرنا چاہیے۔ نظم کے علاوہ اُردو لٹریچر میں جس قدر علمی،
> تاریخی، مذہبی اور اخلاقی مضامین پر مستند اہلِ زبان نے
> کتابیں لکھی ہیں، ان سے بھی فائدہ اٹھانا چاہیے[۵۱]۔"

حالی بنیادی طور پر شاعری کو فن کے بجائے سوسائٹی کی ترقی کے لیے وقف کرنا چاہتے تھے لیکن وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ شاعری کی فنی سطح بھی کمزور نہ ہو۔ حالی اور ترقی پسند ناقدین میں یہی فرق ہے۔ حالی جہاں مقصدی ادب کو بھی فنی سطح پر ارفع و اعلیٰ دیکھنے کے متمنی ہیں وہاں ترقی پسند مقصدیت کی دُھن میں فنی تقاضوں کو یکسر نظرانداز تک کرنے کی حمایت کر بیٹھتے ہیں۔ خیر، حالی موضوع اور زبان میں تفریق کرتے ہیں۔ انہیں غزل وغیرہ کے فرسودہ مضامین پسند نہیں ہیں لیکن وہ متوقع و مطلوب مضامین کو عمدہ زبان میں، جسے لکھنؤ کی زبان بھی کہہ سکتے ہیں، دیکھنے کے متمنی تھے۔ انہوں نے جن شعرا کا مطالعہ خصوصی توجہ کے ساتھ کرنے کا مشورہ دیا ہے آپ نے دیکھا وہ سبھی مرثیہ گو ہیں۔ مقصدی ادب اپنی مقصد براری کے لیے بیانیہ اسلوب پسند کرتا ہے اور مرثیہ بیانیہ شاعری کی بہترین مثال ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ حالی لکھنؤ یا لکھنویت کے خلاف نہیں تھے لیکن وہ اپنے مقصد اور اپنی منزل سے نظر ہٹانے کو بھی تیار نہیں تھے۔ حالی کا ماننا تھا کہ نیچرل شاعری کے لیے ان کے عہد کی مروج و موجودہ زبان کافی نہیں اس لیے اس میں وسعت پیدا ہونی چاہیے۔ اور لکھنؤ کے شعرا اس کا دائرہ متروکات کی فہرستوں کی معرفت روز بہ روز تنگ کر رہے تھے۔ یہاں اس غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ متروکات اور بے جا پابندیوں کا ناسخ سے

کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ اس کے اصل واضع ناسخ کے شاگرد میر علی اوسط رشک تھے۔ اس کی تفصیل کے لیے رشید حسن خاں صاحب کی کتاب "انتخابِ کلامِ ناسخ" (مطبوعہ انجمن ترقی اردو، پاکستان، پہلی اشاعت ۱۹۹۶ء) کے مقدمے کا مطالعہ مفید مطلب ثابت ہوگا۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا، بات حالی کی تھی۔ سچائی یہ ہے کہ "نیچرل شاعری" کے لیے ہی نہیں شاعری کے لیے ہی زبان کی وسعت درکار ہے۔ زبان میں جتنی وسعت ہوگی اظہار میں بھی اتنی ہی وسعت ہوگی۔ کاش حالی نے جب مغرب کی پیروی کا حکم دیا تھا اس وقت اس پیروی کو صرف "موضوع" تک ہی محدود نہ رکھا ہوتا اس پیروی کو لغت کے باب میں بھی جوڑ دیا ہوتا تو اردو الفاظ کے ذخیرے میں بھی ویسی ہی وسعت پیدا ہو جاتی جیسی انگریزی زبان میں ہے۔ حالی کی بھی تو مغرب سے مراد انگریزی اور انگریز ہی تھی۔ حالی نے اپنے مقدمہ میں "زبان کو درستی کے ساتھ استعمال کرنا" کا عنوان قائم کر کے جس طرح طویل بحث کی ہے اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی وہی شعری اسلوب اور انداز مستحسن ہے جس میں زبان اپنے مرتبے سے نہ گرے۔ میر کی انہوں نے جس طرح تعریف کی ہے اور جس طرح انہوں نے مرزا داغ کی تحسین کی ہے، اس سے بہ آسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ حالی کا زبان کے متعلق کیا سوچنا تھا۔ میر زبان و بیان کے عاشق اور ایسے عاشق کہ بلند سے بلند معنی کے لیے بھی زبان کا اسلوب چھوڑنا گوارا نہیں کرتے اور داغ تو زبانِ اُردو کے وہ عاشق ہیں جو صاف کہتے ہیں

کہتے ہیں اسے زبانِ اُردو
جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

جا چکا اے داغ سب مال و متاع
شکر ہے لطفِ زباں باقی رہا

مقدمے کی اشاعت ۱۸۹۳ء میں ہوئی اور اس کے کوئی تین برس بعد ۱۸۹۶ء میں

"یادگارِ غالب" شائع ہوئی۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حالؔی شعری زبان اور ہیئت پر کس قدر گہری نظر رکھتے تھے۔ تفصیل کے لیے "یادگارِ غالب" کا وہ حصہ ملاحظہ کیجیے جس میں حالؔی نے میرؔ اور مومنؔ یا میر درد اور داغؔ کے اشعار سے بحث کی ہے۔ حالؔی نے وہاں اس امر کا اقرار کیا ہے کہ متاخرین شعرا نے، جو تقلید کی زنجیروں میں جکڑے رہنے کے لیے تیار نہیں تھے، انھوں نے فارسی شاعری سے استفادہ کیا۔ "متاخرین کے لیے اہلِ ایران کا نمونہ موجود تھا اس لیے نئی طرز کے ایجاد کرنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ جو طرز فارسی میں متاخرین نکال چکے تھے اس کو ریختہ میں ڈھالنا تھا[۱۰]۔" لیکن وہ اس امر کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ متن بر متن کے عمل میں ان شعرا (غالبؔ، مومنؔ، شیفتہؔ، تسکینؔ، مالکؔ، عارفؔ، داغؔ وغیرہ) کے گروہ نے "قدما کے سیدھے سادے خیالات اور معمولی اسلوبوں میں کس قسم کی نزاکتیں اور لفظی و معنوی تصرّفات کر کے ان میں ندرت اور طرفگی پیدا کی ہے[۱۱]۔" یعنی حالی نے صاف کہا ہے کہ قدیم خیال کو جب نئی زبان میں کہیں گے تو معنی میں بھی اضافہ ہوگا۔ بہ الفاظِ دیگر حالؔی یہ کہتے ہیں کہ لفظی تصرّف معنوی تصرف بھی ہے۔ حالؔی نے یہ بات مقدمے میں بھی کہی ہے۔ وہ کعب ابن زہیر کا قول نقل کرتے ہیں

مَا اَرَانَا نَقُولُ اِ لَا مُعاراً

اَو مُعاراً مَن قَو لِنا مَکرو راً

(یعنی ہم جو کچھ کہتے ہیں یا تو اوروں کے کلام سے مستعار لے کر کہتے ہیں یا اپنے ہی کلام کو بار بار دہراتے ہیں[۱۲])

اور دوسری جگہ عربی کی دو متناقض مثالیں نقل کرتے ہیں: کَم تَرَکَ الاوّ لُ لِلاٰخِر (یعنی اگلے بہت کچھ پچھلوں کے لیے چھوڑ گئے ہیں) اور دوسری مثل ہے: مَاتَرَکَ الاَوّلُ للاٰخِر

(یعنی اگلوں نے پچھلوں کے لیے کچھ نہیں چھوڑا[۱۳]۔ جب ہم پہلے کے کہے (وہ

اپنا کہا ہوا ہو کہ دوسرے کا کہا ہوا) ہوئے ہی کو دہرائیں گے تو وہ کیا چیز ہے جو ہمیں ماقبل و معاصر سے مختلف کرے گی۔ ظاہر ہے کہ وہ زبان ہی ہوگی جو ہمیں ان سے مختلف بھی کرے گی اور منفرد بھی لیکن اگر زبان کا تصور وہی ہے جس پر ہم بحث کر رہے ہیں تو انفرادیت کا حصول ممکن ہی نہیں۔ شاعر اپنے اظہار کے لیے لفظ تلاش کرتا ہے۔ الفاظ کا نیا انسلاک ہی تو اس کی انفرادیت کا پتہ دیتا ہے۔ حالی اس سے بخوبی واقف ہیں چنانچہ وہ مقدمے میں "شاعری کے لیے کیا کیا شرطیں ضروری ہیں" کے باب میں تیسری شرط تفحص الفاظ بتاتے ہیں اور لکھتے ہیں۔

> "شعر کی ترتیب کے وقت اوّل متناسب الفاظ کا انتخاب کرنا اور پھر ان کو ایسے طور پر ترتیب دینا کہ شعر سے معنی مقصود کے سمجھنے میں مخاطب کو کچھ تردّد باقی نہ رہے اور خیال کی تصویر ہو بہو آنکھوں کے سامنے پھر جائے اور باوجود اس کے اس ترتیب میں ایک جادو مخفی ہو جو مخاطب کو مسخر کرلے.... اگر شاعر زبان کے ضروری حصہ پر حاوی نہیں ہے اور ترتیب شعر کے وقت صبر و استقلال کے ساتھ الفاظ کا تتبع اور تفحص نہیں کرتا تو محض قوت متخیلہ کچھ کام نہیں آسکتی۔"[۲۲]

یعنی حالی نے یہاں الفاظ کے انتخاب اور انسلاک کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ محض قوت متخیلہ سے شاعری ممکن نہیں۔ اسی طرح وہ ابنِ خلدون کے قول پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> - ہم یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ شاعری کا مدار جس قدر الفاظ پر ہے اس قدر معانی پر نہیں۔ معنی کیسے ہی بلند اور لطیف

ہوں اگر عمدہ الفاظ میں بیان نہ کیے جائیں گے ہرگز دلوں
میں گھر نہیں کر سکتے"۔

حالی کے اس خیال کے ثبوت میں ہم میر انیس کا کلام دیکھیں تو بات آئینہ ہو جاتی ہے۔ انیس جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ سب کو معلوم ہے اور ان کے معاصرین بھی وہی بات کہہ رہے ہیں، پھر وہ کیا چیز ہے جو مرثیہ کہنے والوں میں انیس کو ممتاز و منفرد کرتی ہے۔ انیس کی زبان ایسی سادہ (بہ معنی سہل الفہم) بھی نہیں، ویسے میر بھی ایسے سہل الفہم کب ہیں لیکن یہ ایک الگ بحث ہے جس کا یہاں موقع نہیں ہے۔ ٹھیک یہی بات نواب مرزا شوق کی مثنویوں کے متعلق مکرر مطالعہ کے وقت کہی جا سکتی ہے۔ یہ ان حضرات کی زبان ہی تو ہے جو ہمیں ان کو بار بار پڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔ حالی مرزا شوق کی مثنویوں کے موضوعات پر معترض ہیں لیکن ان کی زبان اور ان کے بیان کے معترف ہیں ورنہ ان کی مثنویوں کے مطالعہ کا مشورہ کیوں دیتے؟

حالی ہمارے پہلے نقاد ہیں جو استاد و شاگرد کے رشتوں اور اصلاح کی روایت پر تبصرہ کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں "شاعر بننے کے لیے سب سے اوّل سبق استعداد اور پھر نیچر کا مطالعہ اور اس کے بعد کثرت سے اساتذہ کا کلام دیکھنا اور ان کے برگزیدہ کلام کا اتباع کرنا اور اگر میسّر آئے تو ان لوگوں کی صحبت سے مستفید ہونا جو شعر کا صحیح مذاق رکھتے ہوں"۔ "یعنی" "استاد" ایک ایسا حرف غلط ہے جس کا وجود شعری زبان کے ارتقا اور توسیع میں سدّ راہ ہے۔ حالی لکھتے ہیں

ہمارے ملک میں جو شاعری کے لیے ایک استاد قرار دینے کا
دستور اور اصلاح کے لیے ہمیشہ اس کو اپنا کلام دکھانے کا
قاعدہ قدیم سے چلا آتا ہے اس سے شاگردوں کے حق میں
کوئی معتدبہ فائدہ مترتب ہونے کی امید نہیں ہے۔ استاد

> شاگرد کے کلام میں اس سے زیادہ اور کیا کرسکتا ہے کہ کوئی گریمر کی غلطی بتادے یا کسی عروضی یا لغزی کی اصلاح کردے لیکن اس سے نفس شعر میں کچھ ترقی نہیں ہوسکتی۔ رہی یہ بات کہ استاد شاگرد کے پست کلام کو بلند کردے یا شاگرد کو اپنا ہمسر بنادے سو یہ امر خود استاد کی طاقت اور اختیار سے باہر ہے۔ اگر استادوں میں شاگردوں کو اپنا ہمسر بنانے کی طاقت ہوتی تو ملاّ نظامی صاحبزادہ کو یہ نصیحت نہ کرتے ''در شعر مجو بلند نامی+کایں ختم شدست بر نظامی'' اور اگر کمال شاعری کے لیے کسی کا تلمذ اختیار کرنا ضروری ہوتا تو سنائی۔ نظامی۔ سعدی۔ خسرو اور حافظ کے ضرور ایسے استاد نکلتے جن کی شہرت شاگردوں سے زیادہ نہیں تو ان کے برابر یا ان سے کمتر تو ہوتی ۳۲؎''

اگر ذہن صاف ہے تو حالی کی اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ استاد شاگرد کی شعری صلاحیتوں میں کچھ بھی اضافہ نہیں کرسکتا ہاں اسے ان قواعد سے ضرور آشنا کرواسکتا ہے جسے عرف عام میں ''فن'' کہتے ہیں۔ لیکن استادوں کی پاپوش برداری نے ہماری شعری زبان کی فطری نشو و نما کو نقصان ہی پہنچایا ہے۔ کیوں کہ استاد کا تفاعلی مطلب کم از کم اس باب میں ٹھہرنا ہی ہوتا ہے کسی قاعدہ پر ٹکے رہنا ہوتا ہے اسی کو حرف آخر سمجھنا اور سمجھانا ہوتا ہے۔ جبکہ شاعری مسلسل سفر کا نام ہے۔ قاعدے شاعری کے لیے ہوتے ہیں شاعری قاعدوں کے لیے نہیں ہوتی۔ قاعدوں کی سخت پابندیوں کے فیض ہی سے تو ہمارا کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جس کے کلام میں سے ہمارے نام نہاد ناقدین نے غلطیاں نہ نکالی ہوں۔ کسی کے یہاں سے کم تو کسی کے یہاں سے زیادہ۔ زبان و بیان کی جکڑ بندیوں نے

ہماری شعری زبان کو کچھ ایسا مقید کر رکھا ہے کہ ہم ذرا سی تازگی اور تجربے پر ناک بھوں سکیڑتے ہیں۔ آہنگ کے تصور کو عروض کی آنکھ سے دیکھنے کی موذی عادت کے سبب ہی تو ہمارا معاشرہ آج بھی راشد اور میرا جی کی نظموں سے وہ حظ حاصل نہیں کر پاتا جو ایک معمولی مشاعرہ باز شاعر کے کلام سے اسے مل جاتا ہے۔ حالی کا احتجاج ایسے تمام رویوں کے خلاف تھا جو شاعر کی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار آنے میں رخنہ اندازی کرتے ہوں۔ انہوں نے وزن اور قافیے کے متعلق بھی بحث کی ہے لیکن وہ ہمارا موضوع نہیں۔ ہمارا موضوع تو شعری زبان ہے۔ مندرجہ بالا بحث سے یہ بات ظاہر ہوگئی ہوگی کہ اگر حالی نے اُس وقت یہ آواز بلند نہ کی ہوتی تو ہماری شعری زبان اساتذہ کی خشمگیں آنکھوں کے اشارے سے آگے نہ بڑھی ہوتی۔

مقدمے میں اخذ، استفادہ اور اکتساب ہے۔ حالی اس کے حوالے سے عربی و عجمی شعری روایتوں سے اُردو کا رشتہ استوار کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اُردو کی انفرادیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ پھر ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ حالی تنقید کی کتاب نہیں اپنی شاعری کا مقدمہ لکھ رہے تھے۔ جس میں شاعر اپنے تخلیقی تقاضوں اور تنقیدی شعور کو بروئے کار لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

حواشی

۱۔ مقدمہ شعر و شاعری از خواجہ الطاف حسین حالی، ص ۱۳۴، لالہ رام نرائن بک سیلر الہ آباد، ۱۹۳۱ء

۲۔ ایضاً، ص ۱۳۵

۳۔ ایضاً، ص ۱۳۵ تا ۱۳۶

۴۔ ایضاً، ص ۱۴۱

۵۔ دریائے لطافت، مترجمہ علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی، ص ۲۶۴، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی ۱۹۸۸ء

۶۔ "تذکرہ معرکہ سخن" از عبدالباری آسی، ص ۳، پبلشر نارمک ایجنسی لکھنؤ، ۱۹۳۴ء

۷۔مقدمۂ شعر و شاعری، ص ۱۴۲

۸۔مقدمۂ شعر و شاعری، ص ۱۴۴۔۱۴۵

۹۔ایضاً، ص ۱۴۵

۱۰۔مکتوبات امیر مینائی، ص ۳۱۵

۱۱۔مکتوبات میر مینائی از مولوی محمد احسن اللہ خاں ثاقب۔ ص ۱۵۱، میرے کتب خانہ کے نسخہ میں پریس لائیں والے صفحات موجود نہیں ہے۔ لیکن یہ اشاعتِ اوّل نہیں ہو سکتی کیوں کہ اس میں شبلی کا رو یو شاملِ اشاعت ہے۔

۱۲۔نقوشِ سلیمانی، ص ۹۸

۱۳۔مقدمۂ شعر و شاعری، ص ۱۴۲

۱۴۔ایضاً، ص ۱۳۹

۱۵۔ایضاً، ص ۱۳۹

۱۶۔یادگارِ غالب از حالؔی، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء، ص ۱۲۲

۱۷۔مقدمۂ شعر و شاعری، ص ۱۸۰

۱۸۔ایضاً، ص ۱۸۰

۱۹۔ایضاً، ص ۱۸۱

۲۰۔ایضاً، ص ۶۲۔

۲۱۔ایضاً، ص ۶۸

۲۲۔ایضاً، ص ۱۱۷ تا ۱۱۸

۲۳۔ایضاً، ص ۱۱۷

لُدمیلا وسیلیوا
ترجمہ اسامہ فاروقی

نیک نفس باغی

الطاف حسین حالی۔روشن خیال شاعر

(ماسکو،۱۹۹۷ء)

الطاف حسین حالی کی سرگذشت بہتیری دیگر ممتاز شخصیتوں کی، قوتِ محرکہ، واقعات کے پیچ وخم اور میرِ افسانہ کی پر جوش ترنگوں سے بھرپور دلچسپ سوانح حیات سے مختلف ہے۔ بادی النظر میں حالی کی زندگی خاصی پرسکون اور باقاعدہ دکھائی دے سکتی ہے، جیسی کہ اکثر متوازن اور منکسر المزاج لوگوں کی ہوتی ہے۔ لیکن اس ظاہری ضبطِ نفس کے پردے کے پیچھے ایک جوشیلی، یا یوں کہیے، باغیانہ سرشت پوشیدہ تھی، جو وقتاً فوقتاً نمودار ہو ہی جاتی اور پانی پت کے اس متقی متوطن کو بادی النظر میں بالکل غیر متوقع اقدام پر اکساتی اور جو ساری زندگی ان کے عقائد کے دفاع میں ان کی ممد ومعاون رہی۔

ا۔حالی کا وطن۔ماضی اور حال:

مشہور لوگوں کی زندگی کی کہانی عموماً ان کے وطن کے تذکرے سے شروع ہوتی

ہے۔ بار بار آگے چل کر نام کمانے والا شخص ایسے شہر میں پیدا ہوتا ہے جو پہلے ہی سے کسی شخص کے حوالے سے شہرت کا حامل ہے اور بر غیر معمولی بصیرت کے اس پُر اسرار جوہر روحانی کی مبارک فرودگاہوں کے بارے میں زمانہ قدیم سے چلا آرہا عوام کا عقیدہ لوگوں کو یاد آتا ہے جس سے یہاں پیدا ہونے والے بعض خوش قسمت سرفراز کیے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس زیادہ تر معمولی سا دور افتادہ مقام یہاں تولد ہونے والے صاحب بصیرت ہی کی بہ دولت ساری دنیا میں مشہور ہو جاتا ہے۔

روشن خیالی کے علم بردار اور شاعر الطاف حسین حالی کے مقام پیدائش پانی پت کو برِ صغیر ہند و پاک کی تاریخ کے صفحات پر ان کی ولادت کے سیکڑوں سال قبل جگہ تو ضرور ملی لیکن یہاں سے تعلق رکھنے والی معروف شخصیتوں کی بہ دولت اتنی نہیں جتنی ان تین مشہور جنگوں کی وجہ سے جن میں ہر ایک کو بڑی حد تک ہندستان کی قسمت کے لیے فیصلہ کن قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ تین تاریخی جنگیں گویا کہ تاریخ کے وہ اہم موڑ ہیں جو عہدِ وسطیٰ کے ایشیا کی نہایت طاقت ور مملکتوں میں سے ایک یعنی ہندستان کی مغلیہ سلطنت کے قیام، عروج اور زوال کی نشان دہی کرتے ہیں اور ان سبھی کو جنگِ پانی پت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سنہ ۱۵۲۶ء میں پانی پت کے مغرب میں پھیلی ہوئی وسیع اور مسطح وادی میں دہلی کے حکم راں ابراہیم لودھی اور ترک سپہ سالار ظہیر الدین محمد بابر کی افواج کا مقابلہ ہوا۔ موخر الذکر کے نام سے اکثر واقف ہیں۔ تیمور کے سلسلے کا ایک فرد، فرغانہ کا سابق حکمراں، جس کو کسی زمانے میں سائبیریا سے آکر بس جانے والے ترکوں نے وطن چھوڑنے پر مجبور کیا اور جوہرات کے حکمران تیموری نسل سے تعلق رکھنے والے اپنے رشتہ دار کی مدد سے افغانستان کے وسیع علاقے پر قابض ہو گیا تھا، جس نے کابل کو اپنا گڑھ بنالیا تھا اور جو یہاں سے اپنے پڑوسیوں پر ان کے علاقوں پر قبضے کی غرض سے حملہ آور ہوا کرتا تھا۔ آج ہم بابر کو ایک مشہور شاعر، علم وفن کے بڑے قدر دان اور ایک شاندار ادبی و علمی ورثے کے مصنف

کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن بابر سب سے مقدم ایک سپہ سالار تھا جس کی فوجی صلاحیت کا ثبوت وہ متعدد کامیابیاں ہیں جو اس کی افواج نے حاصل کیں۔ جنگِ پانی پت میں بابر کی فتح سے شمالی ہند میں اس کے تسلط کو استواری ملی۔ اس نے ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد ڈالی اور وہی مغلیہ سلطنت کے شاہی سلسلے کا مورثِ اعلیٰ ہے۔

اس طرح ۱۵۲۶ء کی پہلی جنگِ پانی پت کا راست تعلق ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کے اس شاہی سلسلے کے قیام سے ہے، جس کی حکومت ۱۸۵۷ء کی اس عظیم بغاوت تک برقرار رہی، جس کو تاریخ میں ''سپاہیوں کے غدر'' کا نام دیا جاتا ہے۔

سیاسی صورتِ حال کے نقطۂ نظر سے مغلیہ سلطنت عہد وسطیٰ کی مملکتوں میں کسی استثنائی حیثیت کی حامل نہیں تھی اس میں بھی وقفے وقفے سے تختِ شاہی کے لیے کش مکش جاری رہتی۔ سلطنت کے وجود کے تیسویں سال یہ کش مکش غیر معمولی شدت کے ساتھ شروع ہوگئی۔ قسمت کے بہتیرے الٹ پھیر کے بعد بابر کے تیرہ سالہ پوتے کو تخت پر بٹھایا گیا۔ اس کا اتالیق، ترکمان بیرم خان، نابالغ مغلِ اعظم کا قائم مقام برقرار رہا اور کئی سال تک ملک پر در حقیقت اسی کی حکمرانی رہی۔

اس زمانے میں ان افغان جاگیرداروں کے سپہ سالار ہیمو کو جو پہلے سے ہندوستان کے مشرقی صوبوں بہار اور بنگال پر قابض تھا، مغلوں کے اصل مخالف کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ ہندوؤں کی بقال ذات کا ایک فرد ہونے کے باوجود ہیمو جنگ کے میدان میں ایک امتیازی حیثیت کا حامل تھا، اس نے مغلوں کی فوجوں کے مقابلے میں متعدد شاندار کامیابیاں حاصل کی تھیں اور ایک مختصر سی مدت کے لیے دہلی پر قابض بھی رہ چکا تھا۔

۱۵۵۶ء میں پانی پت کے میدان میں مغلیہ تختِ شاہی پر قبضے کے لیے اکبر اور ہیمو کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں۔ قسمت نے کم سن مغل کی فوج کو دشمن پر فتح حاصل کرنے میں مدد کی۔ جب ہیمو کی فوج تعداد میں زیادہ مغل فوج کے میمنہ و میسرہ کو روند

کر لگتا تھا کہ فتح کے قریب ہے، ہیمو آنکھ پر تیر کا زخم کھا کر جنگی ہاتھی پر سے گر گیا۔ اس سے بھاڑے کی فوج کی صفوں پر دہشت اور گھبراہٹ طاری ہوگئی کیوں کہ تنخواہ کا ملنا سپہ سالار کی زندگی پر منحصر تھا۔ ہیمو کے بہتیرے سپاہی میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے اور صورتِ حال پر قابو پا کر اکبر نے میدان مار لیا۔

اکبر کا تقریباً نصف صدی پر محیط عہدِ حکومت (۱۶۰۵ء۔۱۵۶۵ء) وسیع و عریض مغل سلطنت کے انتہائی فروغ و اقبال کا دور تھا۔ (یہ وہی اکبر ہے جسے جواہر لال نہرو نے "دانش مند مطلق العنان فرماں رواں" کا نام دیا تھا)۔

اٹھارویں صدی عیسویں میں مغل سلطنت کا ایک خوف ناک مدِ مقابل معرضِ وجود میں آیا۔ یہ تھیں حلیف مرہٹہ ریاستیں جن کا سرگروہ پیشوا کہلاتا تھا، جسے ان متحدہ مرہٹہ ریاستوں کے سیاسی اور فوجی سربراہ کی حیثیت حاصل تھی۔ اکبر کی وفات کے بعد پے در پے داخلی اختلافات اور بیرونی دشمنوں سے جھڑپوں نے مغل سلطنت کو کمزور کر دیا۔ مختلف صوبے جو مغلوں کے صوبہ داروں کو تفویض تھے، یکے بعد دیگرے اپنی خود مختاری کا اعلان کرتے ہوئے سلطنت سے علاحدگی اختیار کرنے لگے۔ حقِ تخت نشینی کے لیے لگاتار جنگوں نے مرکزی حکومت کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا۔ اس کا اندازہ لگا کر مرہٹوں نے مغل سلطنت کے پایۂ تخت پر قبضے کا تہیہ کر لیا۔ لیکن اس وقت دہلی کو سلطنت کی مغربی سرحدوں کی طرف سے بھی خطرہ لاحق ہو چکا تھا۔ افغان حکمران احمد شاہ ابدالی، جو اس سے قبل بارہا ہندستان میں دخل اندازی کر چکا تھا اور دہلی کے تختِ شاہی پر اور اس کے ساتھ اپنے دور کے رشتہ داروں یعنی مغلوں کے زرخیز ملک پر قبضے کے خواب دیکھ رہا تھا، اپنی فوج کے ساتھ مغلیہ سلطنت کے دارالحکومت دہلی کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔

۱۷۶۱ء میں ہندوستان پر تسلط کے دعوے داروں کے درمیان پھر ایک جنگ لڑی گئی۔ اس بار میدانِ جنگ میں احمد شاہ ابدالی اور مرہٹہ پیشوا بالاجی باجی راؤ کی افواج ایک

دوسرے کے مقابل تھیں۔ مرہٹوں کو شکستِ فاش ہوئی لیکن احمد شاہ ابدالی کو بھی فتح بہت مہنگی پڑی۔ اس کی فوج کو کافی جانی نقصان پہنچا، سپاہیوں کی کمی کی تلافی کے لیے اسے افغانستان لوٹنا پڑا، جہاں اندرونی مسائل کو سلجھاتے ہوئے اس نے اپنی زندگی کے باقی ایام گذارے۔ احمد شاہ ابدالی کی وفات کے بعد اسکے جانشینوں کی توجہ پوری طرح اندرونی اختلافات پر مرکوز رہی اور گیارہویں صدی سے افغانستان کی طرف سے ہندستان پر بار بار ہونے والے حملوں کا سلسلہ آخر کار بند ہوا۔

اس اثنا میں برصغیر کی سبھی سلطنتوں اور ریاستوں کا سب سے زیادہ خطرناک اور مکار دشمن برطانوی استعمار "سنِ بلوغ" کو پہنچ رہا اور زور پکڑ رہا تھا۔ انگریز پُرتگالیوں کے پیچھے پیچھے ہندستان پہنچے۔ ۱۶۰۰ء میں ہندوستان کے ساتھ تجارت کے لیے انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام عمل میں آیا، جس نے آگے چل کر ملک پر قبضے کے لیے آلۂ کار کی حیثیت اختیار کرلی۔ انگریزوں نے بڑے قاعدے کے ساتھ اپنے معاشی اور سیاسی موقف کو مستحکم کرتے ہوئے ہندوستان پر حکمرانی کے خواہش مند اپنے اصلی رقیبوں یعنی پُرتگالیوں اور فرانسیسیوں کو رفتہ رفتہ بے دخل کردیا اور ہندوستانی صوبوں اور ریاستوں کو مٹھی میں لے کر انہیں اپنا زیردست بنالیا۔ جنگِ پانی پت میں مرہٹوں کی شکست سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے ہندوستان پر قبضہ بڑی حد تک سہل ہوگیا۔ ۱۷۶۱ء کی جنگِ پانی پت سے قبل مرہٹوں کی متحدہ ریاستوں کو انگریزوں کے زبردست حریف کی حیثیت حاصل تھی، اب انہیں اس حریف سے چھٹکارا مل گیا۔

"مغلوں کے اقتدارِ اعلیٰ کا تختہ ان کے صوبے داروں نے الٹا، صوبے داروں کی طاقت مرہٹوں نے توڑی، مرہٹوں کی طاقت افغانوں نے توڑی اور جب سبھی ایک دوسرے سے لڑائی لڑنے میں مشغول تھے، انگریز آدھمکا اور ان سب کو محکوم بنانے میں کامیاب رہا۔" ہندوستان کے ایک برطانوی نوآبادی میں تبدیلی کے عمل کا تجزیہ کرتے

ہوئے کارل مارکس نے ان الفاظ میں پانی پت کی تین جنگوں سے متعلق واقعات کا خلاصہ دیا ہے۔

لیکن تاریخ کے اوراق ایک اور، چوتھی، تقریباً بیس سال تک برپا رہنے والی "جنگِ پانی پت" کے بھی شاہد ہیں، جس کے بارے میں بہتر واقفیت شاید صرف ماہرینِ لسانیات ہی کو حاصل ہے کیوں کہ یہاں ذکر ہو رہا ہے ایک ادبی معرکہ آرائی کا۔ اس کی گونج آج بھی سنائی دیتی ہے اور اسی لیے وہ ہمارے معاصرین کے لیے بھی دل چسپی کی حامل اور معنی خیز ہے۔

اس چوتھی "جنگِ پانی پت" کے چھیڑنے والے اور اس کے سورما تھے پانی پت کے متوطن الطاف حسین حالی، جن کا شمار اپنے زمانے کے نہایت منکسر، نیک دل اور شائستہ لوگوں میں ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میدانِ پانی پت کا متذکرہ صدر جنگ جویانہ جوہر روحانی، پیدائش کے وقت الطاف حسین حالی میں جاگزیں ہوکر ساری عمر ان کو اپنے خوابوں اور آدرشوں کے دفاع کے لیے خاموش لیکن فیصلہ کن اور زبردست جنگ پر اکساتا رہا ہو؟

معاصرین سے مخاطب اس حیرت انگیز پانی پتی کی دھیمی آواز اس کے نظریات کے مخالفین کی غضب ناک چیخ پکار اور نعروں پر غالب آگئی اور اسکے ادبی حریفوں کے زہرخند سے کہیں زیادہ اثر انگیز ثابت ہوئی۔ الطاف حسین حالی کی مساعی سے قدیم ادبی اصول وضوابط میں سچ مچ انقلابی تبدیلیاں آئیں اور حقیقت کے ادراک کے تعلق سے ان کے ہم عصروں پر گہرا اثر پڑا۔

حالی نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ پانی پت میں گزارا۔ وہ یہیں مدفون ہیں۔

آج کل کا پانی پت دہلی کے شمال مشرق میں پچاسی کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع چھوٹا سا شہر ہے۔ ماضی کی طرح آج بھی ضلع کا یہ مستقر اپنے جغرافیائی محلِ وقوع کی وجہ سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ شمالی مشرقی ہندوستان کو مغربی علاقوں سے مربوط کرنے

والی اہم جتموں، دہلی، کلکتہ شاہ راہ پانی پت سے ہو کر گزرتی ہے۔ چوڑی شاہ راہ کی دونوں طرف پھیلے ہوئے نیچی ایک یا دو منزلہ عمارتوں اور رنگ بہ رنگے پُرشور بازاروں والے محلے شمالی ہند کے سیکڑوں دوسرے صوبائی مقامات کی مانند ہیں۔ لیکن ایسا صرف شاہ راہ پر دوڑتی ہوئی موٹر کار کی کھڑکی سے نظر آتا ہے۔ لیکن اگر اسے شاہ راہ سے کسی کچی گلی میں موڑ دیں اور شہر کے اندرون میں پہنچ جائیں تو اس کی شان دار تاریخ کے آثار دیکھے جاسکتے ہیں۔

بڑا مبالغہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ حالی کی تربت تک جانے والی پگ ڈنڈی پر وہاں خراجِ عقیدت پیش کرنے والوں کی کثرت کی وجہ سے گھانس نہیں اگتی۔ میرے خیال میں ایک شاعر اور روشن خیالی کے علم بردار کی حیثیت سے حالی کی شہرت ان کی پیدائش کے شہر میں اس کی حدود کے باہر کے علاقوں کے مقابلے میں کہیں کم ہے۔ حالی کی قبر پر حاضری دینے کے خواہش مند سیاح کو بہتیرے راہ گیروں سے استفسار کرنا اور پانی پت کے گلی کوچوں کی بھول بھلیاں میں کافی بھٹکنا پڑتا ہے اور اس کے بعد ہی وہ قلندر چوک پہنچتا ہے جہاں الطاف حسین حالی آسودۂ خاک ہیں۔

پکی شاہ راہ سے شہر کی ایک ڈھول سے اٹی تنگ گلی شروع ہوتی ہے جو پتھر سے تعمیر کی ہوئی ایک پُرشوکت محراب تک پہنچاتی ہے۔ اکبر کے عہد میں شہر کے اطراف کی فصیل میں ایسی ہی بلند محرابوں والے پانچ دروازے تھے۔ اب یہی ایک محراب رہ گئی ہے۔ کائی سے ڈھکے ہوئے پتھروں پر سیدھے سادے نقش و نگار اور مٹا مٹا سا فارسی زبان کا کتبہ اب بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ (اس زمانے میں فارسی زبان کو شمالی ہند کی سرکاری زبان کی حیثیت حاصل تھی)۔

خوانچوں اور چھوٹی چھوٹی دکانوں کی دورویہ قطاروں کے درمیان سے گزرتی ہوئی یہ گلی، تیز خوشبوؤں میں بسی ہوئی اور ہندوستان کی ان بھانت بھانت کی آوازوں کے شور میں ڈوبی ہوئی، جن میں کوئی اگر ایک بار بھی غوطہ لگائے تو اسے ان پر دوسری کسی طرح

کی آوازوں کا مغالطہ ہو ہی نہیں سکتا، وسیع و عریض قلندر چوک تک پہنچاتی ہے۔ یہ مقام پانی پت کی حدود کے باہر دور دور تک مشہور و معروف ہے۔ یہاں مشہور داعی اور شاعر بوعلی شاہ قلندر آسودۂ خاک ہیں، جنہوں نے ۱۳۲۳ء میں وفات پائی اور جن کے نام سے شہر کا یہ چوک موسوم ہے۔

حضرت بوعلی قلندر کا تعلق اس زمانے کے نہایت بااثر صوفی سلسلوں میں سے ایک یعنی چشتیہ سلسلے سے تھا، وہ اپنے نام ور ہم قلموں اور برادرانِ طریقت امیر خسرو (۱۲۵۳ء تا ۱۳۲۵ء) اور امیر حسن دہلوی (۱۲۵۳ء تا ۱۳۲۸ء) کے ہم عصر تھے۔ روایت کی رو سے بوعلی قلندر برصغیر کے اولین شاعر ہیں جنہوں نے ''نعت'' یعنی پیغمبرِ اسلام حضرت محمدؐ کی شان میں مدحیہ نظم لکھنے کی ابتدا کی۔ اس صوفی شاعر نے اپنے بہتیرے اشعار میں ہمہ گیر و عالم گیر محبت یعنی ایسے جذبے کی مدح سرائی کی ہے کہ جس سے معجزے اور کارِ عجب ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

اپنے ایک شعر میں وہ لکھتے ہیں

''زمین پر کوئی بھی ایسی جگہ نہیں جہاں محبت نہ ہو اور جہاں اس کا غم نہ ہو ''

حضرت بوعلی قلندر پانی پتی کا ان کی حیات ہی میں ایک ولی اللہ کی حیثیت سے احترام کیا جاتا تھا اور وفات کے بعد اس صوفی شاعر کی قبر پر ایک مقبرہ تعمیر کیا گیا۔ اب ان کا مزار ایک زیارت گاہ ہے جہاں اب بھی اسلامی تقاریب کے دنوں میں عقیدت مند جوق در جوق اکٹھا ہوتے ہیں۔

چھوٹے سے گنبد اور متعدد محرابوں اور برآمدوں سے آراستہ یہ اسلامی مقبرہ، طاقچوں اور بُرجیوں سے مزین اونچی دیواروں کے ایک مستطیل کے وسط میں واقع ہے۔ چوک دراصل مزار کا محض ایک وسیع و عریض آنگن ہے۔

الطاف حسین حالی کی شاہ بوعلی شاہ قلندر کے قریب تدفین میں ایک طرح کی علامتی باضابطگی کا احساس ہوتا ہے۔ تقریباً چھ صدیاں گزر جانے کے بعد ان دو شاعروں کی قبریں ایک دوسرے کے آس پاس آموجود ہوئیں جن کی بہتیری امیدیں یکساں طور پر نفس پرستی سے پاک "اعلیٰ وارفع" محبت سے وابستہ تھیں۔ فرق بس اتنا کہ چودھویں صدی کا صوفی شاعر خدائے بزرگ و برتر کے ادراک کی آرزو میں محبت سے آس لگائے ہوئے تھا جب کہ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر کے شاعر اور روشن خیالی کے علم بردار کی امیدیں اصلاحِ معاشرہ، اپنے وطن اور اپنی قوم کی ترقی سے وابستہ تھیں۔

حالی کی معمولی طول و عرض کی پتھر سے بنی ہوئی تربت اسلام سے نسبت رکھنے والے ہرے رنگ کی مخملی چادر سے جس پر آیاتِ قرآنی کڑھی ہوں، ڈھکی رہتی ہے۔ روزانہ غروبِ آفتاب سے لے کر صبح سویرے تک اور بھیگے موسم میں بھی چوک سے چند ہی قدم کے فاصلے پر واقع مسجد کے کارکن چادر کو ٹھیک ٹھاک کرتے ہیں۔ (علاقے کے تمام اسلامی مقدس مقامات کی نگرانی ان کے فرائضِ منصبی میں شامل ہے)۔ سائبان نما یلی عمارت کے عرض میں واقع شہتیر پر ایک تختی جڑی ہوئی ہے جس کے بالائی حصے پر حالی کی مشہورِ زمانہ مسدس "مدوجزرِ اسلام" کا ایک شعر خوش خط درج ہے

یہی ہے عبادت، یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

اس کے نیچے ۷۸۶ (یعنی اسلامی فقرے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے اعداد میں اظہار) کے بعد یہ عبارت خوش نما حروف میں درج ہے

"یہاں شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی آسودۂ خاک ہیں"۔

اہلِ یورپ کے کانوں کے لیے نامانوس بھڑک دار لقب خواجہ، ہندوستانی مسلمانوں کا اعلیٰ درجے کا علمی خطاب، اسلامی ممالک کے نہایت معزز افراد کا لقب، حالی کے خاندان کے مردوں کا آبائی لقب تھا، گو کہ خود حالی کو زیادہ تر محض "مولانا حالی" کہہ کر

مخاطب کیا جاتا تھا، جس سے سب سے مقدم ان کی اسلامی تعلیم پر زور دینا مقصود ہوتا تھا۔

بوعلی شاہ قلندر کی مزار پر حاضری دینے والے نوجوان زائرین مولانا حالی کی تربت پر بھی سر جھکاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے بیشتروں نے ان کے بارے میں سنا بھی نہ ہو۔ اس وسیع و عریض برِ صغیر ہند و پاک میں خدا جانے کتنے مقبرے بکھرے ہوئے ہیں، کون سبھی اولیاء کرام اور بابرکت مشائخ کے نام جان سکتا ہے!

دن گزرتے ہیں اور زمانہ ماضی کی یادیں بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ لیکن آج بھی اس چھوٹے سے شہر میں ڈھونڈنے سے ایسے لوگ مل ہی جائیں گے جنہیں بچپن میں باپ دادا سے حالی کے بارے میں سنی ہوئی کہانیاں اب بھی یاد ہیں، کیوں کہ صدی کے آغاز میں کوئی بھی پانی پتی ایسا نہ تھا جسے ہندوستان گیر شہرت کے حامل مولانا حالی کے گھر کا راستہ نہ معلوم ہو۔ پرانے رہنے والے یہ گھر اب بھی بتادیں گے۔

اس صدی کے چوتھے دہے کے اواخر میں ایک پُر تشدد، خونی طوفان نے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اسے دو ملکوں میں تقسیم کردیا۔ پناہ گزینوں کے قافلے، اپنی جان بچاتے ہوئے مخالف سمتوں میں دوڑ پڑے مسلمان مغرب کی طرف، ہندو مشرق کی طرف۔ عداوت اور نفرت کی لہروں نے پانی پت کو بھی نہیں بخشا، اپنے راستے میں سب کچھ تباہ اور نیست و نابود کرتی ہوئی گزر گئیں۔ مگر پتہ نہیں کیسا معجزہ تھا کہ حالی کا گھر صحیح سلامت بچ گیا۔ اب یہ گھر ۱۹۴۷ء میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ سے گھرے ہوئے لاہور سے ہندوستان کو منتقل ہونے والے ایک سکھ خاندان کی ملکیت میں ہے۔ اسی زمانے میں حالی کے رشتہ دار گھر بیچ کر پانی پت سے رخصت ہوئے۔ اتفاقاً نئے مالک مکان ایک روشن خیال انسان نکلے، مزید برآں وہ اردو کے ماہر تھے اور حالی کا احترام کرتے تھے۔ ان کے حکم پر گھر کو ازسرِ نو نہیں تعمیر کیا گیا، ضروری مرمت کے دوران دیواروں تک پر وہی رنگ چڑھایا گیا جو پہلے تھا۔ اصلی اندرونی سجاوٹ بھی ہو بہو برقرار رہی۔ گویا کہ خود تقدیر نے پہلے سے ایسا انتظام کرلیا تھا کہ یہ گھر عجائب خانے کے نوادر کی طرح ایک یادگار کی شکل میں

صحیح سلامت برقرار ہے۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ ہے کہ وہ شان دار خزانہ جو حالی کی یاد کو تازہ رکھ سکتا تھا یعنی ان کے مخطوطات اور بے شمار خاندانی کاغذات بچ نہیں پائے۔ پانی پت کے کتب خانے کے ساتھ سب کچھ ۱۹۴۷ء کی آگ میں جل گیا۔ حالی نے یہ کتب خانہ سال ہا سال کی مدت میں بڑے چاؤ سے جمع کیا تھا اور پھر شہر کو تحفتاً دے دیا تھا۔ پانی پت کے کتب خانۂ عام کو مذکورۂ صدر الم ناک واقعات تک شہر کے ایک قابلِ دید مقام کی حیثیت حاصل تھی۔

شہر کے کالج کی خوش نما عمارت کے پیچھے ایک سایہ دار پارک پھیلا ہوا ہے، جس میں ایک حوض بھی تعمیر کیا گیا ہے۔ اس باغ کا نام "حالی پارک" ہے گو کہ بہت سے لوگ اس کو انگریزی لہجے میں "ہولی پارک" یعنی "مقدس پارک" کے نام سے بھی یاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس شکل میں اس نام کو آج کل کے نوجوان نسبتاً آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ افسوس، ان کو یہ نہیں معلوم کہ اس صدی کے آغاز میں مولانا حالی ہی کی کوششوں سے جمع کیے ہوئے وسائل اور کفایت شعاری سے کام لے کر بچائے ہوئے خود ان کے پیسوں سے اس حوض کی تعمیر ہوئی تھی اور اس شہر کا یہ پارک آراستہ کیا گیا تھا۔

زندگی کے تضادات ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کہیں پاس ہی الطاف حسین حالی سے معنون سال گرہ کی کانفرنسیں اور سمینار منعقد ہوتے ہیں، ہندوستان کی سرحدوں سے دور فاصلے پر حالی کی تخلیقات کا مطالعہ کیا جاتا ہے، جب کہ پانی پتیوں کی نوجوان نسل کی معلومات نہ صرف چوتھی جنگِ پانی پت بلکہ اپنے نامور ہم وطن کے بارے میں بھی محض برائے نام ہیں۔ (ہر تہذیب کی تاریخ کتنی ہی ایسی ملتی جلتی مثالوں سے بھری پڑی ہے!۔۔۔)

اس "مقامی نسیان" کا تعلق سب سے پہلے ان پیچیدہ سیاسی مسائل سے ہے جو ہندو مسلم اختلافات سے اور ہندوستان میں اردو زبان کے موقف سے جڑے ہوئے ہیں، جسے ازروئے روایت "مسلمانوں کی زبان" سمجھا جاتا ہے۔

سیر المنازل

(فارسی متن معہ اردو ترجمہ)

تصنیف: مرزا سنگین بیگ

ترتیب و ترجمہ: ڈاکٹر شریف حسین قاسمی

فارسی کی وہ اولین کتاب ہے جس میں ابتداء سے دہلی کی اجمالی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب اوائل انیسویں صدی عیسوی میں تالیف ہوئی تھی اور دہلی کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے مستند اور معتبر دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔ اس میں شاہجہاں آباد کی مختلف عمارات، مقابر، مساجد، منادر و معابد محلے، مکانات اور حویلیو کے علاوہ یہاں کے مشاہیر علم وفن اور اہل حرفہ کے حالات بیان کیئے گئے ہیں۔ دہلی کی تہذیب و تمدن کا ایک رنگا رنگ مرقع ہے۔ سیر المنازل میں بعض کتبے بھی نقل کیے گئے ہیں۔

صفحات . ۳۰۶

قیمت ۴۵ روپے

مظہر مہدی

حالؔی کی مذہبی فکر

اپنی تشکیلی ہیئت کی سطح پر مذہب اسلام ایک بہت ہی طاقت ور ادارہ تھا جسکے عقائد ونظریات مسلمانوں سے ایسے اعمال کا مطالبہ کرتے تھے جو مصلحین کی نظروں میں دنیاوی ترقی کے خلاف خیال کیے جاتے تھے۔ دنیاوی ترقی کی خاطر ایک ادارے کے طور پر اسلام کو مسترد تو نہیں کیا جا سکتا تھا۔ البتہ اس میں اتنی گنجائش ضرور تھی کہ اس کے عقائد و نظریات کو وقت اور حالات کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا جاتا جس سے مسلمانوں کے لیے ترقی کی راہ ہموار ہوتی اور وہ اس پر گام زن ہو سکتے۔ مذہب اسلام کے عقائد ونظریات کو درست کرنے کی حالی کی کوشش بدلتے ہوئے معاشی حالات (اقتصادی بنیاد) سے ان کی مطابقت تھی اور بہ یک وقت اسلام کے تقاضوں میں modification مسلم معاشرے کی اقتصادی بنیاد کو بہتر بنانے کی کوشش تھی۔ اس طرح حالی نے بنیاد اور ڈھانچہ دونوں سطحوں پر معاشرے کی اصلاح کا خیال ظاہر کیا اور خود اس کی جانب توجہ کی۔

حالی نے مذہب اسلام کے موضوع پر جو کچھ بھی لکھا[1] اس میں یہ احساس کارفرما ہے کہ ہندستانی معاشرے میں اسلام کی جو شکل رائج ہے، اس میں اکثر ایسے عناصر

داخل ہو گئے ہیں جو اس کے اجزا نہیں ہیں اور یہ مروّجہ اسلام انسان کو بے عملی، سُستی، کاہلی اور قسمت پرستی کا درس دیتا ہے۔ دوسری طرف اسلام کی شکل اتنی مسخ ہو گئی ہے کہ یہ رسم و رواج کا پشتارہ ہو کر رہ گیا ہے جو ترقی اور تہذیب کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ لیکن وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں ایک خاص مدّت کے بعد قسم قسم کے عناصر درآتے ہیں جو دراصل ان مذاہب کے عناصر نہیں ہوتے لیکن ان کو مذہبی درجہ دے دیا جاتا ہے اور ان کی وجّہ سے اصل مذاہب کی صورت مسخ ہو جاتی ہے اور وہ اس وقت تک ان کا حصہ خیال کیے جاتے ہیں جب تک کوئی مصلح ضرورت کے مطابق ان کی اصلاح کا قصد نہیں کرتا۔ اور شاید یہی سبب ہے کہ وہ مذہب اسلام اور مسلم معاشرے کی اصلاح پر مستعد ہوئے۔

ابتدا میں حالی عقل اور فطرت سے مذہب اِسلام کی تعبیر کے خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انسان مبدا و معاد کی حقیقت، کی دریافت کے لیے عقل کے استعمال کی صورت میں ہر جگہ ٹھوکریں کھائے گا اور راہِ راست سے بھٹک جائے گا۔ ان کی رائے میں انسان کو قدرت نے ان امور کا علم عطا کیا ہے اور اس سلسلے میں عقل اس کی رہ نمائی نہیں کر سکتی۔ اس لیے انہوں نے مذہب میں عقل کے استعمال کی ممانعت کی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالی کا ذہن زیادہ پختہ اور سائنسی ہوتا گیا اور وہ زمانے کی ضرورت اور تقاضے سے زیادہ باخبر ہوتے گئے۔ اسی لیے انہوں نے مغربی علوم اور جدید سائنسی انکشافات کی روشنی میں قرآن کی تفسیر کی ضرورت محسوس کی، حالی کا خیال ہے کہ اسلام کو مذہبی رہنماؤں نے نہایت ہی دشوار بنا دیا ہے جب کہ وہ اس کے برعکس نہایت ہی آسان اور لچک دار مذہب ہے۔ انہوں نے اپنے مضمون ''الدّین یُسر'' میں اُن حشو و زوائد کو تفصیل کے ساتھ درج کیا جو اسلام کی اصل روح کے منافی تھے۔ اس میں انہوں نے اس قسم کی بے راہ رویوں کو متعدد خانوں میں تقسیم کیا۔ حالی نے سب سے پہلے اس خیال کو غلط قرار دیا کہ پیغمبر اسلام

سے جتنی احادیث منسوب کی جاتی ہیں ان کا اطلاق بلا امتیاز زمان ومکان تمام مسلمانوں پر ہوتا ہے۔ وہ شاہ ولی اللہ کی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" کے حوالے سے احادیث کی دو قسمیں بتاتے ہیں پہلی قسم کی حدیث کا تعلق تبلیغِ رسالت سے ہے اور جس کے بارے میں قرآن میں آیا ہے ما اتاکم الرسول فخذوہ ومانھاکم عنہ فانتھوا۔ یعنی "جس بات کا رسول تم کو حکم دے اسے مان لو اور جس بات سے وہ تم کو روکے اس سے باز رہو"۔ جس کا مطلب حالی کے نزدیک، شاہ ولی اللہ کے حوالے سے، یہ تھا کہ پیغمبر اسلام کا کام، علم آخرت، علم عجائب ملکوت، علم شرائع واحکام اور علمِ اخلاق وفضائلِ اعمال کی تعلیم دینا تھا، جسے شریعت کہا جاتا ہے اور جو اُن کا منصبی فرض تھا۔ لیکن دوسری قسم کی حدیث وہ ہے جس کا تعلق تبلیغ شریعت سے نہیں ہے اور جس کے متعلق پیغمبرِ اسلام نے کہا کہ "میں صرف ایک آدمی ہوں، جب میں تم کو تمہارے دین کی کوئی بات بتاؤں تو اس کو مان لو، اور جب اپنی رائے سے کوئی بات کہوں تو (یہ جان لو کہ) میں صرف ایک آدمی ہوں"[۵۹]۔ اس سے حالی نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ پیغمبر اسلام نے دینی معاملات میں جو احکام دیے ہیں وہ قابلِ قبول ہیں لیکن دنیاوی امور میں ان کی ہدایات پر عمل کرنا ضروری نہیں ہے۔ اس طرح انہوں نے پیغمبرِ اسلام کو دینی رول عطا کیا، دنیاوی نہیں۔ انہوں نے کہا کہ دنیاوی کام وقت، ضرورت اور مصلحت کے مطابق کرنا چاہیے اور یہ ثابت کیا کہ بہتیری چیزیں جو پیغمبرِ اسلام کی زندگی میں جاری تھیں بعد میں خلفا اور صحابیوں نے مصلحتاً ترک کر دیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے متعدد احادیث اور واقعات پیش کیے۔

حالی نے قرآن اور حدیث کی روشنی میں یہ ثابت کیا کہ تمام مذاہب کا اصل مقصد صرف انسان کے اخلاق کو بہتر بنانا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وضو، غسل، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ جیسی ظاہری باتیں "مقصود بالذات" نہ تھیں۔ بلکہ ان کے مقاصد باطن کی صفائی، تزکیہ نفس اور اخلاق کی درستگی تھے۔ اسی طرح ان کا خیال ہے کہ اسلام کے ابتدائی

دور میں طہارت، نجاست اور جسمانی عبادات وغیرہ میں کسی قسم کی کوئی شدت نہیں تھی لیکن اس کے بعد کے زمانے میں اسلام مشکل اور پیچیدہ مذہب ہو گیا جس کی ذمے داری انہوں نے علما، فقہا اور صوفیہ پر عائد کی۔ انہوں نے امام شعرانی کے حوالے سے لکھا کہ خدا اور رسول نے دین میں ہر قسم کی آسانیاں پیدا کیں لیکن عالموں نے اس کو حتی الوسع دشوار بنا دیا[۵]۔ حالی نے مسدس میں بھی اس موضوع کی طرف رجوع کیا ہے۔

شریعت کے احکام تھے وہ گوارا — کہ شیدا تھے ان پر یہود و نصاریٰ
گواہ ان کی نرمی کا قرآں ہے سارا — "خود الدین یسر" نبی نے پکارا
مگر یاں کیا ایسا دشوار ان کو
کہ مومن سمجھنے لگے بار ان کو[۶]

حالی نے صوفیہ کو بھی اپنی تنقید کا نشانہ بنایا کیوں کہ انہوں نے جس طرح دنیاوی معاملات کو ترک کر کے دن رات خود کو اذکار و اشغال، روزہ نماز اور اسی قسم کی عبادتوں میں مشغول رکھا اس سے مذہب سخت اور مشکل ہو گیا اور نتیجے میں مسلمانوں کی دنیاوی ترقی کی راہیں مسدود ہو گئیں اور تنزل ان کا مقدر ہو گیا[۷]۔ حالی صوفیہ کی اس لیے تنقید کرتے ہیں کہ ان کے مقاصد اور صوفیہ کے اعمال باہم متصادم تھے۔ حالی غیر متحرک مسلم معاشرے میں حرکت اور عمل پیدا کرنا چاہتے تھے اور صوفیہ کے اعمال اس کے برعکس مسلمانوں میں جمود کا موجب تھے۔ حالی کا یہ عقیدہ تھا کہ مذہب اسلام میں بہت سے عناصر ان حدیثوں کی وجہ سے در آئے ہیں جو کسی نہ کسی مقصد سے وضع کر لی گئی تھیں۔ علما کے ایک گروہ نے ثواب اور اجر کے پیشِ نظر تلقین کی خاطر احادیث وضع کرنے یا ضعیف اور متروک احادیث کے روایت کرنے کو جائز خیال کر کے بے شمار حدیثیں وضع کیں۔ اسی طرح مفسرین نے اپنی تفسیروں میں اپنی طرف سے ہزاروں ایسی احادیث درج کر دیں۔ حالی نے ایسی حدیثوں کی ایک لمبی فہرست پیش کی[۸]۔ انہوں نے کہا کہ متعدد احادیث کسی خاص شخص کی مخالفت یا موافقت میں بھی وضع کی

گئیں ۱۵ ۔

حالی نے لکھا کہ عہد عباسیہ میں مصر، شام، یونان اور قبرص وغیرہ سے مسلمانوں کو فلسفے کی کتابیں، دستیاب ہوئیں لیکن جب ان کے تراجم عربی زبان میں ہوئے تو اسلام کے مروّجہ اصولوں میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ اس صورتِ حال میں مسلمانوں نے اسلام کو سچا مذہب ثابت کرنے کے لیے اس فلسفے سے اسلام کی تطبیق کی اور ایک نئے علمِ کلام کی بنیاد رکھی جس کی وجہ سے اسلام میں ایسے نئے خیالات در آئے جن کا فی الحقیقت اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا''۔ یہاں پر حالی نے علما کے نئے علمِ کلام ایجاد کرنے کو در پردہ اسلام میں غیر اسلامی اور نئے خیالات پیدا ہونے کا سبب قرار دیا لیکن ایک دوسری جگہ انہوں نے علوم سے اسلام کی تطبیق کو مقتضائے وقت کے مطابق ہی نہیں بلکہ مستحسن بھی قرار دیا[۱۶]۔

حالی نے مسلمانوں کے اس رویے پر تاسف کا اظہار کیا کہ انہوں نے قرآن اور حدیث سے روشنی حاصل کرنی بند کر دی ہے اور انہوں نے تقلید اور بدعت کو ہی اصل اسلام سمجھ لیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مسلم معاشرے میں جو طور طریق اور رسوم و عادات رائج ہیں ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کے نزدیک اسلام میں آج جتنے بھی حشو و زوائد نظر آتے ہیں، ان کی سب سے بڑی وجہ تقلید، رسم و رواج اور بدعت ہے۔ حالی اپنے مضمون ''زمانہ'' میں تقلید کو مسلمانوں میں سب سے زیادہ جمود پیدا کرنے والی اور ان کی ترقی کے مانع شے قرار دیتے ہیں جو نہ صرف تجارت، زراعت، حرفت اور علم و فن کے میدانوں میں مسلمانوں کی پس ماندگی کا اصل سبب ہے بلکہ دینی معاملات میں بھی ان کی مجبوری اور بے اختیاری کا باعث ہے۔ انہوں نے ایسے لوگوں کی مثال اس بے بس پرندے سے دی جس کے بال و پر کٹے ہوں اور جس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہو۔ انہوں نے کہا کہ اس تقلید کی وجہ سے مسلمانوں میں نہ طاقت پرواز ہے اور نہ نگاہِ دوربین[۱۷]''۔ ان کے نزدیک ہندوستانی معاشرے میں رائج موجودہ اسلام کے تقاضے اس قدر بڑھ گئے تھے کہ اگر مسلمان ان کو پورا

کرنا چاہتے تو ان کو اتنی فرصت بھی نہ ملتی کہ وہ اپنے اور اپنے بال بچوں کے لیے دو وقت کی روٹی کا انتظام کر سکتے۔ اس صورتِ حال میں ان کے لیے عزت کی زندگی بسر کرنے اور مذہب اسلام کی 'شان وشوکت' بڑھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جب کہ دوسری طرف حالات اس طرح بدل رہے تھے کہ اس میں متوسط قسم کے طرزِ زندگی اختیار کرنے کے لیے بھی مسلمانوں کو ایسی تدابیر کرنے کی ضرورت تھی جو گزشتہ زمانے میں حکومت چلانے کے لیے کرنی پڑتی تھیں[۳]۔

حالی کا بیان ہے کہ مسلمان جو صرف مذہب اسلام ہی کو قابل قبول خیال کرتے ہیں، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صرف اسلام ہی من جانب اللہ ہے اور دیگر مذاہب من جانب اللہ نہیں ہیں۔ وہ قرآن کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''وان من امۃ الا خلا فیھا نذیر ''یعنی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں کوئی نبی نہ گزرا ہو''۔ وہ اسی سلسلے میں لکھتے ہیں کہ ''منھم من لم نقصص علیک'' یعنی ہم نے بعض انبیا کا حال تجھ سے (اے نبی آخرالزماں) بیان نہیں کیا''۔ ان کا خیال ہے کہ مسلمان اسلام کو اس وجہ سے 'ترجیح' دیتے ہیں کہ اسلام کے ظہور کے وقت موجودہ مذاہب اپنی اصل حالت پر قائم نہیں تھے اور 'حق و باطل' میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہ گیا تھا۔ ایسے حالات میں پیغمبرِ اسلام نے 'حق کو باطل سے جدا کیا، اور اس وقت کے رائج مذاہب میں در آئے غیر مذہبی عناصر کو دور کر کے ایک خالص کندن نکالا اور اسی کا نام اسلام رکھا'[۴۱]۔ حالی کا یہ بیان کم از کم دو وجوہ سے اہم ہے۔ اول یہ کہ وہ مذہب کے معاملے میں متعصب نہیں تھے اور اسلام کے ساتھ دنیا کے دیگر مذاہب کو بھی من جانب اللہ سمجھتے تھے اور ان کو تعظیم کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس طرح وہ آفاقی مذہب کے قائل نظر آتے ہیں۔ حالی اپنی اس توجیہہ سے یہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ جن بنیادوں پر مسلمانو ں نے دیگر مذاہب کو رد کر کے اسلام کو فوقیت دی تھی کہیں انہیں بنیادوں پر لوگ اسلام کو رد نہ کر دیں۔

مسلمانوں کی معاشرتی تشکیل نو اور ترقی، جدید سائنس اور مغربی علوم وفنون کی تحصیل کے بغیر ممکن نہ تھی۔ اس سلسلے میں بیداری کی تحریک شروع ہو چکی تھی اور اس کی جانب مسلمانوں میں مثبت رویہ ظاہر ہو رہا تھا۔ ان علوم وفنون کی تحصیل کا لازمی نتیجہ تھا عقلیت، روشن خیالی اور تشکیک۔ اس کے بارے میں ان کے عہد کے تمام دانش وران متفکر تھے اور حالی کو بھی اس بات کا اندیشہ تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کو مسلم معاشرے کی تشکیل نو کے لیے جدید علوم کی تحصیل کی ضرورت کا بھی احساس تھا۔ اس لیے حالی نے جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایمان اسلام پر قائم رکھنے کے لیے اسلام کو حشو وزوائد سے پاک کرنا چاہا اور سائنسی علوم کی روشنی میں قرآن کی تفسیر کرنے کا مشورہ دیا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اسلام من جانب اللہ ہے اور یہی خالص اور سچا مذہب ہے۔ اس لیے وہ عقل کی کسوٹی پر بھی کھرا اترے گا۔ اس کے علاوہ انہوں نے دنیا کے تمام مذاہب کو من جانب اللہ قرار دیا اور آفاقی مذہب میں اپنے یقین کا اظہار کیا۔

حالی چاہتے تھے کہ مسلمان ان اقدار کو ترک کر دیں جو اسلام کی روح اور تعلیمات کے خلاف، جدید اقدار کو قبول کرنے کی راہ میں حائل اور مانع ترقی ہیں اور ان اسلامی اقدار کو اختیار کریں جو خالص، سادہ اور ترقی کے موافق ہیں۔ ان کی پوری مذہبی تاویل میں یہ بات کلیدی اہمیت کی حامل ہے کہ اسلام نہایت ہی آسان مذہب ہے، اس میں حرکت وعمل پر زور ہے اور یہ دنیاوی تہذیب وترقی کا ضامن ہے۔ مذہب کے حوالے سے وہ انہی خطوط پر مسلم معاشرے کی تشکیل نو کے خواہاں تھے جو مسلمانوں کو تہذیب وترقی کی راہ پر گامزن کر سکتی تھی۔

حواشی:

ا۔ حالی کی مندرجہ ذیل تحریریں پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور سے وابستہ ہونے سے قبل کی ہیں۔ ان کا انداز مولویانہ اور مناظرانہ ہے اور شاید اسی لیے ان میں نئے رجحانات کے اثرات بھی نمایاں نہیں، ہیں۔ اس لیے

یہ ہمارے کام کی چیز نہیں۔(۱) میلاد شریف۔ پانی پت حالی پریس، ۱۹۳۲ء (۲) تریاق مسموم (۱۸۶۷) رسالہ ''خیر المواعظ'' دہلی میں بالاقساط چھپی، جو پادری عمادالدین کی کتاب ''تحقیق الایمان'' کے جواب میں شائع ہوئی تھی۔ (۳) پادری عمادالدین کی تاریخ محمدی پر منصفانہ رائے بھی حالی نے اسی پادری کی ایک دیگر کتاب ''تاریخ محمدی'' کے جواب میں ۱۸۷۲ء میں لکھی تھی، شواہد الالہام نام کا ایک ۳۲ صفحاتی رسالہ ۱۸۷۲ میں تحریر کیا تھا جس کا مقصد الہام اور وحی کی ضرورت کو پیش کرنا تھا۔ ان تحریروں پر تبصرے کے لیے دیکھیے ڈاکٹر عبدالقیوم، حالی کی اردو نثر نگاری، لاہور مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۶۴ء ص ص ۶۹۔۶۱، ۸۲۔۷۷۔

۲۔ حالی نے موجودہ اسلام کا نقشہ اپنے مسدس میں کھینچا ہے۔ مسدس مدوجزر اسلام، کلیات نظم حالی، جلد دوم۔ لاہور مجلسِ ترقی ادب ۱۹۷۰ء ص ص ۱۱۱۔۱۱۰۔

۳۔ ''کیا مسلمان ترقی کر سکتے ہیں'' کلیات نثر حالی، جلد اول، لاہور مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۶۷ء۔ ص ۱۶۶۔۱۶۵۔

۴۔ ''قرآن میں اب نئی تفسیر کی گنجائش باقی ہے یا نہیں'' کلیات نثر حالی، جلد اول۔ ص ص ۹۵۔۹۳، دیکھیے بیز ضمیمہ نمبر ۵ حیات جاوید۔ نئی دہلی ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۲ء۔ ص ص ۸۷۳۔۸۷۲۔

۵۔ ''الدین یسر'' کلیات نثر حالی، جلد اول، ص ۱۰۔۹۔

۶۔ ایضاً ص ۱۹۔۲۰۔۲۱۔

۷۔ مسدس مدوجزر اسلام، ص ۱۱۰۔

۸۔ الدین یسر، ص ۲۴، ۲۳

۹۔ ایضاً ص ۲۶، ۲۵

۱۰۔ ایضاً ص ۲۷

۱۱۔ ایضاً ص ۳۳

۱۲۔ ''زمانے کے موافق اپنا حال بناؤ'' کلیات نثر حالی، جلد اول، ص ۱۲۲۔۱۲۱

۱۳۔ ایضاً ص ۱۲۵

۱۴۔ الدین یسر، ص ۳۷

۱۵۔ ایضاً ص ۳۹، ۳۸

سراج اجملی

نظم حالی۔ جدید اردو نظم کا نقش اول

مولانا الطاف حسین حالی ہمارے ان اکابرین میں سرفہرست ہیں جنہیں بیک وقت ادب کی کئی اصناف کے حوالے سے نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ حالی اُردو ادب کے پہلے باضابطہ ناقد، اہم شاعر، نہایت عمدہ سوانح نگار اور نکتہ رس ورہنما مقالہ نگار کی حیثیت سے اردو ادب کی تاریخ میں زندہ رہیں گے۔ مقدمہ شعر وشاعری کے مباحث پر گفتگو کے طویل سلسلے نے حالی کی دوسری حیثیتوں کو نسبتاً دھندلا ضرور کر دیا ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ حالی کا کارنامہ صرف میدان تنقید تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہو۔ ان کی دوسری حیثیتیں بھی کم ہی سہی زیر بحث رہی ضرور ہیں۔ روایتی شاعری یعنی اپنے جلو میں کلاسیکی رنگ وآہنگ رکھنے والی شاعری کے علاوہ حالی نے محمد حسین آزاد کے ساتھ مل کر اردو میں ایک نئی قسم کی شاعری کی داغ بیل ڈالی۔ حالی کو جو صلاحیتیں ودیعت ہوئی تھیں، شاعری کی اس نئی قسم میں بھی انہوں نے ان صلاحیتوں کا استعمال کر کے اپنی حیثیت وہاں بھی مستحکم کر لی۔ ہمارا اشارہ انجمن پنجاب میں کرنل ہالرائڈ کے مشورے پر انگریزی شاعری کی اتباع میں لکھی جانے والی موضوعاتی نظموں کی طرف ہے۔ اس مطالعے میں ہم کوشش کریں گے کہ بحیثیت نظم نگار حالی

کے امتیاز کی نشاندہی کریں اور ان کی دوسری تحریروں کے علی الرغم ان کی نظمیں کس طرح آئندگاں کے لیے رہنما ثابت ہوتی ہیں، اس کا مطالعہ کریں۔

حالی کی موضوعاتی نظموں کا سلسلہ ۱۸۷۴ء میں لاہور سے شروع ہوا۔ اردو ادب کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا جب مصرعۂ طرح کے بجائے عنوان دیا گیا اور اس عنوان پر شعرا سے طبع آزمائی کی "درخواست کی گئی۔ مولانا الطاف حسین حالی نے اس سلسلے کے تحت اپنی پہلی نظم برکھارت لکھی اور اس مشاعرے میں پیش کی۔ مثنوی کے فارم میں لکھی ہوئی یہ نظم اردو شاعری میں پہلا کامیاب تجربہ ہے جس میں شاعر مناظرِ فطرت کے تفصیلی بیان کے حوالے سے اپنے جذبات اور محسوسات کو زبان عطا کرتا ہے اور اس پورے منظر میں ہماری کلاسیکی شاعری کے ناگزیر کردار نظر نہیں آتے۔ جس وقت حالی نے یہ نظم لکھی اس کی تازگی اور انفرادیت کے پیش نظر اسے بیحد پسند کیا گیا۔ مناظر فطرت سے متعلق تفصیلات اور فطری عناصر کا treatment جس سطح کا اس نظم میں نظر آتا ہے وہ اردو شاعری کے لیے ایک نئی چیز تھی۔ نظیر اکبرآبادی کے یہاں برسات کے موضوع پر جو نظمیں ہیں ان میں نظیر کی عوام سے فطری قربت تو نظر آتی ہے لیکن حالی کی جزئیات نگاری اور موضوع کا برتاؤ انہیں انفرادیت عطا کرتا ہے، اس پر مستزاد اس نظم میں حالی کی عوام سے قربت ہے جس کا پایہ کسی طرح نظیر سے کم نہیں۔ حالی اپنی تنقید میں جس اصلیت اور سادگی کا شاعر سے تقاضہ کرتے ہیں اس کی عملی شکل بھی ہمیں اس نظم میں نظر آتی ہے۔ گرمی کی شدت کے سبب سے کوہ و بیاباں، چرند و پرند اور انسان کا جو حال ہے اس کے بیان میں بطور خاص حالی نے اپنی گہری قوت مشاہدہ اور غیر معمولی صلاحیت اظہار کا مظاہرہ کیا ہے

گرمی سے تڑپ رہے تھے جاندار	اور دھوپ میں تپ رہے تھے کہسار
بھوبل سے سوا تھا رنگ صحرا	اور کھول رہا تھا آب دریا
تھی لوٹ سی پڑ رہی چمن میں	اور آگ سی لگ رہی تھی بن میں

سانڈے تھے بلوں میں منھ چھپائے | اور ہانپ رہے تھے چار پائے
تھیں لومڑیاں زباں نکالے | اور لُو سے ہرن ہوئے تھے کالے
چیتوں کو نہ تھی شکار کی سدھ | ہرنوں کو نہ تھی قطار کی سدھ
گھوڑوں کا چھٹا تھا گھاس دانہ | تھا پیاس کا ان پہ تازیانہ
طوفان تھے آندھیوں کے برپا | اٹھتا تھا بگولے پہ بگولا
آرے تھے بدن پہ لو کے چلتے | شعلے تھے زمین سے نکلتے
اور صبح سے شام تک برابر | تھا العطش العطش زباں پر

ان اشعار میں ماحول کی نہایت عمدہ لفظی تصویر کشی کی گئی ہے اور غور سے دیکھنے پر نرابیان اور سپاٹ الفاظ ہی نظر نہیں آتے بلکہ تشبیہات کا حسن، صنائع بدائع کا استعمال اور خوب صورت امیجری بھی دامنِ دل کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔ پیاس کا تازیانہ اور لو کے آرے نادر امیجری کی مثالیں ہیں۔ مانوس مناظر فطرت کی اس خوب صورت تصویر میں حالی نے بیک جنبش قلم تکمیلیت بھر دی ہے جو ان کا اہم کارنامہ ہے۔

موضوعاتی شاعری کے سلسلے کی دوسری نظم نشاط امید ہے۔ اس نظم کا سن تصنیف بھی ۱۸۷۴ء ہے۔ سادہ اور رواں دواں اسلوب میں آہنگ اور نغمگی اس نظم کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ پوری نظم خوب صورت امیجری کا بہترین مرقع ہے اور لطف کی بات یہ کہ حالی سے منسوب روایتی سادگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ امید کی اہمیت کو تہذیب اور تاریخ کے مستند حوالوں سے شاعر نے ثابت کیا ہے اور اس تعلق سے ایک ایسا التزام روا رکھا ہے جو اردو شاعری کی تاریخ میں اپنی تازہ کاری اور نئے پن کے باعث اپنی مثال آپ ہے یعنی فارسی شاعری کی اتباع میں اردو شاعری میں صدیوں سے جو تلمیحات عرب وعجم استعمال ہوتی آئی ہیں ان کے ساتھ ساتھ خالص ہندوستانی تلمیحات کا استعمال بہت خوبی کے ساتھ کر کے شاعر نے اپنی نظم میں ہندوستانی مٹی کی بو باس پیدا کی ہے اور اسے

زمینی حوالہ عطا کیا ہے۔ نظم میں اگر نوحؑ، یوسفؑ، قیس، فرہاد، مصر وغیرہ نظر آتے ہیں تو ہیر، رانجھا، رام، پانڈو، گنگا، گیا اور پراگ وغیرہ بھی موجود ہیں جو اس سے قبل کی اردو شاعری میں اتنے اہتمام کے ساتھ شاید کہیں نظر نہ آئیں۔

۱۸۷۴ء اردو نظم کی تاریخ میں ایک یادگار سال اس طرح بھی ہے کہ اسی سال مولانا حالی نے اپنی تین مشہور آفاق نظمیں تخلیق کیں۔ حب وطن، حالی کی تیسری موضوعاتی نظم ہے جسے موضوع کی تازہ کاری کے سبب سے سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اس پر مستزاد پوری نظم کا برتاؤ جو نہ صرف شاعر کے جذبۂ حبِ وطن کو ظاہر و ثابت کرتا ہے بلکہ قارئین و سامعین کو بھی حب وطن کی ترغیب دیتا ہے۔ حالی نے اس نظم کے ذریعے پہلی مرتبہ اردو شاعری میں ایک مجرد خیال کو اس قدر آرائش کے ساتھ برتا ہے کہ جس کی مثال اس سے قبل کی شاعری میں نہیں ملتی۔ اردو شاعری میں حب معشوق کے ساتھ مخصوص تھا حالی کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے محبت سے معشوق کے اس اجارے کو نہ صرف ختم کیا بلکہ اپنی صلاحیت کے سبب سے قائم بھی کر دیا۔ اس نظم کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس کے بعض مصرعے اور اشعار ضرب المثل کے طور پر قوم کے حافظے کا حصہ بن گئے

اے وطن اے مرے بہشت بریں — کیا ہوئے تیرے آسماں و زمیں
کاٹے کھاتا ہے باغ بن تیرے — گل ہیں نظروں میں داغ بن تیرے
جان جب تک نہ ہو بدن سے جدا — کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جدا
تیرے اک مشتِ خاک کے بدلے — لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

ان مصرعوں یا اشعار کے ضرب المثل بننے کی ایک وجہ ان کی سادگی اور اثر پذیری ہے تو دوسری وجہ جذبے کی صداقت ہے جس کی مثالیں حالی کی دوسری نظموں میں بھی ملتی ہیں۔ برکھا رت میں ان کا جذبۂ حب وطن پردیس میں انہیں وطن کی یاد میں خون کے آنسو رلاتا ہے۔ جب بادل گھر کر آتے ہیں برق تڑپتی ہے اور پھوار پڑنے لگتی ہے تو شاعر کو:

سامان ملے جو دل لگی کے ۔ ۔ کبھی کے

دیکھے کوئی اس گھڑی کا عالم ۔ وہ آنسوؤں کی جھڑی کا عالم

وہ آپ ہی آپ گنگنانا ۔ اور جوش میں آ کبھی یہ گانا

اے چشمۂ آب زندگانی ۔ گھٹیو نہ کبھی تری روانی

جاتی ہے جدھر تری سواری ۔ بستی ہے اس طرف ہماری

پائیں جو کہیں مری سبھا کو ۔ دیتا ہوں میں بیچ میں خدا کو

اول کہیو سلام میرا ۔ پھر دیجیو یہ پیام میرا

قسمت میں یہی تھا لکھا ۔ فرقت میں تمہاری گئی برکھا

عرض کرنے کا مدعا یہ ہے کہ حب وطن حالی کا انتہائی پسندیدہ موضوع ہے اور اسے حالی نے اپنی نظموں میں پوری دیانت داری کے ساتھ برتا ہے۔ اس نظم میں فطرت اور تاریخ کے متعدد اہم حوالوں کا استعمال بھی حالی نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ کیا اور اس سب سے بھی نظم کے حسن وزن اور وقار میں اضافہ ہوا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں

اے سپہر بریں کے سیارو ۔ اے فضائے زمیں کے گلزارو

اے پہاڑوں کی دلفریب فضا ۔ اے لب جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا

اے عنادل کے نغمہ سحری ۔ اے شب ماہتاب تاروں بھری

—

حملہ جب قوم آریا نے کیا ۔ اور بجا ان کا ہند میں ڈنکا

جب ملا رام چندر کو بن باس ۔ اور نکلا وطن سے ہو کے اداس

ہوئے یثرب کی سمت جب راہی ۔ سید بطحی کے وہ ہمراہی

ہوئیں یوسف کی سختیاں جب دور ۔ اور ہوا ملک مصر پر مامور

مثنوی کے فارم میں لکھی گئی اس بیانیہ نظم میں، نثری صفات کا حامل لہجہ کامیابی

کے ساتھ نظم میں ڈھل گیا ہے۔اسی کے ساتھ کہیں کہیں ہمیں صنعت کا استعمال بھی غیر شعوری طور پر ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور ایک خوش گوار تجربہ لگتا ہے۔

سیدھے بیانیہ انداز کے مصرعوں کو پڑھتے ہوئے لف ونشر مرتب کے اس خوب صورت استعمال سے بھی اس نظم میں ملاقات ہوتی ہے لیکن یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ اس طویل نظم میں صنائع کے استعمال کا تناسب نہ ہونے کے برابر کیوں ہے؟ تو جواب مولانا حالی کے یہاں ہی ملتا ہے

اے شعر دل فریب نہو تو غم نہیں　　　پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دلگداز تو

صنعت پہ ہے فریفتہ عالم تمام اگر　　　ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو

مناظرہ رحم وانصاف (۱۸۷۶) مناظرہ واعظ وشاعر (۱۸۸۳) دولت اور وقت کا مناظرہ (۱۸۸۷) یہ نظمیں ڈائیلاگ کے فارم میں مجموعۂ نظم حالی کی زینت ہیں۔ متضاد اور متخالف اشیا اور رویوں کے درمیان توازن کا یہ انداز لطیف اردو شاعری میں یکسر انوکھا طریقہ ہے جس کے موجد مولانا حالی قرار پاتے ہیں۔ مغربی شاعری کے ایک خاص دور کے اس طریقے کو کہ جس میں سائنس، فلسفہ، دینیات اور دیو مالائی انداز ایک خاص علمی طریقۂ کار کے ساتھ باہم مربوط ہو کر فن پارے کی قدر میں اضافے کا سبب بنتے ہیں، حالی نے پہلی مرتبہ اردو شاعری میں استعمال کیا۔ان نظموں کا تمثیلی انداز اس پر مستزاد۔ان نظموں کے ذریعہ مکالماتی طرز اظہار کی ابتدا حالی کرتے نظر آتے ہیں، اس انداز کو بعد میں اقبال نے نکتہ کمال تک پہنچادیا۔

رحم وانصاف کے مناظرے میں رحم اپنی اہمیت طرح طرح سے ثابت کرتا ہے اور انصاف کو للکارتا ہے کہ تیرے باعث دنیا میں مظالم کا ایک سلسلہ چل نکلا، جواب میں انصاف بھی رحم کو ترکی بہ ترکی جواب دیتا ہے، دونوں کے مکالمے میں استدلال کا طریقہ اور دلائل اور ان کا رد بے حد دلچسپ انداز میں ہے۔ جب یہ سلسلہ طول پکڑتا ہے تو عقل ان دونوں کے درمیان فیصلہ کرتی ہے اور کہتی ہے

صاف کہتی ہوں سن اے رحم نہیں اس میں خلاف
تو ہے اک قالب بے روح نہ ہو گر انصاف
اور سن اے عدل نہیں اس میں تکلف سرمو
گر نہ ہو رحم تو اک دیدۂ بے نور ہے تو
دونوں تم خلق کے ہو مایۂ آرام و شکیب
گل و شبنم کی طرح ایک سے ہے ایک کو زیب

ان نظموں میں سب سے دلچسپ مناظرہ واعظ و شاعر ہے۔ اس نظم میں ایک خواب میں حالی نے واعظ و شاعر کی جنگ دکھائی ہے۔ جس میں شاعر اپنے فن کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ شاعر کی گفتگو سن کر واعظ ضبط نہیں کر پاتا اور اس کی خامیوں کو بیان کرنا شروع کرتا ہے۔ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ

پردۂ عرض ہنر میں مانگتا ہے بھیک تو
گر یہی ہے شاعری تو تجھ سے بہتر ہے گدا

واعظ کا یہ انداز شاعر کو چراغ پا کر دیتا ہے۔ اس نے واعظ کو جس انداز میں جو کچھ کہا ہوتا ہے، اس کا ویسا ہی جواب پاتا ہے تو وہ (شاعر) واعظ کو مکار، ریاکار، گندم نما جو فروش وغیرہ کہتا ہے اور اس کی عادتوں پر اسے طنز و تعریض کا نشانہ بناتا ہے۔ واعظ کے طریق کار کا مذاق اڑاتا ہے، اس کے تقدس کو ٹٹی کی آڑ سے تشبیہ دیتا ہے۔ واعظ شکست سامنے دیکھ کر اور یہ محسوس کر کے کہ باتوں میں شاعر سے جیتنا مشکل ہے، بات بدلنے کی کوشش کرتا ہے اور شاعر سے اس کے دیوان وغیرہ کے بارے میں باتیں کرنا شروع کرتا ہے۔ جواب میں شاعر کہتا ہے کہ اب شاعری اور نکتہ پردازی میں کچھ دھرا نہیں ہے سو

اب تو یہ کہتا ہوں شعر و شاعری کو چھوڑ کر
وعظ میں شاگرد ہو جاؤں کسی استاد کا

اس گئے گذرے زمانے میں بھی یہ فن شریف
کیمیا ہے کیمیا ہے کیمیا ہے کیمیا

نظم کا آغاز بہت خوب صورت ڈرامائی انداز میں ہوتا ہے اور گریز جہاں واعظ بات کو بدلتا ہے، لاجواب ہے۔ لطف کا پہلو اس نظم میں یہ ہے کہ مولانا حالی واعظ کے مقابلے شاعر کی جانب زیادہ مائل نظر آتے ہیں جبکہ عملی اور واقعی زندگی میں وہ شاعر ہوتے ہوئے بھی معلم اخلاق اور واعظ بنے رہے۔ اس نظم کا متن writing writes not writer مقولے کی صداقت پر بھی دلالت کرتا ہے۔ نظم کے ذریعے شاعر کا منصب بیان کرنے کا سلسلے بھی حالی کی اس نظم مناظرہ واعظ وشاعر سے شروع ہوتا ہے جسے ہم بعد میں اقبال کے یہاں اور پھر جوش اور دوسرے ترقی پسند شعرا کے یہاں دیکھتے ہیں۔ یہ صورتحال ہمیں اس تصور کی طرف متوجہ کرتی ہے جس کے تحت شاعری کو افادی اور مقصدی نقطۂ نگاہ سے دیکھا گیا۔ چنانچہ شاعری کے ساتھ ساتھ شاعر کا بھی سوسائٹی کے لیے مفید ہونا لازمی قرار پایا۔

حالی نے اپنی نظموں میں اظہار کے تین واضح اور نمایاں طریقوں کو بطور خاص برتا ہے۔ وہ علی الترتیب بیانیہ، استدلالی اور ترغیبی کہے جاسکتے ہیں۔ مذکورہ بالا نظموں میں بیانیہ اور استدلالی طریقۂ کار کا انداز نظر آتا ہے جبکہ مناجات بیوہ میں بیوہ کی زبانی اس کی حالتِ زار کو بیان کر کے حالی ایسی فضا قائم کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں جو قاری اور سامع کو ترغیب دیتی ہے کہ سماج کے اس مسئلے پر غور کیا جائے۔

حالی نے اپنی نظموں میں جو زبان استعمال کی ہے وہ بقول شبلی مقتضائے حال کے عین مطابق ہے لیکن ہم آج سوا سو سال بعد اس بات کو محسوس کر سکتے ہیں کہ حالی کے ذہن میں کہیں نہ کہیں اس نئے شعری طریق کار کے لیے روایتی کلاسیکی شاعری بالفاظ دیگر غزل کی زبان کے مقابلے الگ درجۂ حرارت کی حامل زبان کی ضرورت رہی ہوگی اور انھوں نے

بالقصد اس زبان کا استعمال کیا ہوگا جو اس نئے انداز شاعری کی متحمل ہو۔ ماضی قریب میں اختر الایمان نے بطور خاص نظم کی زبان کے حوالے سے جو گفتگو کی ہے اور جس تفحص کا ذکر بار بار کیا ہے، اس کے آثار ہم اختر الایمان سے ایک صدی قبل مولانا حالی کے یہاں دیکھ لیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ حالی نے نظم میں برتی ہوئی زبان کا استعمال اپنی رنگ جدید کی غزلوں میں بھی کیا اور بعد کے تجزیہ نگاروں اور ناقدوں کے عتاب کا شکار بھی ہوئے۔

اس مختصر سے مطالعے سے جو نتائج سامنے آتے ہیں وہ اس طرح ہیں

۱۔ حالی نے ایک قائم بالذات صنف شاعری کی نہ صرف داغ بیل ڈالی بلکہ اسے برت کر بھی دکھایا۔

۲۔ پہلی مرتبہ مناظر فطرت کو شاعری کا موضوع بنایا۔

۳۔ معشوق چاردہ سالہ کے علاوہ بھی کسی شے/رویے سے عشق و محبت کے اظہار کا طریقہ قائم کر کے شاعری کی ایک نئی جہت پر روشنی ڈالی۔

۴۔ ہندوستانی تلمیحات کو باضابطہ شاعری میں برتا۔

۵۔ اردو شاعری میں ڈائیلاگ کے فارم کا باقاعدہ آغاز کیا۔

۶۔ مثنوی جیسی بیانیہ صنف کے علی الرغم استدلالی اور ترغیبی طریقۂ کار کو برتا۔

۷۔ نظم کی الگ زبان کی ضرورت کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس کا ایک ماڈل بھی بعد والوں کے لیے چھوڑا۔

آج جدید اردو نظم اگر فکری فلسفیانہ اور استعاراتی انداز کی گوناگوں دولت سے مالا مال ہے تو اس پر ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ ہم آج کی اس اہم اور قابلِ ذکر صنف سخن کے نقش اول کے طور پر جب مولانا الطاف حسین حالی کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو آج کی نظم کی ترقی پر ہمیں قطعی حیرت نہیں ہوتی کہ جب اس کا نقش اول اتنی

زیادہ خصوصیات کا حامل ہے تو آج نظم کو جیسی وہ ہے ویسی بلکہ اس سے بہتر ہونا ہی چاہیے۔ لیکن مسرت آمیز حیرت مولانا حالی کی شاعری کو دیکھ کر ضرور ہوتی ہے اور ان کی تخلیقات کو سلام کرنے کا جی چاہتا ہے۔ جس نے اس صنف سخن کے اکثر امکانات کو روز اول ہی بروئے کار لانے کی سعی مشکور کی۔

احمد محفوظ

حالی اور غزل کی تنقید

شاعری کی ماہیت کے بارے میں دو طرح کے سوالات بنیادی طور پر قائم کیے جا سکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ شاعری کیا ہوتی ہے؟ اور دوسرا یہ کہ شاعری کیا ہونی چاہیے؟ پہلے سوال کے جواب میں جو کچھ کہا جائے گا اس کا تعلق ان باتوں سے ہوگا جو پہلے سے موجود شاعری کے نمونوں میں پائی جائیں گی، جبکہ دوسرے سوال کے جواب میں ان باتوں کو بیان کیا جائے گا جو قائل کے نقطۂ نظر کے مطابق شاعری کے لیے ضروری قرار پائیں گی۔ ان دونوں سوالوں کے جواب میں جو باتیں بیان ہوں گی، ان کا ہمیشہ یکساں ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم جس زاویے سے شاعری کے موجودہ نمونوں کو دیکھیں ضروری نہیں کہ وہ زاویہ ہماری مطلوبہ شاعری کے لیے بھی قابل قبول ہو۔

حالی نے ''مقدمۂ شعر و شاعری'' میں جو اصول بیان کیے ہیں وہ کلاسیکی شاعری کے بڑے حصہ سے کیوں متناقض ہیں اور حالی اپنی کلاسیکی شاعری کے بڑے سرمائے کو قابل اعتنا کیوں قرار نہیں دیتے؟ ان باتوں کو درج بالا سوالوں کی روشنی میں آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ حالی نے مقدمہ میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان کا تعلق یوں تو

شاعری کی عمومی حیثیت سے ہے تاہم غزل پر ان کا اطلاق اس لیے خصوصیت رکھتا ہے کہ غزل اقسام شعر میں مرکزی حوالے کی حامل رہی ہے۔ چنانچہ شاعری سے متعلق حالی کے خیالات کی جانچ پرکھ کرتے ہوئے ہمیں یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ حالؔی کے خیالات بالخصوص کلاسیکی غزل کے بارے میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور حالؔی کے ذریعے غزل کی تنقید سے ہماری مراد یہی ہے کہ ان کے بیان کردہ ایسے اصولوں کا مطالعہ کیا جائے جو غزل کی قدیم شاعری کو پیشِ نظر رکھ کر ہمارے سامنے لائے گئے ہیں۔

"مقدمۂ شعروشاعری" لکھتے وقت حالی کے سامنے دو بنیادی مقاصد تھے۔ پہلا ایسی شاعری کے اصول بیان کرنا جواُن کے خیال میں مستحسن تھی اور جس کی وہ ترویج کرنا چاہتے تھے۔ دوسرا مقصد ان کا یہ تھا کہ وہ کلاسیکی شاعری کے بڑے سرمائے کو فرسودہ، بے معنی اور قابل ترک ثابت کریں۔ غور سے دیکھیں تو پہلا مقصد دوسرے مقصد کا تابع قرار پاتا ہے۔ کیونکہ حالی کے اصلاحی مقاصد کے تحت کلاسیکی سرمایہ غیر اہم اور بے معنی ہی نہیں بلکہ مضرت رساں بھی معلوم ہوتا تھا۔ ان مقاصد کی عمل آوری کے لیے حالؔی نے جو طریق کار اختیار کیا وہ یہ تھا کہ قدما کے ان خیالات کو قبول کریں جو ان کے مقصد کے مطابق تھے اور ایسے خیالات کی اپنے طور پر تاویل یا استرداد کریں جو ان کے مطلوبہ معیار سے مطابقت نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ حالی نے یورپ کے علمائے شعروادب کے ان خیالات سے بھی استفادہ کیا جو انہیں وقیع اور کارآمد نظر آئے۔ شاعری کے بارے میں حالی کا نقطۂ نظر افادیت پسندی کا تھا لہٰذا وہ اصلاً ایسی ہی شاعری کی وکالت کرتے ہیں جس سے سوسائٹی کو فائدہ پہنچے اور اس شاعری سے بیزاری اور نفرت کا اظہار کرتے ہیں جو غیر مفید ہو یا اس سے اخلاق میں گراوٹ پیدا ہو۔

حالی مجموعی حیثیت سے شاعری کو قابل مذمت شے تصور کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "شعر کی مدح وذم میں بہت کچھ کہا گیا ہے اور جس قدر اس کی مذمت کی گئی ہے وہ نسبت

مدح کے زیادہ قرین قیاس ہے"۔ حالی کو اعلیٰ شاعری کی خوبیوں اور تقریباً ہر زمانے میں اس کی مقبولیت کا پورا احساس تھا۔ اور چونکہ ہر زمانے میں شاعری کا تصور بنیادی اعتبار سے تخیل یا خیالی باتوں سے وابستہ رہا ہے لہٰذا حالی جب افادی نقطۂ نگاہ سے اس صورت حال کو دیکھتے ہیں تو انہیں اعلیٰ سے اعلیٰ شاعری میں بھی افادی پہلو نظر نہیں آتے۔ علاوہ ازیں وہ شاعری کے مذموم ہونے کی دلیل یہ کہہ کر بھی فراہم کرتے ہیں کہ "شعر جس قدر جہل و تاریکی کے زمانے میں ظہور کرتا ہے اسی قدر رونق پاتا ہے"۔ شاعری کے بارونق ہونے سے یہاں اس کا ترقی کرنا ہی مراد ہے۔ لہٰذا جب ترقی یافتہ شاعری بھی جہل و تاریکی کے زمانے کی پیداوار قرار پائی تو اس کے مذموم ہونے میں کیا شبہ رہا؟

اس کے باوجود حالی کو اس بات سے انکار نہیں کہ شاعری کا ملکہ قدرت کا عطا کردہ ہے۔ انہیں یہ بھی یقین ہے کہ قدرت کی عطا کردہ صلاحیتیں بلاوجہ نہیں ہوتیں۔ ان کا تقاضا ہے کہ انسان انہیں بروے کار لائے۔ شروع میں اگرچہ حالی پوری شاعری کو مذموم قرار دے دیتے ہیں لیکن پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "جو شخص اس عطیۂ الٰہی (یعنی ملکۂ شاعری) کو مقتضائے فطرت کے موافق کام میں لائے گا، ممکن نہیں کہ اس سے سوسائٹی کو کچھ نفع نہ پہنچے"۔ شاعری کے مقتضائے فطرت کے موافق ہونے سے حالی کی مراد یہ ہے کہ اس میں اصلیت سے بالکل تجاوز نہ کیا گیا ہو اور اس کی بنیاد محض بے بنیاد باتوں پر نہ ہو۔ چنانچہ ان کا خیال ہے کہ "شعر اگر اصلیت سے بالکل متجاوز اور شاعری محض بے بنیاد باتوں پر مبنی نہ ہو تو تاثیر اور دل نشینی اس کی نیچر میں داخل ہے"۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ شاعری کے مقتضائے فطرت کے موافق ہونے اور سوسائٹی کے لئے نفع بخش ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ پرتاثیر اور دل نشیں ہو، اور اس کے پرتاثیر اور دل نشیں ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اصلیت سے بالکل متجاوز ہو نہ اس میں محض بے بنیاد باتوں کا بیان کیا گیا ہو۔

ان خیالات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حالی شاعری کو علم اخلاق کے قبیل کی چیز

سمجھتے ہیں۔ اس کا اعتراف انہوں نے یہ کہہ کر کیا ہے کہ ''شعر اگر چہ علم اخلاق کی طرح تلقین اور تربیت نہیں کرتا لیکن از روے انصاف اس کو علم اخلاق کا نائب مناب اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں''۔ اس طرح جب شاعری علم اخلاق کی نائب مناب اور قائم مقام قرار پائی تو حالی کے لیے شاعری سے ان باتوں کا تقاضا کرنا لازمی ٹھہرا جن کا تقاضا علم اخلاق سے کیا جاتا ہے۔ قدما چونکہ شاعری اور علم اخلاق کو ایک دوسرے سے الگ جانتے تھے اس لیے ان کی نظر میں دونوں کے تقاضے بھی جدا تھے۔ لہٰذا انہیں اس بات کی ضرورت نہیں تھی کہ شاعری اور علم اخلاق کے تقاضوں کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کریں۔

شاعری میں علم اخلاق کے تقاضوں کی پابندی پر زور دینے کے نتیجے میں حالی نے شاعری سے ان ''فاسد'' عناصر کے اخراج کی شدت سے حمایت کی جن سے بقول ان کے سوسائٹی کے مذاق میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اگر چہ شاعری اور سوسائٹی کی خرابیوں کو ایک دوسرے کا نتیجہ قرار دیتے ہیں لیکن ان کا یہ بھی خیال ہے کہ ''اگر چہ شاعری کو ابتداً سوسائٹی کا مذاق فاسد بگاڑتا ہے مگر شاعری جب بگڑ جاتی ہے تو اس کی زہریلی ہوا سوسائٹی کو بھی نہایت سخت نقصان پہنچاتی ہے''۔ اس خیال سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالی قدیم شاعری کے ابتدائی نمونوں کو فاسد اور سوسائٹی کے لیے ضرر رساں نہیں مانتے بلکہ ان کے خیال میں ''جب شاعری ارتقائی منزلیں طے کرتی ہے اور اس میں جھوٹ اور مبالغہ سے زیادہ کام لیا جانے لگتا ہے تو وہ فاسد اور سوسائٹی کے لیے حد درجہ نقصان دہ ہو جاتی ہے'' اس طرح حالی کی نظر میں ابتدائی عہد کی شاعری یا غیر ترقی یافتہ شاعری (یعنی ایسی شاعری جو فی نفسہٖ اعلیٰ فنی خوبیوں کی حامل نہیں ہوتی) زیادہ وقیع ٹھہرتی ہے۔ تقریباً یہی خیال محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' میں ظاہر کیا ہے، جہاں وہ کہتے ہیں کہ ''ہر ایک زبان اور اس کی شاعری جب تک عالم طفولیت میں ہوتی ہے تب تک بے تکلف، عام فہم اور اکثر حسب حال ہوتی ہے۔ اس واسطے لطف انگیز ہوتی ہے''۔ اس کے برعکس بقول حالی ''شاعری جب ترقی کرتی

جاتی ہے تو لوگوں کا مذاق بدلنے لگتا ہے اور ان کے دل و دماغ کو حقائق و واقعات سے روز بروز مناسبت کم ہوتی جاتی ہے۔ عجیب و غریب باتوں، سوپر نیچرل کہانیوں اور محال خیالات سے دلوں کو انشراح ہونے لگتا ہے۔ تاریخ کے سیدھے سادے وقائع سننے سے جی گھبرانے لگتے ہیں۔ جھوٹے قصے اور افسانے، حقائق واقعیہ سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتے ہیں''۔

ان خیالات سے واضح ہو جاتا ہے کہ حالی اس شاعری کو قابل اعتنا اور مستحسن سمجھتے ہیں جس میں خیالات تاریخ کے سیدھے سادے واقعات کی طرح بیان ہوں۔ اور جس میں جھوٹے قصوں اور افسانوں کا دخل نہ ہو۔ ان کا یہ خیال حد درجہ شدت پسندانہ کہا جا سکتا ہے کیونکہ شاعری کو تاریخ کی طرح محض سیدھے سادے سچے واقعات کے بیان کا تابع بنا دینا شاید کسی کے لیے بھی قابل قبول نہ ہو۔ حالی کے ذہن پر اخلاقی معیارات اس قدر حاوی تھے کہ وہ شاعری کو فقط شاعری کے معیاروں کی روشنی میں دیکھنے کے روادار نہ ہوئے۔

اب تک کی بحث سے حالی کا یہ مطمح نظر سامنے آتا ہے کہ شاعری میں جو کچھ بیان ہو اور جس طرح بیان ہو، وہ اخلاقیات کے اصولوں سے متصادم نہ ہو، بلکہ ان اصولوں سے جس قدر ہم آہنگ ہو اتنا ہی بہتر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے نفس شاعری سے ان چیزوں کو ہی خارج کر دیا جو ان کے مطابق شاعر کی ادائیگی خیالات میں حائل ہوتی ہیں۔ چنانچہ اصولی اعتبار سے وزن کو بھی حالی شعر کے لیے غیر ضروری قرار دیتے ہیں اور اسے نفس شعر میں داخل تسلیم نہیں کرتے۔ وہ لکھتے ہیں

> شعر کے لیے وزن ایک ایسی چیز ہے جیسے راگ کے لیے بول۔ جس طرح راگ فی حد ذاتہٖ الفاظ کا محتاج نہیں اسی طرح نفس شعر وزن کا محتاج نہیں۔ اس موقع پر جیسے انگریزی میں دو لفظ مستعمل ہیں ایک پوئٹری اور دوسرا ورس،

> اسی طرح ہمارے ہاں بھی دو لفظ استعمال میں آتے ہیں
> ایک شعر اور دوسرا نظم اور جس طرح ان کے ہاں وزن کی
> شرط پوئٹری کے لیے نہیں بلکہ ورس کے لیے ہے، اسی طرح
> ہمارے ہاں بھی یہ شرط شعر میں نہیں بلکہ نظم میں معتبر ہونی
> چاہیے۔

یہاں شعر کے لیے وزن کے غیر ضروری ہونے کا خیال اس لیے زیادہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ حالی اسکا استدلال انگریزی شاعری کی مثال سے کرتے ہیں۔ اول تو یہی مناسب نہیں کہ دو مختلف تہذیبوں کی شاعری کو ایک دوسرے کی روشنی میں دیکھا جائے اور ایک کے لیے دوسرے کی مثال لائی جائے۔ دوسرے یہ بات بھی نظر میں رکھنے کی ہے کہ انگریزی شاعری میں ہمیشہ ایسا نہیں ہوا ہے کہ اسے وزن کی قید سے آزاد رکھا گیا ہو۔ غالبًا حالی کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ اس سلسلے میں انگریزی کی مثال لوگوں کے لیے قابل قبول نہ ہوگی۔ چنانچہ وہ قدیم عرب کی شاعری کی بھی مثال لاتے ہیں اور شعر و وزن کے تعلق سے مشرقی علمائے ادب کے خیالات بھی پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں

> قدیم عرب کے لوگ یقیناً شعر کے یہی معنی سمجھتے تھے (یعنی
> نفس شعر میں وزن کو داخل نہیں جانتے تھے) جاہلیت کی
> قدیم شاعری میں زیادہ تر اسی قسم کے برجستہ اور دل آویز
> فقرے اور مثالیں پائی جاتی ہیں جو عرب کی عام بول چال
> سے فوقیت اور امتیاز رکھتی تھیں۔ یہی سبب تھا کہ جب قریش
> نے قرآن مجید کی نرالی اور عجیب عبارت سنی تو جنھوں نے
> اس کو کلام الٰہی نہ مانا وہ رسول اللہ صلی اللہ وعلیہ وسلم کو شاعر
> کہنے لگے۔ حالانکہ قرآن شریف میں وزن کا مطلق التزام
> نہ تھا۔

یہاں اس بات کا ثبوت فراہم نہیں کیا گیا ہے کہ زمانہ جاہلیت کی قدیم شاعری میں جس طرح کے برجستہ اور دل آویز فقروں کی مثال لائی گئی ہے اور جنہیں عام بول چال کے مقابلے میں فوقیت رکھنے والے کہا گیا ہے، انہیں فی نفسہٖ شعر کی حیثیت حاصل تھی یا انہیں محض چند شاعرانہ خصوصیات کے حامل فقرے ہی سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ شاعرانہ بیان کی صفات میں ندرت اور نرالا پن بھی شامل ہے۔ لہٰذا ممکن ہے قدیم عرب کے لوگ ایسے فقروں کی برجستگی اور ندرت کی بنا پر انہیں شاعرانہ انداز کے فقرے سمجھتے رہے ہوں اور ان کی نگاہ میں ایسے فقروں کی حیثیت فی نفسہ شعر کی نہ رہی ہو۔ حالیؔ کا یہ خیال بھی مبنی برحقیقت نہیں کہ قرآن میں وزن کا مطلق التزام نہیں ہے۔ تعجب ہے انہوں نے ایسی بات لکھی جو خلاف واقعہ ہے۔ قرآن میں وزن ہی نہیں بلکہ قوافی کا التزام بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ سورۂ رحمٰن کی مثال سامنے کی ہے۔ چونکہ قرآن میں نفس شعر سے متعلق بہت سی باتیں پائی جاتی ہیں، اسی لیے قدما نے جب شعر کی تعریف کی تو اس میں بالقصد کی شرط بھی لگا دی تاکہ قرآن کو محض شاعری نہ ثابت کیا جا سکے۔ اپنے استدلال کو مزید مستحکم کرنے کے لیے حالی محقق طوسی کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ حالی کہتے کہ ''محقق طوسی اساس الاقتباس میں لکھتے ہیں کہ عبری اور سریانی اور قدیم فارسی شعر کے لیے وزن حقیقی ضروری نہ تھا، سب سے پہلے وزن کا التزام عرب نے کیا ہے''۔ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ محقق طوسی کے لفظوں میں شعر کی تعریف نقل کر دی جائے۔ ان کے الفاظ ہیں ''شعر نزد منطقیاں کلام مخیل موزوں باشد و در عرف جمہور کلام موزوں مقفیٰ''۔ اس عبارت کا ترجمہ مظفر علی اسیر لکھنوی نے یہ کیا ہے۔ ''شعر نزدیک منطقیوں کے کلام مخیل معتدل ہے اور عرف جمہور میں یعنی نزدیک شعرا کے کلام موزوں بوزن عروضی اور مقفّیٰ ہے۔ اسیر لکھنوی نے معیار الاشعار کے ترجمے میں محقق طوسی کی کتاب اساس الاقتباس کی وہ عبارت بھی درج کی ہے جس کا حوالہ حالی نے دیا ہے۔

اساس الاقتباس کی وہ عبارت اس طرح ہے

بعضی قدما کلام مخیل را شعر گفته اند اگر چہ وزن حقیقی نداشتہ باشد چنانکہ بعضے اشعار ہمچناں است و در دیگر لغات قدیم مانند عبری، سریانی و فرس قدیم ہم وزن حقیقی اعتبار نکردہ اند و وزن حقیقی اول عرب را بودہ۔

اسیر لکھنوی نے محقق طوسی کی دونوں کتابوں "معیار الاشعار" اور "اساس الاقتباس" کی درج بالا دونوں عبارتوں کی شرح بھی کی ہے جسے یہاں نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے

فقیر کے ذہن میں یہ آتا ہے کہ شعر کے واسطے وزن ضروری ہے اور یہی وزن فارق ہے درمیان نثر اور نظم کے ورنہ کلام مخیل دونوں ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے (ما علمناہ الشعر) یعنی نیا موختہ پیغمبر صلی اللہ ولیہ وسلم را شعر۔ شک نہیں کہ کلام خدا میں بھی شعر سے مراد کلام موزوں ہے اور منطقی کو غرض اور بحث قضایائے تخیلیہ سے ہے نظم ہو خواہ نثر مگر تعریف نظم اور نثر کی اس کے نزدیک بھی علاحدہ علاحدہ ہے۔ نثر فقط کلام مخیل ہے اور نظم کلام مخیل موزوں جو اہل عروض کے نزدیک ہے۔ مگر بحث وزن سے کام اہل عروض کا ہے نہ کام اہل منطق کا پس محقق علیہ رحمہ تعریف شعر میں فرماتے ہیں کہ شعر نزد منطقیان مخیل موزوں ہے غرض اور بحث منطق بیان نہیں کرتے اور شک نہیں کہ اگر قید موزوں کی نہ ہو نثر بھی نظم میں داخل ہو جائے کہ کوئی کلام تخیل سے خالی نہیں نظم ہو خواہ نثر اور حال اہل منطق کا اس باب میں یہ ہے کہ متقدمین ان میں دو فرقے ہیں۔

> بعضوں نے فقط کلام مخیل کو شعر کہا ہے اور ان کو اپنے مطلب سے مطلب ہے اور فرقۂ ثانی نے وزن کو معتبر جانا تا فارق ہو درمیان نثر اور نظم کے۔ چنانچہ یہ دعویٰ کہ بعضے قدما وزن را داخل شعر نکردہ اند اور عبارت اساس الاقتباس سے کہ بعض قدما کلام مخیل را شعر گفتہ اند اگرچہ وزن حقیقی نداشتہ باشد صاف پیدا ہے، کس واسطے کہ جب کہا بعض قدما نے اعتبار نہیں کیا لازم آیا کہ بعض دیگر نے اعتبار کیا ہے اور متاخرین اہل منطق کا یہ حال ہے کہ کل ان کے وزن کو اعتبار کرتے ہیں بلکہ قافیے کو بھی پس ان دلیلوں سے نزدیک متامل کے پیدا ہے کہ شعر کو وزن سے چارہ نہیں اور اہل منطق بھی اس کو داخل حد جانتے ہیں، ہر چند غرض اور بحث ان کو تخییل سے ہے۔ پس قول محقق صحیح ٹھہرا۔

اس صراحت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وزن شعر کے لیے غیر ضروری نہیں ہے۔ واضح رہے کہ حالی وزن کی اہمیت کا اعتراف بالآخر ان الفاظ میں کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ''اس میں شک نہیں کہ وزن سے شعر کی خوبی اور اس کی تاثیر دوبالا ہو جاتی ہے''۔ اس کے باوجود وزن کی پابندی کو وہ اس لیے گوارا نہیں کرتے کہ اس سے خیال کی ادائیگی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ دراصل حالی کی توجہ اس بات پر زیادہ تھی کہ شعر میں جو کچھ بیان کیا جائے وہ خود اس قابل ہو کہ اس پر شاعری کا اطلاق ہو سکے۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو یہ خیال ان کے مقصد کے مطابق تھا۔ کیونکہ جب اصلاحی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر شاعری کی جائے گی تو شاعر کو لازماً ان باتوں کا زیادہ خیال رکھنا پڑے گا جنھیں شعر میں اسے بیان کرنا ہے۔ حالی کے اس خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد کی بیشتر تنقیدوں میں فن پارے کے موضوع یعنی

Content کو جس قدر اہمیت حاصل ہوئی اتنی فن پارے کے دوسرے لوازمات کو حاصل نہ رہی۔ کیونکہ بقول حالی ''شعر میں بہت سے دیگر لوازمات کی پابندی کرنے سے شاعر کو اپنے خیال کے اظہار میں دشواری پیدا ہوتی ہے''۔ چنانچہ قافیہ کے سلسلے میں بھی حالی کا نقطۂ نظر وہی ہے جو وزن کے سلسلے میں ہے۔ وہ قافیہ کو شعر کے لیے اسی طرح غیر ضروری سمجھتے ہیں جس طرح وزن کو۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا حالی کی بیشتر توجہ خیال کی ادائیگی پر رہی ہے اور اس مقصد کی تکمیل میں وہ ایسی کوئی قید گوارا نہیں کرنا چاہتے جس سے خیال کی ادائیگی میں کسی طرح کا خلل واقع ہو۔ محقق طوسی نے شعر کی جو تعریف کی ہے اور جو اوپر درج بھی کی گئی اس میں وزن کے ساتھ ساتھ قافیہ کو بھی شعر میں داخل کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قافیہ شعر کے لیے ویسا ہی ضروری ہے جیسے وزن۔ لیکن حالی چونکہ خاص مقصد کے تحت شعر کی ماہیت سے بحث کر رہے ہیں لہٰذا ان کی نظر میں قافیہ بھی شعر کی ماہیت سے خارج قرار پاتا ہے۔ غالباً اسی لیے حالی کو ''موجودہ شاعری'' (یعنی قدیم کلاسیکی شاعری) میں ایسی کوئی خصوصیت نظر نہیں آتی جس کی بنا پر ان کے خیال میں اس شاعری پر شاعری کا اطلاق ہو سکے۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ قدیم زمانے کی شاعری میں موضوع یا خیال کو کم از کم وہ ترجیحی حیثیت حاصل نہیں تھی جس کی حالی حمایت کرتے ہیں۔

اس کے بعد حالی جس چیز کو شاعری کے لیے سب سے مقدم اور ضروری بتاتے ہیں وہ قوت متخیلہ یا تخیل ہے اور ان کے خیال میں یہی وہ شے ہے جو شاعر کو غیر شاعر سے ممیز کرتی ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ''یہ قوت جس قدر شاعری میں اعلیٰ درجے کی ہوگی اسی قدر اس کی شاعری اعلیٰ درجے کی ہوگی۔ اور جس قدر یہ ادنیٰ درجے ہوگی اسی قدر اس کی شاعری ادنیٰ درجے کی ہوگی''۔ شاعری کے لوازمات میں تخیل کی بنیادی حیثیت تسلیم، لیکن شاعری اور غیر شاعری میں امتیاز قائم کرنے کے لیے تخیل کو ہی سب سے مقدم شے قرار دینا پوری

طرح سچ نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ تخئیل بہت اعلیٰ درجے کی ہو لیکن شاعری کے دیگر لوازم اگر اس درجے کے نہ ہوں تو وہ شاعری محض تخئیل کی بلندی کی وجہ سے اعلیٰ قرار نہیں پائے گی۔

شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لیے حالی "نسخہ کائنات اور نسخہ فطرت انسانی کے بغور مطالعے کو نہایت ضروری" قرار دیتے ہیں۔ انہیں ہم امداد امام اثر کے الفاظ میں خارجی اور داخلی امور کا مطالعہ کہہ سکتے ہیں۔ ان امور کے ساتھ ساتھ حالی الفاظ کے تلاش و تفحص کو بھی نہایت ضروری بتاتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ دوسرا مطالعہ بھی ویسا ضروری اور اہم ہے جیسا کہ پہلا یعنی کائنات اور فطرت انسانی کا مطالعہ۔ یہاں حالی کا نقطۂ نظر بڑی حد تک متوازن صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ حالی کہتے ہیں کہ

> شعر کی ترتیب کے وقت اول متناسب الفاظ کا انتخاب کرنا اور پھر ان کو ایسے ترتیب دینا کہ شعر سے معنیٰ مقصود کے سمجھنے میں مخاطب کو کچھ تردد باقی نہ رہے اور خیال کی تصویر ہو بہو آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ اور باوجود اس کے اس ترتیب میں ایک جادو مخفی ہو جو مخاطب کو مسخر کر لے۔ اس مرحلے کا طے کرنا جس قدر دشوار ہے اسی قدر ضروری بھی ہے۔

اگر چہ اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حالی شعر میں اسی معنی کو معتبر تصور کرتے ہیں جو مقصود شاعر ہو لیکن شعر میں کثرت معنی کے مباحث کے نتیجے میں اب یہ تصور بڑی حد تک بدل چکا ہے کہ شعر میں وہی معنی معتبر ہونا چاہیے جو شاعر نے مراد لیا ہو۔ درج بالا اقتباس میں حالی شعر میں مخفی جس جادو کا ذکر کرتے ہیں اس سے غالباً شعر کی تاثیر اور اثر انگیزی مراد ہے۔ حالی وغیرہ شعر کی تاثیر کے حد درجہ قائل تھے اور دراصل اسی کو سچی شاعری تصور کرتے تھے جس میں تاثیر کی فراوانی ہو۔

شعر کے تعلق سے آمد اور آورد کی بحث اگر چہ زیادہ قابل اعتبار نہیں کیونکہ اس کا تعلق موضوعی صورت حال سے ہے لیکن اس سلسلے میں حالی کا یہ خیال بڑی حد تک صحیح ہے کہ ''مستثنیٰ حالتوں کے سوا ہمیشہ وہی شعر زیادہ مقبول زیادہ لطیف، زیادہ بامزہ، زیادہ سنجیدہ اور زیادہ موثر ہوتا ہے جو کمال غور وفکر کے بعد مرتب کیا گیا ہو''۔ دراصل شعر گوئی کا عمل اتنا داخلی اور پراسرار ہوتا ہے کہ شعر کے مکمل ہونے کے بعد یہ فیصلہ تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے کہ اس میں کتنی آمد ہے اور کتنا آورد ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں زیادہ قابل اعتبار خیال وہی ہونا چاہیے جو حالی نے پیش کیا ہے۔

شعر میں الفاظ کو معنی پر فوقیت یا معنی کو الفاظ پر؟ یہ سوال قدیم زمانے سے زیر بحث رہا ہے۔ چنانچہ ابن رشیق نے کتاب العمدہ میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے اور ان کے خیال کی رو سے شعر میں الفاظ کو معنی پر ترجیح حاصل ہے۔ اس سلسلے میں حالی کا نقطۂ نظر بھی کم وبیش یہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے لکھا ہے کہ ''ہم یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ شاعری کا مدار جس قدر الفاظ پر ہے اس قدر معانی پر نہیں۔ معنی کیسے ہی بلند اور لطیف ہوں اگر عمدہ الفاظ میں بیان نہ کیے جائیں گے، ہرگز دلوں میں گھر نہیں کر سکتے لیکن معانی سے یہ سمجھ کر وہ ہر شخص کے ذہن میں موجود ہیں اور ان کے لیے کسی ہنر کے اکتساب کی ضرورت نہیں، بالکل قطع نظر کرنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا''۔

الفاظ اور معنی کے تعلق سے حالی کا موقف ائمہ فن سے مختلف نہیں لیکن شاید انہیں معنی کی اہمیت کے خطرے میں پڑنے کا احساس بھی تھا اس لیے انہوں نے معنی کی اہمیت پر بھی زور دے ڈالا۔ ہمارے خیال میں الفاظ اور معنی کی بحث میں دونوں کو جس طرح الگ الگ اکائی کی صورت میں دیکھا گیا ہے وہ شاید مناسب رویہ نہیں ہے۔ چونکہ الفاظ خود معنی کے حامل ہوتے ہیں اس لیے ایسا نہیں ہو سکتا کہ الفاظ پر زیادہ توجہ دینے سے معانی متاثر نہ ہوں۔ واضح رہے کہ لفظ اور معنی کی اس بحث میں ''معنی'' کو ''مضمون'' کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حالی مضمون آفرینی کے اصول کے سلسلے میں کشمکش کا شکار تھے۔ کیونکہ کلاسیکی شعریات میں مضمون آفرینی کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔ کلاسیکی غزل میں پہلے سے موجود مضامین کو اس طرح شعر میں باندھا جاتا کہ اس میں کوئی ندرت ضرور پیدا ہو۔ حالی اس اصول سے بخوبی واقف تھے اور انہیں یہ بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ کلاسیکی شاعری میں اس اصول کی کیا اہمیت رہی ہے اور اس سے شاعری کو کیا ترقی ہوئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں

> . قدما کے کلام میں بعض اوقات کوئی کمی رہ جاتی ہے جس کو پچھلے پورا کر دیتے ہیں۔ متاخرین اس کے لیے ایک نرالا اسلوب پیدا کر لیتے ہیں اور متاخرین قدما کے اسلوب میں سے ایک خوبی کم کر کے ایک دوسری خوبی بڑھا دیتے ہیں اور اس سے شاعری کو بے انتہا ترقی ہوتی ہے۔ پس یہ کیوں کر ہوسکتا ہے کہ شاعر اپنے محدود فکر اور تخیل پر بھروسا کر کے قدما کی خوشہ چینی سے دست بردار ہو جائے۔

یہاں حالی نے ایک طرح سے مضمون آفرینی کی تعریف بیان کر دی ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ عمدہ تعریف، بیان کی ہے۔ کیونکہ کلاسیکی شاعری میں یہ اصول بنیادی حیثیت سے کارفرما نظر آتا ہے۔ اس اصول کی عملی صورت دکھانے کے لیے حالی نے متعدد مثالیں اساتذہ کے اشعار سے دی ہیں۔ ہم ان میں سے سعدی اور اور میر تقی میر کے اشعار نقل کرتے ہیں

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بہ تو دادم
باید اول بہ تو گفتن کہ چنیں خوب چرایی

سعدی

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ

ان سے بھی تو پوچھئے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

میر تقی میر

مضمون آفرینی کے اصول کے تفاعل کے تعلق سے ایک جگہ اور حالی نے
خیال ظاہر کیا ہے جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس اصول کو مستحسن تصور کرتے۔
اس بحث سے واضح ہو جاتا ہے کہ مضمون آفرینی کا اصول حالی کی نظر میں مستحسن تھا لیکن
اصول کے سلسلے میں حالی کی جس کشمکش کا اوپر ذکر کیا گیا اس کا سبب یہ ہے کہ کلاسیکی شا
جس کی بنیاد مضمون آفرینی کے اصول پر ہے، حالی کی نگاہ میں ایسی کسی خوبی کی حامل
ٹھہرتی جس کی بنا پر وہ اسے مستحسن قرار دیں۔ یعنی ایک طرف تو حالی مضمون آفرینی
اصول کی حد درجہ تحسین کرتے ہیں لیکن اسی اصول پر مبنی شاعری کو وہ لائق تحسین نہیں سمجھ
اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مضمون آفرینی کے اصول میں شعر کے خیال کو وہ حیثیت
حاصل نہیں ہوتی جو حیثیت حالی اسے دینا چاہتے ہیں۔ لہٰذا جب وہ اس نقطۂ نظر سے مضم
آفرینی کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں تو یہی اصول ان کی نظر میں معیو
ٹھہرتا ہے۔ دراصل حالی جب اس اصول کو کلاسیکی شاعری کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو یہ ا
اس شاعری میں بنیادی اصول کی حیثیت سے نظر آتا ہے۔ لہٰذا اس صورت میں وہ ا
مستحسن قرار دیتے ہیں لیکن جب وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ کلاسیکی شاعروں نے مضم
آفرینی کے اصول کی پابندی میں شعر کے خیال یا موضوع کو وہ اہمیت نہیں دی ہے اور
کی نگاہ میں شعر کا خیال بھی بڑی اہمیت کا حامل تھا، اس لیے وہ مضمون آفرینی کے اس عم
جو کلاسیکی شاعری میں روا رکھا گیا تھا، شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور اس اصول پر
شاعری بالخصوص غزل کو زیادہ قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ غزل کی تنقید کے تعلق سے حالی نے ''مقا

شعروشاعری" میں جن بنیادی تصورات پر زور دیا اور جنہیں عام کرنے کی کوشش کی ان کا تعلق کلاسیکی غزل کے اصولوں سے کم اور خود حالی کے اپنے تصورات سے زیادہ تھا۔ حالی نے وہی باتیں زیادہ کہیں جو غزل کے تعلق سے ان کے اپنے تصورات سے زیادہ مطابقت رکھتی تھیں خواہ ان باتوں کی روشنی میں کلاسیکی اصول شاعری درست نہ ٹھہرے۔ جیسا کہ اس طویل بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالی کے تصورات کی روشنی میں کلاسیکی شاعری بالخصوص غزل کا تقریباً تمام سرمایہ حددرجہ بے معنی اور غیر اہم قرار پاتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حالی کے خیالات کو نئے زمانے میں غزل کی تنقید کے تعلق سے بوجوہ بے انتہا شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی۔

قاضی عبدالودود تحقیقی وتنقیدی جائزے

مرتب پروفیسر نذیر احمد

قاضی عبدالودود اُردو فارسی کے عظیم دانشور اور محقق تھے۔انہوں نے اردو کو نئی جہات سے آشنا کیا۔اس کتاب میں قاضی صاحب کی شخصیت اور ان کے تحقیقی کارناموں سے متعلق مضامین شاملِ اشاعت ہیں، جنہیں ملک کے چوٹی کے محققوں اور ادیبوں نے تحریر کیا ہے۔

عمدہ طباعت، خوبصورت گٹ اپ

صفحات ۲۸۰

قیمت ۶۰ روپے

محمد مشتاق تجاروی

مولانا حالیؔ کی ایک اہم تصنیف

ضمیمۂ کلیات حالی:

خواجہ الطاف حسین حالیؔ اردو کے مسلّم نقاد، ادیب اور شاعر ہیں۔ ان کی متعدد کتابوں کو لازوال شہرت نصیب ہوئی۔ 'مقدمۂ شعروشاعری' اردو تنقید کی بلند پایہ کتاب ہے، 'یادگارِ غالب'، غالبیات کا اہم ترین مرجع ہے، 'حیات جاوید' سرسید احمد خاں کی حیات اور ان کی جملہ مساعی کا ایک جامع مرقع ہے۔ ان کے علاوہ 'حیاتِ سعدی' ان کی ایک اہم نثری تصنیف ہے۔

نثر کے علاوہ نظم میں بھی مولانا حالی کا مقام بہت بلند ہے۔ انہوں نے روایتی شاعری سے ہٹ کر بامقصد شاعری کی نہج اختیار کی۔

نظم میں مولانا کا سب سے اہم کارنامہ 'مسدس حالی' ہے، اس کتاب میں دنیا کے مسلمانوں کی تاریخ پر ایک بامقصد تبصرہ ہے۔ اس میں آغاز اسلام، مختلف علوم وفنون میں مسلمانوں کی غیر معمولی خدمات اور مسلمانوں کی سیاسی وثقافتی عظمتوں کا بیان ہے۔ پھر

اسلامیان عالم کی ذلت ونکبت اور مسلم حکومتوں کی بدحالی، مسلمانوں میں در آنے والی اخلاقی خرابیوں وغیرہ کا بیان ہے۔

مسدس کے علاوہ مولانا کا ایک مجموعۂ شعری 'کلیات حالی' کے نام سے ہے۔ اس دیوان میں ''مرثیۂ غالب'' اور ''مناجات بیوہ'' جیسی لازوال اور شہرہ آفاق نظمیں بھی شامل تھیں۔

مولانا کا یہ تمام کام اردو میں ہے اگرچہ اس میں عربی فارسی مراجع سے بہت استفادہ کیا گیا ہے، متعدد مقامات پر عربی فارسی کے اشعار نقل کیے ہیں۔ مولانا نے اپنی کتابوں میں تقریباً ۵۰ عربی شعر یا تو اصل عربی میں درج کیے ہیں یا ان کا ترجمہ نقل کیا ہے، اسی طرح فارسی کے اشعار بھی انہوں نے بکثرت استعمال کیے ہیں۔

عربی فارسی مراجع سے استفادہ کے ساتھ ساتھ مولانا ان دونوں زبانوں میں نثر بھی لکھتے تھے اور شعر بھی کہتے تھے، دونوں زبانوں میں مولانا کا ایک معتد بہ کلام موجود ہے۔

مولانا حالی کی عربی و فارسی کی تعلیم کی تفصیلات ان کی سوانح میں موجود ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے مدرسہ حسین بخش میں تعلیم پائی تھی اور ان کے اساتذہ میں مولوی نوازش علی، مولوی فیض حسن، مولوی امیر احمد وغیرہ شامل تھے، میاں نذیر حسین محدث دہلوی کے درس سے بھی انہوں نے استفادہ کیا تھا[۱]۔ خاص طور پر مولوی عبدالرحمٰن پانی پتی، مولوی محب اللہ وغیرہ سے جن سے حالی نے حدیث و تفسیر کی کتابیں پڑھیں تھیں[۲]۔

مولانا نے عربی فارسی لکھنے کی ابتدا اس وقت کی جب وہ جہانگیر آباد میں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے ساتھ رہتے تھے، اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں

> ''انہیں دنوں میں تنہائی اور قلت مشاغل کے سبب عربی ادب کی ہوس دل میں چٹکیاں لینے لگی، اگرچہ علم ادب کسی استاد سے باقاعدہ پڑھنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا اور نہ کسی

ادیب سے اصلاح لینے کا موقعہ ملا تھا مگر چونکہ لٹریچر سے فی الجملہ مناسبت تھی کبھی کبھی ڈکشنریوں کی مدد سے ادب کی آسان آسان کتابیں دیکھنے لگا۔ شدہ شدہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ عربی نظم ونثر پر خودرو مبتدیوں کی طرح ہاتھ ڈالنے کی جرأت ہوئی[۳]۔

مولانا کی یہ نظم ونثر بقول خود مولانا کے مختلف مسودات میں متفرق پڑی ہوئی تھی۔ مولانا کا خیال تھا کہ یہ دونوں زبانیں ہندوستان میں مردہ ہو چکی ہیں اس لیے ان تحریروں کے تحفظ کی کوئی شکل اس کے سوا نہیں کہ ان کو یکجا جمع کر دیا جائے[۳]۔''

مولانا نے ''ضمیمہ کلیات حالی'' زندگی کے آخری دور میں ترتیب دیا، اکتوبر ۱۹۱۲ء سے دسمبر ۱۹۱۲ء کے دوران مولانا کا قیام فرید آباد میں ڈاکٹر لیاقت حسین پانی پتی کے پاس رہا۔ اسی دوران مولانا نے یہ کلام جمع کیا اور اس پر ایک مقدمہ لکھا[۵]۔ اس مجموعہ کا بیشتر کلام ۱۳۲۰ء تک کا ہے آخری فارسی نظم مرثیۂ سرسید ہے جو ۱۸۹۸ء میں نظم ہوا[۶]۔

صالحہ عابد حسین نے لکھا ہے کہ مولانا کا یہ مجموعہ ان کی زندگی ہی میں اشاعت کے لیے چلا گیا تھا، لیکن مولانا کے انتقال کے بعد شائع ہوا[۷]۔ شائد یہ اطلاع درست نہیں اس لیے کہ شیخ اسمٰعیل پانی پتی نے اس کی صراحت کی ہے کہ یہ مجموعہ مولانا کے انتقال سے چند ماہ پیشتر اگست ۱۹۱۴ء میں شائع ہو گیا تھا[۸]۔ مولانا کا انتقال ۳۱ ردسمبر ۱۹۱۴ء کو ہوا۔ اس طرح مولانا کے انتقال سے چار ماہ قبل یہ مجموعہ اشاعت پذیر ہو چکا تھا۔

مولانا حالی کا یہ مجموعہ مولانا یعقوب مجددی پانی پتی کی حسب فرمائش حافظ عبدالستار بیگ نے اپنے مطبع تحفہ ہند پریس دہلی سے ۱۳۳۲ء میں شائع کرایا تھا اس سے بھی عندیہ ملتا ہے کہ یہ مولانا کی حیات میں شائع ہو چکا تھا چونکہ مولانا کا انتقال ۱۳رصفر ۱۳۳۳ میں ہوا تھا۔ سرِ ورق پر یہ عبارت درج ہے

ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی، مشتمل بر نظم ونثر فارسی عربی

یہ کتاب ۱۵۶ صفحات پر مشتمل ہے اس کا بیشتر حصہ یعنی ص ۱۱۹ تک فارسی تحریروں پر مشتمل ہے اور بقیہ میں عربی تحریریں ہیں۔ فارسی حصہ میں سب سے پہلے ۱۹ غزلیں ہیں جن میں دو غزلیں ناتمام ہیں۔ حالی نے لکھا ہے کہ یہ غزلیں روایتی انداز کی ہیں ان کے اصلاحی خیالات کا پرتو نہیں ہے یہ اس دور کی ہیں جب ان کے خیالات میں تغیر نہیں ہوا تھا، لکھتے ہیں

> یہ غزلیں اس زمانے کی ہیں جب کہ خیالات میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں ہوا تھا، جس قسم کے مضامین غزلوں میں اوپر سے بندھتے چلے آتے تھے اسی روش پر چند غزلیں لکھی گئیں تھیں، جن کو معدودے چند کے سوا اپنے موجودہ خیالات کے موافق پبلک میں پیش کرنے کے لائق نہیں سمجھتا تھا، لیکن بعض احباب کے اصرار سے ان کو اس مجموعے میں شامل کرنے پر مجبور ہوا"۔[۹]

لیکن مولانا کی یہ روایتی شاعری معنی آفرینی اور سلاست کے بہترین معیار پر فائز ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار یہ ہیں

شیخ معبودت نہ معبود من است   سجدہ ام بر آستانے دیگر است

با ہزاراں رنگ باید ساختن   یار را ہر لحظہ شانے دیگر است

اہل دیں معذور دارندم کہ من   آنچہ گویم از زبانے دیگر

بعض غزلیں عارفانہ اسلوب میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ بعض عشق کی نزاکتوں کا بیان کرتی ہیں۔ ان غزلیات کے بعد مرزا غالب کی نعتیہ غزل کی تخمیس ہے۔ حالی نے صراحت کی ہے کہ یہ تخمیس انہوں نے مرزا غالب کی حیات میں کی تھی۔[۱۰]

اس کے بعد چند رباعیاں ہیں۔ کچھ رباعیاں مواقع وشخصیات سے متعلق ہیں جیسے مولانا شبلی کے زخم پا پر ایک رباعی ہے یا مثلاً نواب ضیاء الدین احمد خاں کی مدح میں ایک رباعی ہے۔ قاضی ممتاز حسین (پہلی بھیت) کی مدح میں بھی چند رباعیاں ہیں۔

رباعیات کے بعد قصائد ہیں جن میں نواب کلب علی خاں والی رامپور کی مدح میں چند قصیدے ہیں۔ ایک قصیدہ نواب محمد علی خاں خلف نواب مصطفیٰ خاں کی مدح میں بھی ہے۔ اس کے بعد قطعات تاریخ وفات ہیں اس میں ایک قطع سید ہبر علی جو سر سید کے بھائی کے نواسے تھے ان کے بیٹے سید محمود کی نوعمری میں وفات پر ہے، اس حصہ میں دو قطعات بھی مرزا غالب کو مخاطب کر کے کہے ہیں۔ ان کے بارے میں یادگا غالب میں لکھا ہے کہ مرزا غالب کے ترک صوم وصلوٰۃ پر مولانا حالی نے ان کو نصیحت آمیز خط لکھا تھا جس پر غالب نے خفگی کا اظہار کیا، اس کے بعد بطور معذرت حالی نے یہ قطعے نظم کر کے مرزا غالب کی خدمت میں ارسال کیے یہ دونوں قطعے یادگار غالب میں بھی شامل ہیں۔

اس کے علاوہ نواب سالار جنگ کا ایک مرثیہ ہے۔ چند قطعات مختلف لوگوں کے بارے میں ہیں اور ایک ایک قطعہ نواب حامد علی خاں والی رامپور اور امیر حبیب اللہ خاں والی افغانستان کی مدح میں ہے۔

ترکیب بند کے زیر عنوان سب سے اہم نظم سر سید احمد خاں کا مشہور مرثیہ ہے جس کا یہ شعر ضرب المثل ہے

زیستن در فکر قوم و مردن اندر بند قوم
گر توانی می توانی سید احمد خاں شدن

اس نظم میں سات بندوں پر مشتمل ۷۰ راشعار ہیں۔ ایک قطعہ مولانا شبلی کی صحت یابی پر بھی ہے۔ اس کے بعد تاریخی مادوں پر مشتمل قطعات ہیں۔ ان میں میر مہدی مجروح کے دیوان کا قطعہ تاریخ، سید مہربان علی (گلاؤٹھی) کے مکان کی تعمیر نواب ضیاء الدین احمد

خاں اور مولوی چراغ علی کا قطعہ تاریخ وفات شامل ہے اور بھی چند شخصیات کے
تاریخ وفات ہیں۔

فارسی نثر کو مولانا نے جدید نثر اور قدیم نثر میں تقسیم کیا ہے۔ نثر جدید
سے اہم اور جامع تحریر حکیم ناصر خسرو کے سفرنامہ کا مقدمہ ہے۔ یہ مقالہ کت
۲۶ صفحات پر مشتمل ہے اس میں ناصر خسرو کی شخصیت و سوانح معتبر مراجع کی ر
مرتب کی ہے اور ان کے بارے میں تذکرہ نویسوں نے جو غلط اطلاعات بہم پہنچائی
کی تردید ان کے دیوان اور سفرنامے کے مندرجات کی روشنی میں کی ہے۔ مولانا
آزاد نے لکھا ہے کہ مولانا حالی نے سفرنامہ ناصر خسرو ایڈیٹ کر کے شائع کیا[۱]۔ اگر
درست ہے تو عجب نہیں کہ یہ مقدمہ اس نسخہ کے لیے ہی لکھا گیا ہو۔

اس مقالہ کے علاوہ کچھ پند و مواعظ ہیں۔ مولوی ذکاء اللہ کی کتا
الاخلاق کے بعض اجزاء کا ترجمہ، مرزا الٰہی بخش اور سید امیر علی انیس دہلی کے لوح
لیے عبارت وغیرہ ہیں۔ نثر قدیم میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، سالک، قلق کے د
تقاریظ اور نواب کلب علی خاں قاضی عبدالرحمٰن پانی پتی اور امیر مینائی کے نام خطوط
حصے میں ایک خط مرزا غالب کے نام بھی شامل ہے۔

اس کے بعد عربی تحریروں کا حصہ ہے۔ پہلے نظم ہے، اس میں مفتی محمد کرم
کی شادی کے موقعہ پر تہنیت کا قصیدہ، مرزا الٰہی بخش کے بیٹے مرزا اثر کی شاد
قصیدہ ہے۔ اس کے بعد قصیدہ بائیہ ہے جو سب سے طویل ہے اور شاہ عبدالغنی
مدح میں کہا گیا ہے، اس وقت شاہ عبدالغنی مدینہ منورہ میں فروکش تھے، وہاں کے بع
ادیبوں نے بھی اس قصیدہ کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ اس حصے میں آخری نظم
العلماء کا خطاب ملنے پر مبارکباد دی ہے۔

نثر کے حصے میں دو خط شاہ عبدالغنی کے نام اور دو خط مرزا اشرف بیگ د

نام ایک خط سید حسین بلگرامی کے نام، ایک خط عربی رسالہ "النخلۃ الادبیہ" (لندن) کے مدیر کے نام اور ایک خط بغیر مکتوب الیہ کی صراحت کے ہے۔ ان خطوط کے علاوہ سید خواجہ ضیاء الدین مرحوم دہلوی کی منظومات جو عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ان پر ایک تقریظ، ایک -کا خطبہ ہے اور گلستان کی دو حکایات کا ترجمہ ہے۔

آخر میں ۱۴ صفحات پر مشتمل سر سید احمد خاں پر ایک مقالہ ہے، اس میں سر سید کی ملی خدمات اور علمی کاوشوں کو خاص طور پر نمایاں کرنے کی سعی کی ہے۔

کتاب کے مباحث وعنوان سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں ہوگا کہ یہ کتاب باضابطہ کوئی تصنیف نہیں ہے جبکہ شوقیہ اور بسا اوقات کسی ضرورت کے تحت لکھی ہوئی تحریریں ہیں جن کو مولانا نے جمع کر دیا ہے۔ اس کتاب میں مولانا نے یہ صراحت خود کی ہے کہ یہ ان کا کل عربی وفارسی کلام ہے، حتیٰ کہ بعض نامکمل خطوط بھی اس میں شامل کیے گیے ہیں۔

عربی قصیدہ اور غیر معیاری اشعار کو جمع کیا ہے وہاں اتنے عمدہ قصیدہ کا ترک کر دینا عجیب بات ہے۔ بلکہ اس قصیدہ کا تذکرہ تک نہیں کیا کہ انہوں نے نواب رامپور کی مدح میں بھی کوئی قصیدہ کہا تھا، اس کے برخلاف ایک قصیدہ فارسی میں نواب رامپور کی مدح کا اس ضمیمہ میں شامل ہے۔

غالب نے لکھا ہے کہ حالی سونی پت کے تھے یہ اطلاع غلط ہے حالی پانی پت کے رہنے والے تھے۔ سونی پت کے نہیں، دوسری بات یہ ہے کہ حالی دہلی میں نواب مصطفیٰ خاں کے مکان پر رہتے تھے جبکہ اس عربی قصیدہ کا شاعر الطاف حسین حکیم احسن اللہ خاں کے مکان پر مقیم تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے علاوہ مولانا کی عربی تحریریں نہیں ہیں۔

مولانا حالی کی عربی کے سلسلے میں ایک دوسری غلط اطلاع صالحہ عابد حسین نے خواجہ غلام الثقلین کے حوالے سے لکھی ہے، لکھتی ہیں "دلی کے زمانہ قیام میں جب ان کی عمر

غالباً اٹھارہ سال کی تھی، انہوں نے عربی میں ایک چھوٹی کتاب لکھی، یہ ان کی پہلی تصنیف تھی [۱۳]۔ خواجہ غلام الثقلین نے اپنے ایک مضمون میں اس کا ذکر یوں لکھا ہے"

> "غدر سے دو تین سال پہلے مولانا دہلی میں زیر تعلیم تھے۔ اس زمانے میں ایک عربی رسالہ آپ نے تصنیف کیا جس میں ایک منطقی مسئلہ مولوی صدیق حسن خاں بہادر کی تائید میں تھا، جسے ان کے استاد نے پڑھ کر نہایت ناراضگی کا اظہار کیا یہاں تک کہ اسے چاک کر دیا۔ مولانا کو قدرتی طور پر رنج ہوا لیکن استاد نے جو مشہور حنفی عالم تھے اور حسین بخش کے مدرسے میں پڑھاتے تھے کہا کہ رسالہ اگرچہ نہایت لیاقت سے لکھا گیا تھا مگر چونکہ ایک وہابی کی تائید میں تھا اس لے چاک کر دیا گیا [۱۴]۔

لیکن یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی اس کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ خود حالی نے صراحت کی کہ اس وقت ان کو عربی لکھنا آتا ہی نہیں تھا۔ انہوں نے عربی لکھنے کی مشق ۱۸۵۷ کے بعد اپنے جہانگیر آباد قیام کے دوران ۱۸۶۳ء میں شروع کی ہے [۱۵]۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ حالی نے خود کہیں بھی اس رسالہ کا تذکرہ نہیں کیا، تیسری دلیل یہ ہے کہ بادی النظر میں یہ بات غلط ہے، چونکہ نواب صدیق حسن خاں اور احناف کے درمیان اختلافات فقہی نوعیت کے تھے منطقی نہیں بلکہ نہ نواب صدیق حسن خاں منطقی تھے اور نہ مولانا حالی اس لیے مولانا حالی کا ان کی حمایت میں منطق کا کوئی رسالہ لکھنا عقلاً متبادر نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں جس وقت مولانا، مولوی نوازش علی سے درس لیتے تھے اس وقت میاں نذیر حسین محدث دہلوی کے اسباق میں بھی شرکت کرتے تھے، اگر غیر مقلد احناف کے لیے شجر ممنوع ہوتے، مولوی نوازش علی اول فرصت میں حالی کو اس سے باز رہنے کی تلقین کرتے۔

بہر حال عربی فارسی میں مولانا کا کل تحریری سرمایہ وہی ہے جو ضمیمہ کلیات پر مشتمل ہے اوراوپر جس کے مندرجات بیان کیے گئے ہیں۔ان کے مطالعے کے وقت یہ بات ضرور پیش نظر رہنی چاہیے کہ مولانا حالی خاص طور پر عربی کے مسلم الثبوت ادیب نہیں تھے۔انہوں نے ذاتی محنت سے مافی الضمیر کوادا کرنے کی صلاحیت بہم پہنچائی تھی اور چونکہ طبیعت میں موزونی تھی اس لیے نظم بھی کہہ لیا کرتے تھے۔مولانا کی عربی نظم عرب عہد جاہلیت کی شاعری کی نقالی ہے،اس میں نہ ندرت ہے نہ معنی آفرینی البتہ مولانا کی عربی نثر میں روانی کا عنصران کی خوبی ہے۔

مولانا کی عبارت میں مقفیٰ و مسجع عبارت آرائی نہیں ہے جو اس دور کے علماء کا خاص وصف تھا۔البتہ خطبہ -میں انہوں نے بھی مقفیٰ عبارت آرائی کی ہے۔

مولانا حالی کی عربی نظم بہت معیاری نہیں ہے جس طرح عہدِ جاہلیت کے شعراء اپنے ممدوح کی تعریف کرتے یا کسی مقام کی یاد میں قصیدہ لکھتے بالکل وہی اسلوب اورانہیں زمینوں میں مولانا نے خامہ فرسائی کی ہے۔تاہم مولانا کا قصیدہ بائیہ ایک استثنا ہے۔اس قصیدے میں غضب کی آمد ہے۔بسا اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے عہدِ جاہلیت کا کوئی شاعر کلام کہہ رہا ہے۔خاص طور پر اس کی تشبیب بہت پرلطف ہے اور ممدوح کی توصیف میں بھی معیاری مدح کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔

عربی کے مقابلے میں حالی کی فارسی دانی معتبر ہے،حالی کی غزلوں میں ندرت، معنی آفرینی اور تخیل کا کمال ہے،بعض غزلیہ اشعار میں جو عارفانہ نکتے بیان کئے ہیں وہ خاص طور پر قابل ذکر ہے،حالی صوفی نہیں تھے اور وجود وعرفان کے ان نکات کا حالی کو تجربہ نہیں تھا جو انہوں نے بیان کیے ہیں وہ یقیناً دوسرے شعرا یا دوسروں کے تجربات ہیں جن کو حالی نے زبان دی اور گویا انہیں گویا کر دیا۔

غزلیات کا علاوہ فارسی نظم میں حالی کا اہم ترین کارنامہ سرسید احمد خاں کا مرثیہ

ہے۔ ستر اشعار پر مشتمل اس بند میں نہایت پرتاثیر اور سلیس زبان میں سرسید کا مرثیہ لکھا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مرثیہ شخصی مراثی کی فہرست میں اہم مقام پر رکھے جانے کا مستحق ہے۔ اس میں شاعر نے نہایت خوبی کے ساتھ سرسید کی رحلت سے اسلامیان عالم اور غیر مسلموں دونوں کو پہنچنے والے نقصان، سرسید کی شخصی خوبیاں، قوم وملت کا درد اور قوم وملت کے لیے خود کو مٹا دینا، اور پھر سرسید کو ان کے پسماندگان کا خراج عقیدت بیان کیا ہے۔

۱۔ صالحہ عابد حسین، حیات حالی، انجمن ترقی اردو علی گڑھ، طبع دوم، بدون سنہ ص ۲۸
۲۔ ایضاً، ص ۳۳
۳۔ حالی ضمیمہ کلیات حالی
۴۔ حالی ضمیمہ کلیات حالی
۵۔ حیات حالی، ص ۶۱
۶۔ حالی مقالات، انجمن ترقی اردو علی گڑھ، ص ۱۹۰۷، ۱/۱۹/۳
۷۔ حیات حالی، ص ۶۱
۸۔ مقالات حالی، ص ۱/۱۹/۳ حاشیہ
۹۔ ضمیمہ اردو کلیات حالی، ص ۵
۱۰۔ مولانا حالی، یادگار غالب، تصحیح و ترتیب، مالک رام، مکتبہ جامعہ دہلی، اگست ۱۹۷۱ء ص ۶۵، ۶۸
۱۱۔ حیات حالی، مقدمہ از ابوالکلام آزاد، ص ۱۹
۱۲۔ ایضاً، ص ۲۸
۱۳۔ ایضاً، ص ۲۹، یہ معلوم ہونا بہت مشکل ہے کہ خواجہ غلام الثقلین نے یہ افسانہ کیوں تراشا، حالی کی روشن خیالی اور ان کے اساتذہ کی تنگ نظری ثابت کرنے کے لیے یا کسی اور وجہ سے۔
۱۴۔ ضمیمہ کلیات حالی،

وسیم بیگم

مولانا الطاف حسین حالی

حالؔی کے دور میں قدیم اور جدید تصورات کا ایک عجیب وغریب امتزاج ملتا ہے جو روشن اور نیم تاریک پرچھائیوں کے سفر سے مشابہ ہے۔ سنہ ۱۸۵۷ء کو اگر ہم کٹ پوائنٹ مان چلیں تو شاید ہم اس صورت حال کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

دہلی پر کمپنی کی حکومت قایم ہونے کے بعد جو سنہ ۱۸۰۳ء کا واقعہ ہے ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۲۵ء تک جو وقت گزرا وہ نئے عہد کی تمہید تھا جس کے اثرات اس وقت واضح صورت میں سامنے آئے جب ۱۸۲۵ء میں غازی الدین خان کے مدرسے کو قدیم کالج میں بدلا گیا اور نظامِ تعلیم وتربیت کو ایک نئی شکل دینے کی کوشش کی گئی، سائنسی مضامین پڑھائے جانے لگے اور کچھ وقت گزرنے پر انگریزی زبان بھی نصابِ تعلیم کا حصہ بن گئی۔

۱۸۳۶ء میں دہلی اُردو اخبار نکلا اور ۱۸۵۷ تک بیس اکیس برس کے دوران اس نے عصری کوائف کے بارے میں اس زمانے کے پیمانے کے مطابق بہت کچھ لکھا اور اپنے کالموں میں اُسے جگہ دی فوائد الناظرین اور خیر خواہِ ہند جیسے ادبی رسائل بھی سامنے

آ ئے ، اگر چہ اُن کی اشاعت کا دایرہ زیادہ وسیع نہیں تھا۔

نئے خیالات اور نئے سوالات ابھر رہے تھے لیکن تعلیمِ نسواں کے بارے میں شاید ہی کسی نے سنجیدگی سے غور کیا ہو یا اس مسئلے پر کچھ لکھا ہو۔

غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ مردوں یا لڑکوں کی تعلیم سے متعلق ہی یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ کیا پڑھایا جائے اور کس طرح پڑھایا جائے۔ جدید تعلیم کی طرف رجحان بڑھ رہا تھا مگر اس کی مخالفت بھی اِسی شدّت سے ہو رہی تھی اسی لیے اُس وقت جو لوگ اِصلاح کار کے تقاضوں کو سمجھ رہے تھے اور اپنی تحریر و تقریر سے اس دور کے معاشرے کو ذہنی طور پر اس طرف لانا چاہتے تھے وہ بھی تعلیمِ نسواں کے مسئلے پر خاموش نظر آتے ہیں۔

سر سید جنھوں نے نئی تعلیم پر زور دیا اور اس کے لیے ایک تاریخ ساز اور عہد آفریں ادارہ قایم کیا، تہذیب الاخلاق جیسا رسالہ نکالا، اُن کے یہاں بھی تعلیمِ نسواں کا مسئلہ زیادہ اہم نظر نہیں آتا اور غالباً اسی لیے نہیں کہ اس مسئلے کو چھیڑ کر زیادہ الجھنیں اور فکری الجھاؤ پیدا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

اس وقت کے درمیانی اور اعلیٰ طبقے کے افراد اس کے تو قایل تھے کہ عورت میں سلیقہ ہونا چاہیے تا کہ وہ گھر گرہستی کا کام زیادہ خوبصورتی اور سلیقہ شعاری کے ساتھ چلا سکے اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت کے لیے بنیادی ادارہ اس کا گھر بعد میں اس کے بچّے اور اس کا شوہر نیز اس کے رشتے دار اس کا مرکزی فکر و خیال ہوتے ہیں اور ایک اثاثی ادارہ کا رول ادا کرتے ہیں لیکن تعلیم کے ساتھ اگر سوجھ بوجھ اور توازن کو ذہن میں متعین رکھا جائے تو تعلیم اپنی معلومات کے دایرہ کے ساتھ ذہن کو بہتر بنانے میں مدد دیتی ہے بشرطیکہ انفرادی ذہن اور اجتماعی شعور اس کی حمایت میں ہو۔

ہماری تقلید پرستی اور روایت پسندی ہمیں نئی باتوں پر نہ غور کرنے دیتی ہے نہ اس کے معنی سمجھنے کی اجازت دیتی ہے۔ ہم خود غور کریں نہ کریں لیکن دوسرے اگر ہمیں سمجھائیں

تو انکار نہ کریں اتنا تو ہونا ہی چاہیے یہی وجہ ہے کہ عورتوں کی تعلیم اور سہی نصاب تعلیم کے مسئلے پر ہم نے کبھی ٹھنڈے دل سے غور و فکر ہی نہیں کیا بلکہ اس کو avoid ہی کرتے رہے اور یہاں تک سوچتے رہے کہ لڑکیوں کا لکھنا، پڑھنا اور کتابوں سے رجوع کرنا ان کے شریفانہ کردار میں حائل ہو جائے گا اسی لیے بہت زمانے تک بھی لڑکیاں گھریلو سطح پر قرآن پاک پڑھتی رہیں اور خال خال سطح پر کسی نے قرآن حفظ بھی کیا۔ جہاں تک اُردو پڑھنے کا سوال ہے وہ پہلے راہِ نجات اور اس کے بعد بہشتی زیور تک محدود رہا اور اس کا پیمانہ بھی بے حد سمٹا ہوا تھا۔ یہ دوسری بات ہے ادھر سے اُدھر تک اسی پیمانے سے تعلیم کو ناپا جاتا رہا لیکن بیداری آرہی تھی اور اس کا احساس عورتوں میں بھی ہونا چاہیے مگر وہ اخباروں میں لکھتی نہیں تھیں رسائل میں ان کی تحریریں شائع نہیں ہوتی تھیں تو نئی تعلیم کا چرچا ان میں کیسے ہوتا۔

مولانا الطاف حسین حالی وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے نہ صرف تعلیم نسواں کو ضروری قرار دیا بلکہ عورتوں کے حقوق اور ان پر ہونے والے ظلم و ستم کے خلاف بھی آواز اُٹھائی ان کا اپنا ماننا یہ تھا کہ بچہ سب سے پہلے جو گود میں پرورش پاتا ہے، تربیت حاصل کرتا ہے وہ ایک عورت، ایک ماں کی گود ہوتی اسی لیے اگر وہ عورت تعلیم یافتہ ہوگی تو اپنے بچے کی دیکھ بھال زیادہ بہتر طریقے سے کر سکتی ہے اور اس طرح عورتوں کی تعلیم کے ذریعے پوری قوم کے ذہن کو بدلا جا سکتا ہے او ذہنی پسماندگی کو کسی حد تک دور کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں:

> "انہوں نے صرف مردوں ہی کی تعلیم کو ضروری نہیں سمجھا
> بلکہ اُس زمانے میں جب عورتوں کو تعلیم دلانا عیب اور گناہ
> سمجھا جاتا تھا ان کے حقوق اور ان کی تعلیم کے حق میں آواز
> بلند کی، حالی شاعر اور ادیب تھے ان کا قلم کے ذریعے اور
> شعر کی شکل میں اپنے خیالات لوگوں تک پہنچانا تھا اور

انہوں نے اس کام کو بڑی خوبی سے اور بڑے اثر آفریں
انداز میں انجام دیا لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ اپنے بس بھر
عملی طور پر کچھ نہ کچھ کرتے رہے"۔[۱]

حالی نے سب سے پہلے اپنے خاندان کی عورتوں کو پڑھنے لکھنے کی ترغیب دی، حالانکہ ان کے زمانے میں عورتوں کا پڑھنا لکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا اس کے باوجود انہوں نے اپنی اہلیہ کو عورتوں کی تعلیمی اہمیت کے متعلق بہت کچھ سمجھایا اور اپنی پوتی کے تعلیمی شوق کو پروان چڑھانے کے لیے گھر میں قلم دوات، قلمدان اور تختی وغیرہ کا خود انتظام کیا، صالحہ عابد حسین نے مزید یہ بھی لکھا ہے کہ

"۱۸۹۲ء کے لگ بھگ انہوں نے پانی پت میں اپنے
گھر سے ملے ہوئے ایک مکان میں لڑکیوں کا ایک چھوٹا سا
اسکول بھی کھولا تھا یہ اسکول چوتھی جماعت تک کا تھا اور ان
کے عزیزوں اور دوستوں کی لڑکیاں اُس میں پڑھتی تھیں"۔[۲]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حالی لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں کس حد تک فکرمند رہتے تھے اور اس کے لیے انہوں نے نہ صرف زبانی باتیں کیں بلکہ اس کو عملاً کر کے بھی دکھایا اُس زمانے میں اسکول چلانے کے لیے ایک تعلیم یافتہ معلّمہ کا ملنا بڑا مشکل امر تھا چنانچہ ان کے اسکول کے لیے بھی جو استانی ملی وہ بہت معمولی پڑھنا لکھنا جانتی تھی اس معلّمہ نے آٹھ دس مہینے لڑکیوں کو اسکول میں پڑھایا اس کے بعد یہ طالبات خود اس قابل ہو گئیں کہ معلّمہ سے آگے نکل گئیں کسی مناسب معلّمہ کے نہ ملنے کی وجہ سے یہ اسکول جلدی بند ہو گیا۔

حالؔی نے اپنی نظموں میں عورتوں کے حقوق کے لیے بھی آواز بلند کی اور ان پر ہونے والی زیادتیوں کے خلاف بھی وہ سماج کے رسم و رواجوں کے خلاف تھے جس میں

عورت گھٹ گھٹ کر مر جائے جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے کہ حالؔی مردوں کے ساتھ عورتوں کی تعلیم کی بھی حمایت کرتے تھے تاکہ عورتوں میں بھی بیداری پیدا ہو، سوجھ بوجھ پیدا ہو، جو بھی دنیا میں سماجی، سیاسی اور اقتصادی انقلابات رونما ہو رہے ہیں عورتیں اس سے باخبر ہوں اور اپنے آپ کو ان حالات کے مطابق ڈھال سکیں۔

حالؔی کا یہ ماننا تھا کہ عورت سماج کی بنیاد ہے۔ اگر عورت کمزور ہوگی یا کسی بھی اعتبار سے پچھڑی ہوئی ہوگی تو سماج بھی ترقی نہیں کر سکے گا اس لیے قوم کی ترقی کے لیے بھی ضروری ہے کہ عورت کو تعلیم کے وہ سب مواقع فراہم کیے جائیں جو مرد کو میسّر ہیں تبھی عورت، مرد کے شانہ بہ شانہ چل سکتی ہے اور اس ملک و قوم کے لیے نئی راہیں ہموار کرنے میں مدد کر سکتی ہے۔

حالی جس طرح ہماری سوسائٹی کو بدلنا چاہتے ہیں اس کی طرف بھی ان کے یہاں اشارے موجود ہیں وہ اصلاحی تحریک کے علمبرداروں میں ہیں۔ اصلاح کی ایک صورت بحیثیت مجموعی سوسائٹی کو بدلنا ہے نئے مسائل اور معاملات سے آگاہ کرنا ہے اور اس کا ایک اہم پہلو اس گھر کے ماحول کو بہتر بنانا ہے جہاں نئی نسل کی تربیت ہوتی ہے اس کو جینا سکھایا جاتا ہے اور گھروں کی اصلاح و تربیت کا سب سے اہم ذریعہ لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم ہے جس میں مائیں، بہنیں اور بیٹیاں سبھی آجاتی ہیں۔ مقصد اس گفتگو سے حالؔی کے نقطۂ نظر کی وضاحت اور ان امور کی طرف توجہ دلانا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی دو نظمیں ''مناجاتِ بیوہ'' اور ''چپ کی داد'' بہت اہم ہیں جو سماجی ماحول ان نظموں کی فکری اور تخلیقی فضا میں موجود ہے وہ کہیں عورتوں کی حالت سدھارنے سے متعلق ہے اور کہیں اُس ذہن کو تبدیل کرنے کے لیے ہے جو اس خرابی اور خستہ حالی کا ذمے دار ہے ''مناجاتِ بیوہ'' ان کی ایک ایسی نظم ہے جس کی مثال اردو زبان میں ہی نہیں دوسری زبانوں میں بھی مشکل سے ملے گی۔ یہ ایک ایسی بیوہ عورت کی مناجات ہے جو جوانی میں ہی بیوہ ہو چکی ہے اور سماج کے بندھنوں میں

کچھ اس طرح قید ہے کہ وہ نکاح ثانی بھی نہیں کرسکتی یا اس بھری دنیا میں وہ کس طرح تنہا زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ اسی کی روداد حالی نے اس نظم میں بیان کی ہے:

ایک کا کچھ جینا نہیں ہوتا
ایک نہ ہنستا بھلا نہ روتا
دن بھیانک اور رات ڈراؤنی
یوں گزری ساری یہ جوانی

ان شعروں میں حالی نے بیوہ عورت کے اُس اکیلے پن کی طرف اشارہ کیا ہے جن سے اس کو زندگی بھر گزرنا پڑتا ہے اور اپنے جذبات و احساسات کا گلا گھونٹ دینا ہوتا ہے اور یہ سب کچھ کرنے کے لیے وہ سماج کے ہاتھوں مجبور ہے۔ اس شعر میں حالؔی نے عورت کی بے بسی کو کتنے خوبصورت الفاظ میں بیان کیا ہے

دن جوانی کے کٹے ایسے
باغ میں پنچھی قید ہو جیسے

قدیمانہ معاشرے کے اثرات عورتوں پر زیادہ ہوتے ہیں اور سماج میں عورتوں کے ساتھ جو زیادتیاں ہوتی رہی ہیں، حیرت یہ ہے کہ اس کی ذمے داری تو مردوں پر تھی یا رہی مگر وہ ظلم و ستم زیادہ عورتوں کی ہی جانب سے ہوتے تھے اسی لیے گھر کے ماحول کو بدلنا عورتوں کی زندگی میں ذہنی انقلاب لانا زیادہ ضروری تھا اور اسی وجہ سے نئی تعلیم و تربیت کی ضرورت تھی۔

قانون کا معاملہ عجیب و غریب ہے۔ اِس میں وہ قانون بھی ہے جس کے تحت حکومت ہوتی ہے اور وہ رسوم و رواج بھی "the old old traditions" قانون سے بھی کچھ زیادہ سختی سے کام کرتی ہیں اور دوسروں کے لیے ذہنی اور جسمانی اذیتوں کا سبب بنتی ہیں قانون میں کمزور پھنستے ہیں اور طاقتور اسے توڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ اسی نسبت سے رسم و

رواج کے سلسلے ان لڑکیوں، بیوؤں اور کم عمر شادی شدہ عورتوں کو زیادہ اپنے زنجیر جیسے
حلقوں میں جکڑے رہتے تھے جو کسی خاندان میں بیاہ کر جاتی تھیں۔ کم عمر لڑکیوں کے لیے
بیوہ ہو جانا زیادہ تکلیف دہ بات تھی۔ شوہر سے محرومی اور یتیم بچوں کی پرورش کا مسئلہ عام
طور پر خاندانوں میں بہت پریشان کن ہو جاتا تھا اور اسکے لیے حقائق کو سامنے لاکر ان کی
تبدیلی کی خواہش اور کوشش ضروری تھی۔ یہ تعلیم و تربیت ہی کا حصہ تھا

رخصت چالے اور چوتھی کو
کھیل تماشہ جانتی تھیں جو
ہوش جنہیں تھا رات نہ دن کا
گڑیوں کا سا بیاہ تھا جن کا

حالی نے ان شعروں میں کم سنی کی شادی کی ایک خیال انگیز تصویر پیش کی ہے اور
اس کے بعد کے اشعار میں معصوم لڑکیوں کا بیوہ ہونے کا ایک دردناک منظر سامنے آتا ہے
جس کو پڑھ کر کوئی حساس انسان بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے

دو دو دن رہ رہ کے سہاگن
جنم جنم کو ہوئیں بروگن
شرط سے پہلے بازی ہاری
بیاہ ہوا اور رہیں کنواری

اگلے شعر میں حالی نے عربوں کی دختر کشی کی رسم کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے وہاں
تو ایک ہی مرتبہ صبر اور جبر کرنا پڑتا تھا یہاں تو پوری زندگی اسی کوشش کی نظر ہو جاتی ہے کیا ہو
اور کسی طرح ہو بیٹی کی تکلیفیں ماں باپ کے لیے جیتے جی پریشانی کا سبب بنی رہتی ہیں

ساتھ بیٹی کے مگر اب پدر و مادر بھی
زندہ در گور سدا رہتے ہیں اور خستہ جگر

حالی نے سماج کے بیجا رسم و رواج کی طرف بھی بھرپور اشارے کیے ہیں اور ان خیالات کا اظہار خود انہوں نے عورت کی زبان سے کرایا ہے جس کی وجہ سے ان کا بیان زیادہ موثر ہو گیا ہے

یا عورت کو پہلے بلا لے
یا دونوں کو ساتھ اُٹھا لے
یا یہ مٹا دے ریت جہاں کی
جس سے گئی ہے پریت یہاں کی

(چُپ کی داد)

مزید برآں حالی یہ چاہتے تھے کہ عورتوں کے لیے جو کچھ لکھا جائے اس کی زبان سادہ ہو اور یہ بڑی بات ہے کہ انہوں نے "مناجاتِ بیوہ" میں جو زبان استعمال کی ہے اس کے لفظ لفظ اور حرف حرف کے بارے میں تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مکمل طور پر سلیس و سادہ ہے لیکن بحیثیت مجموعی وہ عورتوں کی زبان ان کے لب و لہجہ اور ان کی لفظیات کا حصہ ہیں اور تعلیمِ نسواں کے سلسلے میں ان کی اپنی زبان کو پیشِ نظر رکھا جائے یہ اس کی طرف شعوری یا نیم شعوری طور سے توجہ دلاتا تھا۔

حالی سے پہلے اردو شعر و ادب میں عورت کا کوئی خاص مقام نہیں تھا۔ اس کو محض محبوب کی حیثیت سے جانا جاتا اس کی خدمات، ایثار، قربانی، وفا، پرستش، محبت کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ ماں بہن بیوی اور بیٹی کا کوئی تصور پورے اردو شعر و ادب میں مشکل ہی سے نظر آئے گا۔ مرثیے کے بعض حصے اس سے مستثنیٰ ہیں۔ حالی نے سماج میں عورت کے اونچے درجے کا اعتراف کیا اور انہیں کرداروں سے انہوں نے اپنی مشہور نظم "چپ کی داد" کا آغاز کیا

اے ماؤ، بہنو، بیٹیو، دنیا کی عزت تم سے ہے

ملکوں کی بستی ہو تمھی، قوموں کی عزت تم سے ہے

اس نظم میں براہ راست یہ تو نہیں کہا گیا کہ تم اسکولوں کی طرف رخ کرو مدرسوں کی محرابوں تک پہنچو بلکہ ان فرائض کا ذکر ہے جو عورت کو بہر صورت امورِ خانہ داری کی شکل میں انجام دینے ہوتے ہیں اور یہ بھی تعلیمِ نسواں کا ایک ضروری پہلو ہے ایک عملی شکل ہے

جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آبِ حیات
ٹھیرا تمہارے حق میں وہ زہرِ ہلاہل سر بسر
آیا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب
دنیا کو دینا ہوگا ان حق تلفیوں کا جواب
دنیا کے دانا اور حکیم اِس خوف سے لرزاں تھے سب
تم پر مبادا علم کی پڑ جائے پرچھائیں کہیں
ایسا نہ ہو مرد اور عورت میں رہے باقی نہ فرق
تعلیم پا کر آدمی بننا تمہیں زیبا نہیں

(چُپ کی داد)

ان شعروں میں حالی نے man dominated society کی طرف خوبصورت اشارہ کیا ہے۔ وہ علم کی دولت جو مردوں کے لیے آبِ حیات سمجھی گئی، تمہارے لیے وہ زہر بن گئی کیونکہ دنیا کے تمام ذہین لوگوں نے یہ سوچا کہ اگر تم نے بھی علم حاصل کر لیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ہمارے برابر آ کر کھڑی ہو جاؤ اور پھر مرد اور عورت کا فرق ہی مٹ جائے۔ ہماری حکومت اور برتریت کا ہی خاتمہ ہو جائے۔ تعلیم حاصل کر کے تمہارے اندر سوجھ بوجھ پیدا ہو جائے گی۔ آدمیت آ جائے گی جو اُن کے نزدیک عورتوں کو زیبا نہیں دیتی

اے بے زبانوں کی زبانو، بے بسوں کے بازؤں
تعلیمِ نسواں کی مہم جو تم کو اب پیش آئی ہے

حالؔی اس شعر میں تعلیمِ نسواں کی مہم کے متعلق بتا رہے ہیں اور عورتوں سے بطورِ خاص مخاطب ہیں۔ تم ہی بے زبانوں کی زبان اور تم ہی بے بس عورتوں کی بازو ہو۔ اب تمہیں پوری طرح اس مہم میں شامل ہو جانا چاہیے تب تم بے بس اور بے کس عورتوں کو سماج کے ظلم و ستم سے نجات دلا سکو گی۔

مولوی عبدالحق کی رائے ہے "مناجاتِ بیوہ" اور "چپ کی داد" دو ایسی نظمیں ہیں جن کی نظیر ہماری زبان میں نہیں ملتی۔ ان نظموں کے ایک ایک مصرعے سے خلوص، جوش، ہمدردی اور اثر ٹپکتا ہے یہ نظمیں نہیں دل و جگر کے ٹکڑے ہیں۔ لکھنا تو بڑی بات ہے کوئی انہیں بےچشمِ نم پڑھ بھی نہیں سکتا"۔[۶]

حالؔی نے عورتوں کی تعلیم نیز بچوں کی پرورش، ان کی تربیت پر ایک اہم کتاب "مجالس النسا" لکھی تھی جو قصے کی طرز پر ہے۔ اس کتاب پر پنجاب کے ڈائرکٹر تعلیم نے چار سو روپے کا انعام محکمۂ تعلیم کی طرف سے دیا تھا۔ ایک مدت تک یہ کتاب پنجاب کی لڑکیوں کے نصاب میں داخل رہی اور اس کو عورتیں اور لڑکیاں بڑی دلچسپی سے پڑھتی تھیں۔[۷]

اس طرح سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تعلیمِ نسواں کے مسئلے سے حالی نے فکری سطح پر بھی دلچسپی لی اور عملی سطح پر بھی۔ یہ دور سرسید کی اہم تہذیبی روشوں کی طرف بھی ایک اشارہ ہے۔ حالؔی کے بیانات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اس مسئلے پر سماج کی اصلاح اور ہمارے گھروں کے روایتی ماحول کی تبدیلی کے لیے کیا سوچ رہے تھے اور کس طرح اس ذہنی انقلاب کو ہماری زندگیوں کا حصہ بنانا چاہتے تھے۔

اس سلسلے میں انہوں نے جو زبان استعمال کی عورتوں کے جن مسائل کی طرف توجہ فرمائی ان کے ساتھ ہونے والی جن زیادتیوں کا ذکر کیا وہ غالباً اس لیے ضروری تھا کہ تعلیم و تربیت کے لیے نیا قدم اٹھانے سے پہلے یہ بات ذہن نشین اور خاطر نشاں ہو جائے

کہ ہم کہاں کھڑے ہیں اور ہمیں اپنی نئی سمتِ سفر اور رفتار کے تعین میں کن امور کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

حواشی

۱۔ یادگارِ حالی، صالحہ عابد حسین، ص ۱۰۶۔
۲۔ ایضاً، صالحہ عابد حسین، ص ۱۰۷۔
۳۔ ایضاً، صالحہ عابد حسین، ص ۱۸۰۔
۴۔ ایضاً، صالحہ عابد حسین، ص ۱۰۹۔

غالبؔ پر چند مقالے

مصنف

پروفیسر نذیر احمد

"غالبؔ پر چند مقالے" اُردو کے عظیم شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ پر لکھے گئے تنقیدی و تحقیقی مقالوں کا مجموعہ ہے۔ جسے اُردو اور فارسی کے مشہور محقق اور نقاد پروفیسر نذیر احمد نے سپرد قلم کیا ہے۔ اس مجموعے کے مقالات سے تحقیق کی بعض نئی جہات سے ہم آشنا ہوں گے۔

خوب صورت طباعت، عمدہ گٹ اپ۔

صفحات ۲۲۸

قیمت ۶۰ روپے

یوسف عامر

''مقدمہ شعر و شاعری'' میں عربی تنقید کے اصول

اس میں دو رائے نہیں ہو سکتی کہ پرانے زمانے میں شاعری کی پرکھ کے معاملے میں یونانی اور عربی روایتوں کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ عربی تصوراتِ شعر کی روایت کا رجحان زیادہ تر شاعری کے خارجی محاسن اور فنی مباحث کی طرف ہے۔ اسلام کے ظہور سے پہلے عرب قوم کے یہاں شاعری کی تفہیم کے بعض اصول و ضوابط موجود تھے جن کی بنیاد پر ''عکاظ'' کے میلے میں ہر سال بہت سی نظموں میں سے ایک نظم کو منتخب کیا جاتا تھا اور ان اصول و ضوابط کی بنا پر اپنے زمانے کے شاعروں میں سے کسی ایک شاعر کو بہترین شاعر قرار دیا جاتا تھا۔ آگے چل کر عربی تنقید کی تشکیل ہوئی اور اس کے اصول واضح ہو گئے۔

عربوں کے یہاں فنِ تنقید کی روایت اور تشکیل تین ادوار میں مکمل ہوئی۔ اسلام کی آمد سے پہلے کا دور، صدرِ اسلام اور اُموی عہد۔ بعد میں عباسی عہد میں عربی تنقید نے ان دو ادوار کے تشکیل کردہ خدوخال کی بنیاد پر ایک نمایاں شکل اختیار کی۔ تنقید نگاروں نے قدیم تنقیدی تصورات کو ترتیب دیا، روایتی شاعری کی مدد سے تنقیدی اصول متعین کیے اور شعرا کی

درجہ بندی کے علاوہ شاعروں کے تذکرے اور شاعری کے انتخاب مرتب کیے۔

عربی تنقید کی روایت میں، ابتدا سے بیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک، شاعری کی قدر و قیمت کے تعین کا انحصار علم معانی، علم بیان، علم بدیع، علم عروض اور علم قافیہ پر رہا ہے۔ گویا کہ یہ تمام علوم قدیم عربی تنقید کے بنیادی اصول رہے ہیں۔ جن پر نہ صرف عربی بلکہ فارسی کی پرانی تنقید کا دارومدار بھی رہا ہے۔ اس سلسلے میں اردو تنقید میں، ابتدا سے حالی تک، انہی عربی تنقیدی اصولوں کو اپنایا گیا۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ اردو تنقید کا ابتدائی دور فارسی تنقید کے زیر اثر ہے۔ فارسی کی پرانی تنقید نے عربی کے پرانے تنقیدی اصولوں پر اپنی عمارت کی بنیاد رکھی، جس کے نتیجے میں یہی اردو تنقید کی بھی اساس قرار پائی۔ چنانچہ فارسی تنقید کی ابتدا میں جو مسائل زیرِ بحث لائے گئے ان کا تعلق عربی تنقید کی طرح، علم بدیع، علم بیان اور علم معانی سے تھا۔ اس سلسلے میں فارسی کے ابتدائی تنقیدی نشانات ''قابوس نامہ''، ''چہار مقالہ''، ''لباب الاباب'' میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ کتابیں دورِ عباسی کے عربی تنقیدی اصولوں کے تحت لکھی گئیں۔

درحقیقت اردو شاعروں کے تذکرے عربی اور فارسی کی تنقیدی روایت کی ایک شکل ہیں۔ عربی ہی کی طرح فارسی میں ادبی تنقید کی روایت شعرائے اردو کے تذکروں میں بھی منتقل ہوگئی۔ اس لیے اردو تذکرہ نگاروں نے شاعری کی تحسین کے لیے اُن پرانی تنقیدی اصطلاحات کو اپنایا ہے جن کا عربی اور فارسی تنقید میں متعین اور مخصوص معنوں میں استعمال کیا گیا تھا۔ کریم الدین نے اردو والوں کی اس تقلید کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے

> ''تذکرہ اور طبقات چونکہ شاخیں فن تاریخ کی ہیں، خصوصاً زبان عربی اور فارسی میں اس قسم کی بہت سی تصنیف ہوئی ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی زبانِ اردو میں بھی اس طریق تصنیف کا استعمال کیا ہے۔''

غرض یہ ہے کہ اردو تنقید پر بالواسطہ یا بلاواسطہ عربی تنقیدی تصورات کے اثرات نمایاں ہیں۔

جہاں تک حالی کا تعلق ہے تو ان کا "مقدمہ شعروشاعری" عربی تنقیدی اثرات اور اصولوں سے دور نہیں اس لیے کہ حالی نے اپنی اس تصنیف کی بنیاد قدیم عربی نقادوں کے تصورات پر رکھی۔ قدیم عربی نقادوں کا خیال تھا کہ تنقید نگار کا اولین فریضہ یہ ہے کہ فن اور فن پارے کے تنقیدی اصول متعین کرے، اس کے مزاج اور عناصر سے واقف ہو۔ اس لیے حالی نے "مقدمے" میں شاعری کے بارے میں اپنے تنقیدی مباحث اور تصورات کو واضح کیا ہے۔ انہوں نے پہلے سے مقرر کردہ اہداف کے مطابق شاعری کی ماہیّت، اس کا منصب، اس کی ضروری خصوصیات، سماجی زندگی سے شاعری کا تعلق اور اس کی اہمیت، قومی تاریخ اور تہذیب سے شاعری کا علاقہ، اردو شاعری کی اصناف کا تجزیہ اور اسلوب بیان جیسے موضوعات پر اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار کیا۔

حالی کی کتب "حیاتِ سعدی"، "یادگارِ غالب" اور "مقدمہ شعروشاعری" کے مطالعے سے اس بات کا ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ حالؔی کی ذہنی نشوونما اور ادبی تربیت میں عربی کی تنقیدی روایت کا عمل دخل بہت نمایاں تھا۔ "شبلی کے برخلاف حالؔی اپنی تنقید کا بنیادی ڈھانچہ عربی کے معیارِ نقد کی مدد سے تیار کرتے ہیں"۔ شبلی کی تنقید کا خمیر فارسی کی شعری روایت اور نظریاتِ تنقید سے اٹھا ہے۔ یہ دونوں علما عربی اور فارسی ادب کی روایت کا علم وعرفان رکھتے ہیں مگر اپنے اپنے مزاج کی مناسبت کے سبب ایک کا رجحان بنیادی طور پر فارسی ادب کی روایت سے ہم آہنگ ہے اور دوسرے کا بنیادی حوالہ عربی ادب کی روایت بنتی ہے۔"

علاوہ ازیں حالی ان کتابوں سے پہلے کے عربی تنقیدی تصورات، ادبی مباحث اور شاعری کے ان مسائل سے واقفیت رکھتے تھے۔ جو اسلام کی آمد سے پہلے، صدرِ اسلام

عہد اموی اور عہد عباسی میں موجود تھے۔

حالی نے اپنے مقدمے کا خاکہ عربی کی تنقیدی کتابوں ''العمدۃ''، ''مزہر'' اور ''العقد الفرید'' وغیرہ کی اساس پر تیار کیا۔ لہٰذا انہوں نے پہلے شاعری اور فن کے مسائل پر گفتگو کی۔ اس کے بعد شاعری کے فن کے محاسن پر اظہارِ خیال کیا اور پھر اپنے نقطہ نظر کی تصدیق میں قدیم عربی اور فارسی شاعروں کے حوالے دیے۔ انہوں نے شاعری میں سچائی اور جھوٹ کا مسئلہ، اخلاق اور شاعری کا علاقہ، شاعری کی بنیادی خصوصیات، شاعر بننے کی ذمہ داریاں، شاعری کے الہامی یا اکتسابی ہونے پر تفصیل سے بحث کی اور ان مسائل کو زیر بحث لانے کے دوران لفظ و معنی میں ایک کی دوسرے پر فوقیت کے بارے میں اظہار خیال کیا۔ یہ طریقۂ کار اور ایسی منصوبہ بندی کا انداز ابن قدامہ کی ''نقد الشعر''، ابو ہلال العسکری کی ''الصناعتین'' ابن رشیق کی ''العمدۃ'' اور ابن خلدون کی ''مقدمہ ابن خلدون'' وغیرہ جیسے تنقید نگاروں کے یہاں ملتا ہے۔

حالی نے ''مقدمہ شعروشاعری'' میں عربی تنقید کی اہم کتابوں اور عربی شعرا کا حوالہ کئی مقامات پر دیا ہے، لیکن ان کتابوں اور ان شاعروں سے فائدہ حاصل کرنے کے باوجود وہ بعض اوقات غیر صحیح حوالہ دیتے ہیں، اور حوالہ دیے بغیر بھی اپنی بات کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ابن رشیق کی کتاب ''العمدۃ'' کا تذکرہ مقدمے میں کئی جگہ کیا گیا ہے۔ مثلاً حالی نے شاعری کی ضروری شرطوں میں ''تفحص الفاظ'' کی اہمیت کو بار بار اُجاگر کیا۔ وہ تفحص الفاظ کے معاملے کو تخیل سے ملا کر دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ''اگر شاعر شعر کہتے وقت الفاظ کا تتبع اور تفحص نہیں کرتا تو محض قوتِ متخیلہ کچھ کام نہیں آسکتی۔'' ان کے یہاں شعر کہتے ہوئے مناسب ترین الفاظ کا انتخاب اور اس کی ایسی ترتیب کہ شاعر کا مدعا نہایت آسانی سے سامع تک پہنچ جائے، بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

- جب ہم قدیم عربی تنقید پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عربی تنقید

نگاروں نے ''تفحص الفاظ'' پر بہت زور دے کر کافی بحثیں کی ہیں۔ ان میں سے ابو ہلال العسکری کی کتاب ''الصناعتین'' قابل ذکر ہے۔ جس میں مصنف نے تفصیل سے ''تفحص الفاظ'' کی اہمیت واضح کی ہے۔

''تفحص الفاظ'' کی بحث میں حالی کے خیالات ابو ہلال العسکری کے تصورات کی ترجمانی کرتے ہیں تاہم ممکن ہے کہ حالی نے ابو ہلال کا براہ راست مطالعہ نہ کیا ہو جس کی وجہ سے وہ صحیح حوالہ نہ دے سکے۔ ہلال العسکری کے ساتھ ساتھ ابن قدامہ اور ابن رشیق نے بھی شاعری کے حوالے سے ''تفحص الفاظ'' کی اہمیت پر زور دیا ہے۔

حالی نے ''تفحص الفاظ'' کی بحث کے ساتھ ساتھ ''آمد اور آورد'' کے مسئلے کو بھی اٹھایا۔ اور آمد کے بجائے ''آورد'' کو اہمیت دی ہے۔ وہ کہتے ہیں

> ''شعر میں دو چیزیں ہوتی ہیں ایک خیال دوسرے الفاظ۔ خیال تو ممکن ہے کہ شاعر کے ذہن میں فوراً ترتیب پا جائے، مگر اُس کے لیے الفاظ مناسب کا لباس تیار کرنے میں ضرور دیر لگے گی وزن اور قافیے کی اوگھٹ گھاٹی سے صحیح سلامت نکل جانا اور مناسب الفاظ کے تفحص سے عہدہ برہونا، کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اگر ایک دن کا کام ایک گھنٹے میں کیا جائے گا تو وہ کام نہ ہوگا، بلکہ بے گار ہوگی۔''

حالی کا خیال یہ ہے کہ شعر کی بے ساختگی اور برجستگی کا تعلق شعوری کاوش سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

> ''جس قدر کسی نظم میں زیادہ بے ساختگی اور آمد معلوم ہو، اُسی قدر جاننا چاہیے کہ اُس پر زیادہ محنت، زیادہ غور اور زیادہ حک و اصلاح کی گئی ہوگی۔''

حالی اس سلسلے میں مثال پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں

روما کے مشہور شاعر ورجل کے حال میں لکھا ہے کہ صبح کو اپنے اشعار لکھواتا تھا اور دن بھر ان پر غور کرتا تھا اور ان کو چھانٹتا تھا۔"

پھر اریستو کے بارے میں کہا:

اریستو شاعر، جس کے کلام میں مشہور ہے کہ کمال بے ساختگی اور آمد معلوم ہوتی ہے، اس کے مسودے اب تک فریرا علاقۂ اٹلی میں محفوظ ہیں، ان مسودوں کے دیکھنے والے کہتے ہیں کہ جو اشعار اس کے نہایت صاف اور سادے معلوم ہوتے ہیں، وہ آٹھ آٹھ دفعہ کاٹ چھانٹ کرنے کے بعد لکھے گئے ہیں۔"

دراصل عربی کے پرانے ناقدین بلکہ تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے ناقدین نے آمد اور آورد کے مسئلے پر بحث کی ہے۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے یورپین تنقید نگاروں اور شعرا سے پہلے شعر کی بے ساختگی اور برجستگی کے حوالے سے اس پر غور و خوض پر زور دیا تھا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ "اپنے کلام کے پہلے مسودے کو حرف آخر سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے۔ ہر شاعر کو چاہیے کہ وہ اپنے کلام کی تنقیح کرے۔ غور و خوض کر کے اس کے نقائص کو دور کرنے کی کوشش کرے اور جب تک کلام کیل کانٹے سے درست نہ ہو جائے اسے منظر عام پر نہ لایا جائے۔"

حالی سے پہلے ابو ہلال العسکری یہی بات ان لفظوں میں کہہ چکے ہیں۔

دورِ جاہلیت میں ایسے شاعروں کی بہت بڑی مقدار تھی جو سال سال بھر اپنے قصیدوں پر نظرِ ثانی کرتے رہتے تھے۔

رمیر کا یہ حال تھا کہ وہ ایک قصیدے کے کہنے میں چھ مہینے
لگاتے تھے اور دوسرے چھ مہینے تک اس پر غور و خوض کرتے
تھے۔''

غرض یہ ہے کہ پرانے عرب نقادوں اور شاعروں نے ''تفحص الفاظ'' پر کافی زور دیا ہے۔ حالی ''تفحص الفاظ'' کے معاملے میں ان عرب تنقید نگاروں اور شاعروں کے خیالات سے اچھی طرح واقفیت رکھتے ہیں۔اور انہیں خطوط پر اپنی بحث کی جزئیات مرتب کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ حالی اپنے تصور ''تفحص الفاظ'' میں قدیم عرب نقادوں سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔خود حالی نے اپنے مقدمے میں ''تفحص الفاظ کے سلسلے میں بعض عربی نقادوں کا خیال دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔

پچھلے صفحات میں اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ حالی نے عربی کتابوں سے استفادہ کیا تھا، لیکن وہ کبھی کبھی غلط حوالہ دے جاتے ہیں۔اس کے اسباب پر بھی کئی اہم نقادوں نے روشنی ڈالی ہے۔ان نقادوں کا خیال ہے کہ حالی اصلاحی مطالب کو بَر لانے کے لیے فنِ تنقید پر عامل ہوئے تھے اس لیے ایک تو وہ قدیم نقادوں کے تصورات میں حسب ضرورت تبدیلی کر لیتے تھے جیسا کہ انہوں نے ملٹن کے اقوال کے بارے میں کیا۔

حالی کے نزدیک شاعر کو اعلیٰ طبقے کے شعرا کا کلام یاد ہونا چاہیے۔وہ اپنی اس رائے میں عربی تنقید نگاروں سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔وہ خود لکھتے ہیں کہ

''ابن رشیق کہتے ہیں کہ شاعر کو اعلا طبقے کے شعرا کا کلام
یاد ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنے شعر کی بنیاد اُسی منوال پر
رکھے۔جو شخص اساتذہ کے کلام سے خالی الذہن ہوگا، اگر
وہ محض طبیعت کی اُپج سے کچھ لکھ بھی لے گا تو اس کو شعر
نہیں بلکہ نظم ساقط از اعتبار یا ٹکسال باہر کہیں گے۔ پس

جب اس کا حافظہ بُلغا کے کلام سے پُر ہو جائے اور ان کی
روش، ذہن کی لوح پر نقش ہو جائے، تب فکرِ شعر کی طرف
متوجہ ہونا چاہیے۔اب جس قدر مشق زیادہ ہوگی، اُس قدر
ملکۂ شاعری مستحکم ہوگا۔"

عربی کے پرانے تنقید نگاروں کے یہاں عروض، بدیع اور بیان سے واقفیت کے ساتھ ساتھ اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کرنے اور بے شمار اشعار یاد رکھنے کی ہدایت مختلف جگہوں میں ملتی ہے۔ ابن خلدون، ابن رشیق، حافظ، ابن سلام وغیرہ نے شاعروں کو بطور خاص یہ تلقین کی ہے کہ وہ اساتذہ کا کلام یاد کریں۔ حالی اس پوری روایت کا بھرپور شعور رکھتے تھے جو عربی کے معیارِ نقد کا احاطہ کرتی ہے۔ عربی تنقید کے اثرات واضح ہونے کے باوجود حالی نے مندرجہ بالا رائے کو بھی غلط طور پر ابن رشیق سے منسوب کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ رائے بھی ابن خلدون کی ہے۔تاہم اردو کے عربی دان اساتذہ اس بات کا ضرور اعتراف کریں گے کہ حالی کے عربی سے اردو میں تراجم حد درجہ صحیح اور صائب ہیں۔

حالی نے مقدمے میں الفاظ کی تلاش وجستجو اور انتخاب کے باب میں لفظ اور معنی کی بحث بھی چھیڑی ہے۔اور اس بات کا ذکر کیا ہے کہ شاعری میں خوبی کا انحصار معانی پر ہے یا الفاظ پر۔ یہ مسئلہ عربی تنقید میں کافی اٹھایا گیا تھا اور اس میں نقادوں کا خاصا اختلاف رہا ہے۔ حالی نے بعض عربی نقادوں سے متاثر ہو کر اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ شاعری اور انشاپردازی کا مدار معانی سے زیادہ الفاظ پر ہے۔ وہ یہاں ابن خلدون سے متاثر نظر آتے ہیں اس لیے کہ انہوں نے اپنی گفتگو کے شروع میں ابن خلدون کا حوالہ دیا ہے۔
"ابنِ خلدون اسی الفاظ کی بحث کے متعلق کہتے ہیں کہ

- انشا پردازی کا ہنر نظم میں ہو یا نثر میں، محض الفاظ
میں ہے، معانی میں ہرگز نہیں۔ معانی صرف الفاظ کے تابع

> ہیں اور اصل الفاظ ہیں۔ معانی ہر شخص کے ذہن میں موجود ہیں، پس ان کے لیے کسی ہنر کے اکتساب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ضرورت ہے تو صرف اس بات کی ہے کہ ان معانی کو کس طرح الفاظ میں ادا کیا جائے۔" وہ کہتے ہیں کہ "الفاظ کو ایسا سمجھو جیسے پیالہ، اور معانی کو ایسا سمجھو جیسے پانی۔ پانی کو چاہو سونے کے پیالے میں، بھرلو، اور چاہو چاندی کے پیالے میں، اور چاہو کانچ یا بلّو ریا سیپ کے پیالے میں، اور چاہو مٹی کے پیالے میں، پانی کی ذات میں کچھ فرق نہیں آتا۔ مگر سونے اور چاندی وغیرہ کے پیالے میں اُس کی قدر بڑھ جاتی ہے اور مٹی کے پیالے میں کم ہو جاتی ہے۔ اِسی طرح معانی کی قدر ایک فصیح اور ماہر کے بیان میں زیادہ ہو جاتی ہے اور غیر فصیح کے بیان میں گھٹ جاتی ہے۔"

حالی ابن خلدون سے متاثر ہو کر کہتے ہیں کہ "ہم یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ شاعری کا مدار جس قدر الفاظ پر ہے، اُس قدر معانی پر نہیں۔ معانی کیسے ہی بلند اور لطیف ہوں، اگر عمدہ الفاظ میں بیان نہ کیے جائیں گے، ہرگز دلوں میں گھر نہیں کر سکتے۔ حالی ابن خلدون کے اس تصور سے اتفاق کرتے بھی ہیں اور نہیں بھی کرتے۔ وہ اس بنیادی بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ "لفظ کی اہمیت بہر حال مسلم ہے اور اسے معنی پر فوقیت حاصل ہے اور انہیں اختلاف ابن خلدون کی اس تشبیہ سے ہے کہ "معانی مثل پانی کے ہیں، سونے کے پیالے میں اس کی قدر بڑھ جاتی ہے اور مٹی کے پیالے میں کم ہو جاتی ہے۔" حاؔلی کہتے ہیں کہ اگر پانی گدلا یا کھاری ہے تو آپ کے پیالہ میں، وہ ہرگز خوشگوار نہیں ہو سکتا اور ہرگز اس

کی قدر نہیں بڑھ سکتی" یہاں بھی حالی کی اخلاقیات بول رہی ہے۔ دراصل وہ جو کہنا چاہتے ہیں اشاروں میں کہہ رہے ہیں۔ یعنی یہ کہ اگر شاعر کا خیال اخلاقی نقطۂ نظر سے پست اور معمولی ہوگا تو الفاظ کی صنعت گری اس پر لاکھ کردی جائے شعر کی قدر و قیمت میں اضافہ نہیں ہوسکتا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لفظ کو اولیت کا درجہ دینے کے باوجود حالی معنی کو کم اہم نہیں سمجھتے" نیچرل شاعری میں زبان کو درستی کے ساتھ استعمال کے سلسلے میں حالی نے لکھا ہے کہ

"مگر اس باب میں سب سے زیادہ مفید، اہلِ زبان کی صحت اور ان کی سوسائٹی میں اتنی مدت تک بسر کرنا ہے کہ ان کے الفاظ ومحاورات بہ قدر معتدبہ، نامعلوم طور پر زبان پر چڑھ جائیں ضرور ہے کہ شعرائے اہلِ زبان کا کلام جس قدر زیادہ ممکن ہو، غور اور توجہ سے بار بار دیکھا جائے۔ نہ اِس ارادے سے کہ خیالات اور مضامین میں ان کی تقلید کی جائے، بلکہ اِس نظر سے کہ وہ الفاظ ومحاورات کو کس طرح استعمال کرتے ہیں اور خیالات کو کن اسلوبوں اور کن پیرایوں میں ادا کرتے ہیں۔

اب واضح ہے کہ حالی بہترین شاعری کی پہچان میں عربی نقادوں سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں ایک کمی بھی نظر آتی ہے جس کی طرف ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے کئی عربی مآخذ کا براہِ راست مطالعہ نہیں کیا اس لیے بعض غلط حوالے دیے ہیں۔ اِس باب میں آخری مثال یہ ہے کہ حالی نے اچھی شاعری کی تعریف میں لکھا ہے کہ "ہمارے نزدیک اس باب میں سب سے عمدہ ابن رشیق کا قول ہے " حالانکہ یہ ابن رشیق کا قول نہیں بلکہ یہ قول بھی ابن خلدون ہی کا

ہے۔اب ہم نے دیکھا کہ حالی نے ابن خلدون کی چند رائیں ابن رشیق سے غلط منسوب کردی ہیں۔ کیونکہ ابن خلدون نے اپنے مقدمے میں اپنے ان خیالات کا اظہار کرتے وقت روئے سخن ابن رشیق کی طرف کیا ہے۔اس لیے مولانا حالی نے سمجھا کہ یہ ابن رشیق ہی کی رائیں ہیں۔ حالانکہ ابن خلدون نے اس مذکورہ بالا شعر کا اپنے مقدمے میں فن شاعری کے سلسلے میں ایک طویل قصیدے میں ذکر کیا ہے۔

سیّد مسعود حسن رضوی ادیب

حیات اور کارنامے

مرتب پروفیسر نذیر احمد

پروفیسر مسعود حسن رضوی تنقید و تحقیقی صلاحیت اور انشاپردازی کا بڑا ملکہ رکھتے تھے۔ اُن کی تصنیف "ہماری شاعری" تنقید اور انشا پردازی کا قابلِ قدر مجموعہ ہے۔اس کتاب میں ہندوستان کے اہم نقادوں اور محققوں کے لکھے ہوئے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ کتاب ان کے علم و فضل کو سمجھنے اور پرکھنے کی طرف ایک اہم قدم ہے۔

فوٹو آفسٹ طباعت، عمدہ گرد پوش۔

صفحات ۲۳۲

قیمت ۶۰ روپے

مہیا عبدالرحمٰن

روسی اور وسط ایشیائی دانش گاہوں میں حالی شناسی

الطاف حسین حالی اردو کے قدیم اور جدید ادب کے درمیان کی سب سے مضبوط کڑی ہیں۔اس لیے سوویت دور میں اُردو ادب کے بارے میں جو تنقیدی اور تحقیقی مقالے لکھے گئے، ان میں حالی کا ذکر کئی حیثیتوں سے آیا ہے خصوصاً مرزا غالب، سرسید احمد خان اور محمد اقبال کے مطالعے میں کئی عالموں نے حالی کی تحریروں کا حوالہ دیا۔لیکن جن عالموں نے خود حالی کی نثری اور شعری تصانیف کے مطالعہ پر خصوصی توجہ دی ان میں لیو دمیلا وسیلوا، ڈاکٹر سیرگئی سُخا چوف اور شرف بانو پولا دودا کے نام امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔

لیو دمیلا کم و بیش گزشتہ چوتھائی صدی کے ماسکو کے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کی اسکالر ہیں۔انہوں نے ڈاکٹریٹ کے لیے حالی کا انتخاب کیا۔اور کچھ عرصے جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں بھی پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کی رہبری میں حالی پر تحقیقی کام انجام دیا۔یہ مقالہ جس کا عنوان ''نیک دل باغی'' ہے ۱۹۹۷ء میں Institute of Oriental Studies ماسکو نے شائع کیا۔

ڈاکٹر لیو دمیلا نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ حالی اردو کے کلاسیکی ادب کے جدید دور

میں داخل ہونے کے عبوری عہد کی پیداوار تھے۔ اِس عبوری عہد کے بیشتر مسائل کا واضح عکس اور مطالعہ ان کی تحریروں میں ملتا ہے۔ان کا تعلق اس عہد کے سماجی، سیاسی فنی اور جمالیاتی شعور کی تعمیر نو سے بھی تھا اور اس بسیط عمل میں حالی نے تعقل دوستی اور روشن خیالی کے تصورات کی طرف اپنے ہم وطنوں کی رہنمائی بھی کی۔لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ حالی کے یہاں اُس عہد کی دانش کے تضادات،اختلافات اور دیگر مسائل بھی ملتے ہیں۔

ڈاکٹر لیو دمیلا وسیلوا نے اپنے اِس مطالعہ کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب کا عنوان ہے "پانی پت کا واعظ" دوسرا باب ہے "عہدِ بیداری کی شعریت" تیسرا باب ہے "نئی غزل" چوتھے باب کا عنوان "مدوجزر اسلام" ہے اور آخری باب ہے "عالموں کا آفتاب"۔

جیسا کہ قارئین سمجھتے ہیں مصنفہ نے پہلے باب میں روسی قارئین کے لیے حالی کی سوانح حیات کا جائزہ لیا ہے لیکن یہ بات بھی رسمی اور سطحی نہیں ہے۔لیو دمیلا نے حالی کی سوانح پر لکھی ہوئی مستند تحریروں کی کمی کا شکوہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے خود حالی کی مختصر آپ بیتی اور کچھ دوسری معتبر تحریروں کے حوالے سے ۱۸۷۴ اور بعد کی زندگی کا ایک خاکہ مرتب کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ بعد میں حالی نے ایک مصلح، ایک نظریہ ساز اسکالر، جدید شاعری کے بانی اور قوم پرست شاعر کی حیثیت سے جو کارنامے انجام دیے، ان کی بنیادیں یقیناً ان کی نوعمری میں ہی پڑی ہوں گی لیکن ان کے بارے میں صحیح معلومات کی کمی کھٹکتی ہے۔

ڈاکٹر لیو دمیلا نے وضاحت سے بتایا ہے کہ اردو کی قدیم شاعری جس علم بدیع اور عہد وسطیٰ کے جن شعری نظریات کے سائے میں پروان چڑھی، اس کے امکانات انیسویں صدی کے نصف اول میں اپنے خاتمہ تک پہنچ گئے جب نئے عہد کی حقیقتیں اور نئے تقاضے ابھر کر سامنے آنے لگے۔

حالی کے حوالے سے لیو دمیلا نے لکھا ہے کہ شعری روایت اور ضابطوں کی تنگی کا احساس سب سے پہلے مرزا غالب کو ہوا اور انہوں نے اپنے اظہار کے لیے نئی وسعت کا تقاضا کیا لیکن غالب کے معاصرین اس پیغمبر شاعر کی آواز اور اشاروں کو نہ سمجھ سکے اور بعد کی نسلوں نے بھی اگر سمجھا یا وہ غالب کی طرف متوجہ ہوئیں تو حالی کی مدد سے۔ حالی نے اس طرح نئی نسلوں کو یہ بھی سمجھایا کہ اگر اردو شاعری کو آگے کا سفر طے کرنا اور نئی روایات کو لے کر چلنا ہے تو ادب و شعر کا رشتہ حقیقی زندگی اور اس کے بے شمار مسائل سے جوڑنا ہوگا۔

ڈاکٹر لیو دمیلا نے اپنے مقالے میں وضاحت اور استدلال کے ساتھ ایسے سوالوں کا جواب دیا ہے جیسے حالی کی اصلاحی مہم سے اردو شاعری کو کیا ملا؟ نئی نسلوں کے تخلیقی عمل پر اس کا کیا اثر پڑا۔ حالی کی کوششوں سے اردو شاعری نہ صرف عام انسانی زندگی بلکہ قومی مسائل سے کیونکر جڑی؟ مصنفہ کا خیال ہے کہ یہ حالی کی اصلاحی فکر اور ہندوستانی مسلمانوں کی زوال آمادگی کے بارے میں ان کی گہری تشویش تھی جس نے محمد اقبال جیسے قدآور شاعر کو پیدا کیا۔ مجموعی طور سے ڈاکٹر لیو دمیلا نے اپنے مقالے میں یہ ثابت کیا ہے کہ اردو ادب اور تنقید کے میدان میں حالی کو نظریاتی اور عملی تنقید کا بانی کہا جا سکتا ہے۔ بے شک ان کے بعض خیالات میں گہرائی کی کمی ہے اور ان سے اختلاف بھی کیا گیا ہے لیکن اس سے ان کے کارنامے کی قدر و قیمت پر زیادہ اثر نہیں پڑتا۔

ایک باب میں ڈاکٹر لیو دمیلا نے حالی کی شاعری کا جائزہ بھی تفصیل سے لیا ہے۔ روایتی انداز سے ہٹ کر انہوں نے ان کی غزلوں کی درجہ بندی کی ہے اور بتایا ہے کہ "مقدمہ" میں انہوں نے روایتی غزل کے بارے میں جو سخت تنقیدی رویہ اختیار کیا تھا اس کا تقاضہ تھا کہ وہ اپنی غزل کو اپنے اصلاحی خیالات کی روشنی میں ایک ماڈل بنا کر پیش کریں۔ مصنفہ نے اسی زاویۂ نظر سے ان کی غزلوں کی درجہ بندی کی ہے۔ دراصل روسی قارئین کو مشرقی صنف شاعری غزل کے لطیف اور نازک پہلوؤں سے روشناس کرانا

مشکل ہوتا ہے۔ پھر بھی ڈاکٹر لیو دمیلا نے اپنے تربیت یافتہ ذوقِ شاعری کی مدد سے اس کوشش میں ایک حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ ان کی زیادہ توجہ حالی کی نظم نگاری کے مطالعہ پر صرف ہوئی ہے۔ وہ اپنے مقالے میں لکھتی ہیں

> مبالغہ نہ ہوگا اگر میں کہوں کہ یہ نظم بیدار ہوتے ہوئے مسلمانوں کے جذبات اور خیالات کی تصویر ہے۔ مسدس نے اردو شاعری میں ایک عہد آفریں قومی نظم کی حیثیت سے اپنی جگہ بنائی۔ اس میں حالی نے اپنی سماجی اور سیاسی فکر کو بھی موثر ڈھنگ سے ادا کیا ہے اور اس طرح اردو میں قومی شاعری کی روایت کو استحکام بخشا۔ حالی اردو ادب کی تاریخ میں پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اپنے عہد کے مسائل کو شاعری کا روپ دیا اور جیسا کہ اُس عہد کے اخبارات نے لکھا کہ مسدس نے اردو قارئین کے دل و دماغ میں تہلکہ سا مچا دیا۔ انہیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ کسی دوسری ادبی تخلیق کو ایسی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ یہ نظم مسدس کے فارم میں لکھی گئی تھی اور اس کا عنوان ''مدوجزر اسلام'' تھا لیکن یہ اس کی مقبولیت کا ثبوت تھا کہ نظم اپنے اصل عنوان کے بجائے ''مسدس حالی'' کے نام سے زیادہ مشہور ہوئی۔

نظم کے آغاز میں مرثیہ کا انداز غالب ہے۔ یعنی شاعر مسلمانوں خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کے خاتمہ اور زوال پر آنسو بہاتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ نظم کی فلسفیانہ تعبیر ایک رزمیہ قومی نظم کی صورت میں شروع ہوگئی۔ شاعر کا حقیقی مقصد قوم کو بیدار کرنا تھا جو عظمت رفتہ کی یادوں اور تصورات کے گھنے سائے میں جی رہی تھی۔ اِس قوم کو

حرکت میں لاتا تھا حالی نے لکھا ہے

"میں نے اپنے بے ہنر اور بے صلاحیت ہاتھوں سے اپنی
قوم کے لیے ایک شیشے کا گھر بنایا تا کہ اس کے اندر داخل
ہو کر وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے کہ پہلے وہ کیا تھا اور اب
کیا ہے"۔

ڈاکٹر لیو دمیلا لکھتی ہیں

"میری دانست میں یہ شیشے کا گھر بے حد تجربہ کار اور ماہرِ فن
ہاتھوں نے بڑی مہارت سے بنایا تھا اور بروقت بنایا تھا"۔

یہ وہ زمانہ تھا جب قوم اس قسم کی فکری نظم کی معنویت کو سمجھنے اور اس پر سوچنے کے لیے آمادہ تھی۔ حالی نے خود لکھا ہے کہ اگر لوگوں کے دل اس نظم کے مطالب اور پیغام کو سمجھنے کے لیے تیار نہ ہوتے تو اس کے سارے مصرعے ضائع ہو جاتے۔

ہر چند کہ یہ نظم ہندوستانی مسلمانوں کو خطاب کر کے لکھی گئی تھی لیکن اس میں جو مسائل اٹھائے گئے تھے اور ان کے جو حل بتائے گئے تھے وہ فرقے اور مذہب کی حد بندیوں سے آزاد تھے وہ کسی بھی فرقے یا مذہب کے ہندوستانیوں کے دل میں اتر سکتے تھے اور اترے۔ چنانچہ یہ سچ ہے کہ "مسدس حالی" کے بعد اس انداز کی بے شمار اصلاحی قومی نظمیں اردو اور ہندی میں لکھی گئیں۔

ڈاکٹر لیو دمیلا نے بڑے اعتماد سے لکھا ہے کہ اگر حالی نے مسدس کے علاوہ اور کچھ نہ لکھا ہوتا تب بھی ان کا نام اردو ادب کی تاریخ میں زریں حروف میں نقش ہوتا۔

ماسکو میں اردو زبان و ادب کے سب سے معتبر اسکالر ڈاکٹر اے۔ سی سخاچوف تھے جو دو سال قبل وفات پا گئے۔ انہوں نے بے شمار تحقیقی مضامین کے علاوہ روسی زبان میں اردو ادب کی تاریخ لکھی۔ اس کے علاوہ ممتاز شاعر مخدوم محی الدین کی حیات و شاعری پر

ایک مونوگراف بھی شائع کیا۔ ان کا ایک اہم مضمون حالی کی تمثیلی نظم ''مناظرۂ رحم وانصاف'' پر شائع ہوا تھا۔ یہ نظم حالی نے ۱۸۷۴ء میں لکھی تھی جو اردو میں جدید نظم نگاری کا بالکل ابتدائی دور تھا۔ بعد میں انہوں نے ''مناظرۂ واعظ وشاعر'' جیسی تمثیلی اور اخلاقی نظمیں بھی لکھیں۔
سخاچوف نے ابتدا میں اردو شاعری کے روایتی کردار اور اس کے بندھے ٹکے موضوعات پر روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے اردو شاعری میں سخت جمود کی کیفیت تھی جسے انگریزی شاعری اور روشن خیالی کے تصورات کی پیشکش کے لیے محمد حسین آزاد اور حالی نے توڑا۔ ڈاکٹر سخاچوف نے لکھا ہے کہ حالی نے جب یہ نظم لکھی اس وقت تک وہ سرسید کے اصلاحی خیالات سے بھی متاثر نہیں ہوئے تھے۔ ٹیکنک کے اعتبار سے بھی یہ نظم اردو میں ایک نیا تجربہ کہی جا سکتی ہے۔

اُسی دور میں مشرقی اور مغربی تہذیب کا جو ٹکراؤ شروع ہوا تھا حالی کی اس نظم میں اس کا واضح عکس بھی ملتا ہے۔ مثال کے طور پر رحم مشرق کی صفات اور اقدار کی تجسیم ہے تو انصاف مغرب کی آواز ہے جو جذبات پر قابو پا کر معقولیت پسندی سے کام لینے پر زور دیتی ہے۔ ضبط ونظم پر اصرار کرتی ہے۔ اِس میں دردمندی اور ہمدردی کے لیے جگہ نہیں ہے۔ لیکن انصاف کے لیے ضروری ہے مطلق العنان ظالمانہ حکومت سے نجات ملے اور اسکے ساتھ ہی آزادی رائے اور اخبارات کے ذریعے اظہار کی آزادی ہو۔ اس طرح حالی انصاف کا نام لے کر انسانی حقوق، انسانی وقار اور روشن خیالی کی ایک نئی سمت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ سخاچوف اس پر بھی زور دیتے ہیں کہ حالی کے ذریعے اردو نظم میں جو نئی لفظیات داخل ہوئی مثلاً قوم، حب الوطنی، عوام، فرقہ، غلامی، آزادی وغیرہ یہ سب الفاظ ایک نئی ذہنی بیداری کی علامت بن گئے۔

سخاچوف نے لکھا ہے کہ حالی رحم اور انصاف کے مکالمے اور بحث کو نظم کے آخر میں ایک صحیح موڑ دے کر عقل کو درمیان میں لاتے ہیں اور اس طرح مشرقی اور مغربی اقدار

کے درمیان مفاہمت کا ایک رشتہ قائم کرتے ہیں۔

وسطی ایشیا کی مملکت تاجکستان کی دوشنبے یونیورسٹی کی اسکالر ڈاکٹر شرف بانو پولادووا تیسری حالی شناس ہیں۔ انہوں نے حالی کی تصنیف ''مجالس النسا'' پر ایک اہم مقالہ لکھا۔ اس کتاب کو بھی شمالی ہندوستان میں روشن خیالی کی تحریک کا ایک حصہ سمجھا گیا اگرچہ شرف بانو حامد حسن قادری کی اِس رائے سے متفق ہیں کہ یہ ناول سے کہیں زیادہ ایک اخلاقی قصے کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ لیکن وہ یہ بھی مانتی ہیں کہ اُس عبوری دور میں مختلف اصناف ایک دوسرے کے قریب آتی نظر آتی ہیں اور ان کی بہت سی صنفی خصوصیات مشترک نظر آتی ہیں۔

کتاب کے نو ابواب یا نو مجلسیں ہیں اور ہر مجلس، ڈرامہ کے ایک منظر یا ایکٹ کی طرح کھلتی ہے اور سماج میں عورت کی حیثیت، مرتبہ اور مسائل پر روشنی ڈالتی ہے۔ حالی وضاحت سے یہ دکھاتے ہیں کہ عورت کی جہالت، لاعلمی اور ذہنی پسماندگی سے پورے سماج کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے۔ ماں کا آغوش ہر مرد کے لیے پہلی تربیت گاہ ہوتا ہے جس میں پرورش یا کر وہ سماج کا ایک ذمہ دار رکن بنتا ہے۔ ڈاکٹر پولادووا بہت وضاحت سے اس کتاب کے موضوع کا مطالعہ پیش کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ نہ صرف تعلیمی اعتبار سے یہ کتاب نئے متوسط طبقے کی ذہنی نشونما کے لیے غذا فراہم کرتی ہے بلکہ اخلاقی اور تہذیبی تربیت کے لیے بھی لڑکیوں کے لیے ایک مدرسے کا کام دیتی ہے۔

اسی طرح کی روشن خیالی کی تحریک انیسویں صدی کے آخر میں وسط ایشیائی علاقہ میں بھی پھیلی تھی اور تاجک اور ازبیک علاقوں میں اس کا خاطر خواہ اثر بھی ہوا۔

ڈاکٹر شرف بانو پولادووا نے حالی کے سلسلے میں ایک اور کام بھی کیا ہے وہ یہ کہ ۱۹۸۷ء میں انہوں نے ''ارمغان'' کے نام سے حالی کی فارسی شاعری کا ایک انتخاب مرتب کر کے ''نشریاتِ دانش'' دوشنبے سے شائع کیا۔ یہ ادارہ دراصل اکادمی علوم، تاجکستان

کا ایک حصہ رہا ہے۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ مولانا حالی فارسی زبان پر کامل دسترس رکھتے تھے۔ اور اردو کے علاوہ کبھی کبھی فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ اِس مجموعے میں بیس غزلیں، آٹھ رباعیاں، چھ نظمیں اور چند فردیات شامل ہیں۔ بے شک بول چال کی تاجک زبان میں ترکی کے اثر سے کچھ فرق ضرور پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن ادبی تاجکی زبان بڑی حد تک وہی ہے جو ہندوستان میں درس و تدریس اور اظہار کا ذریعہ رہی ہے۔ اس لیے امید ہے کہ حالی کے اس منتخب فارسی کلام کی داد تاجک لوگوں نے بھی دی ہوگی۔ ڈاکٹر شرف بانو نے ابتدا میں لکھا ہے حالی کی ادبی میراث غنی اور رنگارنگ ہے۔ جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے وہ منظومات، تنقیداتِ ادب سوانح نگاری کے اولین نمونوں، مضامین اور بدیعی نثر پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر شرف بانو نے ایک عالمانہ پیش لفظ بھی لکھا ہے جس میں اردو ادب خصوصاً جدید اردو شاعری میں حالی کی امتیازی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ اِس سلسلے میں چند جگہوں پر اپنے خیالات کی تائید میں انہوں نے حالی کے اردو اشعار کا فارسی میں آزادانہ ترجمہ بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر شرف بانو نے حالی کی وطن دوستی اور قوم پروری پر خصوصیت سے زور دیا ہے۔ ان ہی کے الفاظ میں حالی نے اپنی شاعری اور نثری تحریروں میں ہندوستانی سماج کی پسماندگی، جہالت، تعصب، تنگ نظری، ریا کاری یہاں تک کہ صنفی نابرابری کے خلاف آواز بلند کی اور اصلاحِ معاشرت کا پیغام دیا۔

ڈاکٹر شرف بانو نے ''یادگارِ غالب'' کے علاوہ حالی کی تصنیف ''حیاتِ سعدی'' کا خاص طور سے ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ حالی نے یہ کتاب شوق و انہماک اور تحقیق کے ساتھ تصنیف کی تھی۔ سعدی کی نظم و نثر اور ان کے اخلاقی تصورات نے حالی کو خصوصیت سے متاثر کیا تھا۔ مشرف بانو نے لکھا ہے کہ اسی لیے ان کو ''سعدیٔ ہند'' کا خطاب بخشا گیا۔

ایک خاص بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ ڈاکٹر شرف بانو نے ''انتخاب'' میں حالی کی

جو غزلیات شامل کی ہیں ان میں سے بیشتر سعدی کے اخلاقی رنگ کے بجائے خواجہ حافظ کے عاشقانہ اور رندانہ اسلوب سے متاثر نظر آتی ہیں یا شاید یہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کا اثر ہو، حالی جن کی شاگردی پر فخر کرتے تھے۔

سیّد مسعود حسن رضوی ادیب
حیات اور کارنامے

مرتب۔ پروفیسر نذیر احمد

پروفیسر مسعود حسن رضوی تنقید و تحقیقی صلاحیت اور انشا پردازی کا بڑا ملکہ رکھتے تھے۔ اُن کی تصنیف ''ہماری شاعری'' تنقید اور انشا پردازی کا قابلِ قدر مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں ہندوستان کے اہم نقادوں اور محققوں کے لکھے ہوئے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب ان کے علم و فضل کو سمجھنے اور پرکھنے کی طرف ایک اہم قدم ہے۔

فوٹو آفسٹ طباعت، عمدہ گرد پوش۔

صفحات ۲۳۲

قیمت ۶۰ روپے

سرگرمیاں

غالب تقریبات

(۲۸، ۲۹، ۳۰ر دسمبر ۲۰۰۲ء)

غالب انسٹی ٹیوٹ کے ذریعے منعقد ہونے والے بین الاقوامی غالب سمینار کے افتتاحی اجلاس کے موقع پر سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے جناب شاہد مہدی صاحب وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کہا کہ الطاف حسین حالؔی پر منعقد ہونے والا یہ سمینار اس اعتبار سے بھی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ حالی پہلے غالب شناس ہیں غالب کو ادبی دنیا میں سب سے پہلے حالی نے روشناس کرایا۔ آپ نے حالی کے چند اشعار پیش کر کے یہ بتایا کہ حالی کے اشعار موجودہ حالات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ آپ نے اس موقع پر حالی کے نظریۂ تعلیم کا بھی ذکر کرتے ہوئے کہا کہ حالی اردو کا سب سے پہلا شاعر ہے جس نے تعلیم نسواں کو ضروری قرار دیا۔ اس سے پہلے غالب

انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر شاہد ماہلی نے انسٹی ٹیوٹ کی کارکردگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ پچھلے تیس سال سے غالب، عہدِ غالب اور معاصرین غالب پر تحقیق و تنقید میں سرگرم ہے اس موقع پر آپ نے انسٹی ٹیوٹ میں ہو رہی ہے مسلسل ادبی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہ انسٹی ٹیوٹ نے نوجوان اسکالرس کا خاص خیال رکھا ہے اور ان کے لیے ایک روزہ سمینار کا بھی خصوصیت کے ساتھ اہتمام کیا ہے ادیبوں کو یاد کرنا اور ان کے اعزاز میں تہنیتی جلسہ کرنا اور انہیں انعامات سے نوازنا اب اس ادارے کی روایت بن چکی ہے۔ اس موقع پر انسٹی ٹیوٹ کے وائس چیرمین پروفیسر نذیر احمد صاحب نے اپنے صدارتی خطبے میں حالی کی شاعری اور ان کی نثر نگاری کی قدر و قیمت پر سیر حاصل گفتگو کی۔ آپ نے حالی کی نظم اور مسدس حالی کے چند ٹکڑے پیش کر کے حالی کی شعری معنویت پر بھی روشنی ڈالی۔ اس موقع پر پروفیسر نذیر احمد نے غالب انعامات ۲۰۰۱ء بھی اپنے ہاتھوں سے دیا اس دفعہ انعام یافتگان میں پروفیسر شمیم حنفی کو فخر الدین علی احمد غالب انعام برائے تنقید و تحقیق، پروفیسر وہاب اشرفی کو غالب انعام برائے اردو نثر، جناب عمر انصاری کو غالب انعام برائے اردو شاعری، پروفیسر ساجدہ زیدی کو ہم سب غالب انعام برائے اردو ڈرامہ اور جناب گلزار دہلوی کو غالب انعام برائے مجموعی ادبی خدمات کے لیے نوازا گیا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ سے چھپنے والی چند کتابوں کی رسمِ اجراء بھی جناب شاہد مہدی صاحب کے دستِ مبارک سے ہوئی۔ جن کتابوں کی رسمِ اجراء ہوئی ان میں غالب کی فارسی شاعری (پروفیسر وارث کرمانی)، داغ دہلوی حیات اور کارنامے، غالب پر چار تحریریں (پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی) محمد رفیع سودا تحقیقی و تنقیدی جائزے کے علاوہ انسٹی ٹیوٹ کا ششماہی مجلّہ غالب نامہ بھی شامل تھا۔

اس جلسے کی خصوصیت الطاف حسین حالی کے خاندان کی چشم و چراغ محترمہ سیدہ حمید صاحبہ کی تقریر تھی آپ نے مسدس حالی کے چند بند انگریزی کے ترجمے کے ساتھ پیش فرمائیں۔ محترمہ سیدہ حمید صاحبہ کی آٹھ سال کی مسلسل کوششوں سے حالی کے مسدس کے تمام بند کے ترجمے خود انہوں نے کیے ہیں۔ اس جلسے کا اختتام خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب کے شکریے کے کلمات سے ہوا آپ نے تمام مہمان مقالہ نگار ایوارڈ یافتگان اور سامعین کا فرداً فرداً شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر سکریٹری غالب انسٹی ٹیوٹ جناب بدر دُرریز احمد، پروفیسر سید امیر حسن عابدی کے علاوہ بڑی تعداد میں دانشور، ادیب، شعرا، اور علم وادب سے جڑی ہوئی نامور ہستیاں موجود تھیں۔ جلسے کے اختتام کے بعد ممبئی کے مشہور گلوکار جسونتدر سنگھ نے غالب کی غزلیں گا کر اس شام کو تاریخی بنا دیا۔

حسبِ دستور امسال بھی غالب تقریبات کے تحت ایوانِ غالب میں غالب و حالی کی زمین میں محفلِ مشاعرہ کا انعقاد ۲۹؍دسمبر کو کیا گیا مشاعرے کا افتتاح انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری جناب بدر دُرریز احمد نے شمع روشن کر کے کیا۔ اس مشاعرے کی صدارت مشہور شاعر و دانشور ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے کی اور نظامت کا فریضہ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے انجام دیا۔ جن شعراء نے شرکت کی ان کے اسماء گرامی کچھ اس طرح ہیں ندا فاضلی (ممبئی)، مظہر امام (دہلی)، ملک زادہ منظور احمد (لکھنؤ)، عمر انصاری (لکھنؤ)، پروفیسر ساجدہ زیدی (علی گڑھ)، پروفیسر شہریار (علی گڑھ)، بیکل اتساہی (بلرام پور)، ولی بجنوری (بجنور)، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی (دہلی)، گلزار دہلوی (دہلی)، وسیم بریلوی (بریلی)، زبیر رضوی (دہلی)، مخمور سعیدی (دہلی)، حیات لکھنوی (دہلی)، ملکہ نسیم (جے پور)، رفعت

سروش (دہلی)، عبدالاحد ساز (ممبئی)، پروفیسر اعجاز علی ارشد (پٹنہ)، موج رامپوری (دہلی)، شین کاف نظام (جودھپور)، پاپولر میرٹھی (میرٹھ)، شکیل اعظمی (ممبئی)، ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی (علی گڑھ)، جناب شکیل حسن شمسی (دہلی)، رادھے شیام رستوگی (لندن)، اسلم الہ آبادی (الہ آباد)، شاہد ماہلی (دہلی)۔

۲۹ دسمبر کی صبح بین الاقوامی غالب سمینار منعقد ہوا اس دفعہ کے سمینار کا موضوع ''الطاف حسین حالی'' تھا۔ سمینار میں مشاہیر اہل قلم اور معروف محقق و نقاد موجود تھے۔ پہلے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، پروفیسر حنیف نقوی اور جناب رشید حسن خاں نے انجام دی۔ اس اجلاس میں پانچ مقالات پیش کیے گئے۔ ازبکستان سے تشریف لائی خاتون ڈاکٹر محیی عبدالرحمٰن نے اپنا مقالہ ''روس اور وسط ایشیائی دانشگاہوں میں حالی شناسی'' کے عنوان سے پیش فرمایا۔ آپ نے اپنے مقالے میں وسط ایشیا میں موجودہ ادبی صورت حال کے علاوہ حالی و غالب پر ہو رہی تحقیق کا بھی خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا۔ ''حالی اور علی گڑھ'' کے عنوان سے پروفیسر اصغر عباس کا مقالہ بھی پُر مغز تھا آپ نے حالی اور سرسید کے رشتوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ حالی کی ذہنی نشو نما میں علی گڑھ کا کیا اہم رول رہا ہے۔ سائنٹفک سوسائٹی اینگلو عربک اسکول اور تہذیب الاخلاق سے جو حالی کا رشتہ تھا اس کا بھی ذکر آپ نے اپنے مقالے میں کیا۔ اس کے علاوہ اس اجلاس میں ڈاکٹر مظہر مہدی کا مقالہ ''حالی کی مذہبی فکر'' محمد مشتاق تجاوری کا مقالہ ''مولانا حالی ایک اہم تصنیف صحیفہ کلیات حالی'' اور ڈاکٹر وسیم بیگم کا مقالہ ''مولانا الطاف حسین حالی اور تعلیم نسواں'' کے موضوع پر تھا اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر رضا حیدر نے انجام دی۔

دوسرے اجلاس کی صدارت کے لیے پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر اقتدار حسین صدیقی اور ڈاکٹر کاظم علی خاں موجود تھے۔ اس اجلاس کا اہم مقالہ ڈاکٹر خلیق انجم کا تھا آپ نے حالی کی ادبی زندگی اور سوانح حالی کے حوالے سے کافی تفصیلی

گفتگو کی خاص کر آپ نے حالی کے اشعار کے ذریعہ ان کی شخصیت کا بھی بھرپور تعارف پیش کیا۔ ڈاکٹر اسلم پرویز کا مقالہ ''حالی کی نظمِ اردو اور انجمن پنجاب'' کے عنوان سے کافی علمی تھا۔ آپ نے اپنے مقالے میں حالی کی غزلیہ شاعری اور ان کے یہاں پایا جانے والا اعلیٰ درجے کا ادبی مذاق کا بھی بھرپور ذکر کیا۔ انجمنِ پنجاب سے جو حالی کا رشتہ تھا اس کا بھی آپ نے اپنے مقالے میں حوالہ دیا۔ اس کے علاوہ پروفیسر شمس الدین کا مقالہ ''غالب ایک ہندوستانی فارسی قصیدہ گو شاعر کی حیثیت سے'' ڈاکٹر احمد محفوظ کا مقالہ ''حالی اور غزل کی تنقید'' اور پروفیسر صغریٰ مہدی کا مقالہ ''تحریکِ نسواں کے علمبردار خواجہ الطاف حسین حالی'' کے عنوان سے تھا۔ اس اجلاس کی نظامت کا فریضہ ڈاکٹر را شد انور راشد نے انجام دیا۔

تیسرے اجلاس کی صدارت کا فریضہ پروفیسر شمس الدین، ڈاکٹر اسلم پرویز، ڈاکٹر اسامہ فاروقی نے انجام دیا۔ تیسرے اجلاس کا پہلا مقالہ ڈاکٹر سراج الدین اجملی کا تھا آپ نے ''نظمِ حالی۔ جدید اردو نظم کا نقش اول'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش فرمایا۔ آپ نے حالی کی موضوعاتی نظموں میں لفظی تصویر کشی تشبیہات کا استعمال، صنائع بدائع کا استعمال اور خوبصورت امیجری کا بھرپور تعارف پیش کیا ہے۔ آپ نے مناظرہ رحم و انصاف مناظرہ واعظ و شاعر، دولت اور وقت کا مناظرہ جیسی موضوعاتی نظم پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی کا بھی مقالہ حالی کے تنقیدی شعور کے حوالے سے اہلِ نظر دعوتِ غور و فکر دے رہا تھا۔ ''حالی کی معنویت'' کے موضوع پر ڈاکٹر علی احمد فاطمی کا مقالہ بھی حالی کی قدر و قیمت اور شعر و ادب کی معنویت پر فکر انگیز تھا۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا بھی مضمون اس اجلاس کے اہم مقالوں میں سے تھا اس اجلاس کا آخری مقالہ جناب شین کاف نظام کا ''مقدمہ شعر و شاعری اور شعری زبان'' کے عنوان سے تھا۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر محمود فیاض نے انجام دی۔

سیمینار کے دوسرے دن کا آخری اجلاس ڈاکٹر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر تنویر احمد علوی اور پروفیسر ظہیر الدین ملک کی صدارت سے ہوا۔ آخری اجلاس میں تین مقالے پڑھے گئے پہلا مقالہ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کا ''مقالات حالی'' کے عنوان سے تھا اس اجلاس کے دو مقالے ڈاکٹر اسامہ فاروقی اور پروفیسر اقتدار حسین صدیقی کے نہایت ہی مدلّل اور تاریخی اہمیت کے حامل تھے۔ خصوصاً پروفیسر اقتدار حسین صدیقی کا مقالہ (پانی پت کی ثقافتی تاریخ) تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ نے اپنے اس مقالے میں پانی پت کی تاریخی، ثقافتی اور ادبی حیثیت کا ایک تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر اسامہ فاروقی کا مقالہ بھی ''نیک نفس باغی الطاف حسین حالی۔ روشن خیال شاعر بھی کافی علمی تھا۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر شکیل جہانگیری نے انجام دی۔

سیمینار کا پانچواں اجلاس ۳۰ دسمبر، بروز اتوار کو ۱۰ بجے صبح شروع ہوا اس اجلاس کی صدارت کے لیے پروفیسر ساجدہ زیدی، ڈاکٹر ریحانہ خاتون اور ایرانی اسکالر ریحیٰ طالبیان کو زحمت دی گئی تھی۔ اس اجلاس کا پہلا مقالہ ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کا تھا۔ ''دیوان حالی کا مقدمہ ایک مطالعہ'' کے عنوان سے آپ کا مقالہ حالی فہمی میں نئے باب کا اضافہ تھا۔ دیوانِ حالی کے مقدمے کے حوالے سے چونکہ بہت کم لکھا گیا ہے لہٰذا آپ کا مقالہ نئے افکار کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس اجلاس کا دوسرا مقالہ پروفیسر مختار الدین احمد کا تھا ''حالی کی کچھ کمیاب تحریریں'' کے عنوان سے آپ کا مقالہ نہایت مدلّل تھا۔ ڈاکٹر کاظم علی خاں کا مقالہ ''مولانا حالی اور حلقۂ اودھ پنچ'' کے عنوان سے تھا۔ صحافتی طنز و مزاح کا شاہکار ہفتہ وار اخبار اودھ پنچ میں حالی کے خلاف جو معرکہ آرائیاں ہوئی ہیں اس کا ذکر ڈاکٹر کاظم علی خاں صاحب نے اپنے مقالے میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ مولانا کے دیوان کے مقدمے میں شاعری کے اصلی مفہوم پر جو بحث کی گئی ہے اور جس کا شکار مولانا کو اخبار اودھ پنچ کے ذریعے ہونا پڑا اس

کا بھی تذکرہ مقالہ نگار نے اپنے مقالے میں خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔ اس اجلاس کا دوسرا مقالہ بھی تحقیقی تھا ''مسدس حالی کا تاریخی پس منظر'' کے عنوان سے پروفیسر ظہرالدین ملک کا مضمون تاریخی اہمیت کا حامل تھا اور ''یادگار غالب'' کے عنوان سے ڈاکٹر رشید حسن خاں کا مضمون بھی تحقیقی نوعیت کا تھا۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے انجام دی۔

سمینار کا چھٹا اجلاس پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیس قمر رئیس اور پروفیسر نثار احمد فاروقی کی صدارت میں ہوا۔ سمینار کا یہ اجلاس تمام اجلاس میں سب سے اہم تھا اس اجلاس میں پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر حنیف نقوی اور پروفیسر سید محمد عقیل رضوی جیسے اہم دانشوروں اور نقادوں کا پرچہ تھا۔ پہلا مقالہ پروفیسر شریف حسین قاسمی کا ''یادگارِ غالب میں غالب کے منشور فارسی آثار کے اقتباسات کے تراجم پر ایک نظر'' کے عنوان سے تھا۔ پروفیسر موصوف نے پچھلے دنوں یادگار غالب کا فارسی ترجمہ بھی کیا ہے جو اب کتابی شکل میں ایرانی غالب شناسوں میں کافی مقبول ہے۔ آپ نے یادگارِ غالب میں غالب کے منشور فارسی آثار کے اقتباسات کے تراجم پر نہایت ہی مدلّل اور علمی گفتگو کی ہے۔

پروفیسر ابوالکلام قاسمی کا مقالہ بھی ''غزل کی تنقید اور الطاف حسن حالی'' کے عنوان سے نہایت ہی جامع اور پُر مغز تھا۔ مقدمہ شعروشاعری کے اخلاقی حصے میں غزل، قصیدہ اور مثنوی جیسی اصناف کی معنویت اور ان اصناف میں موجود شعری سرمایے کے جائزے میں حالی کے مرتب کردہ نظریۂ شعر اور تنقیدی اصولوں کی خوبیوں اور خامیوں کو آپ نے تنقیدی نقطۂ نظر سے اپنے اس مقالے میں دیکھا ہے۔ پروفیسر حنف نقوی کا مضمون ''مکاتیب غالب'' پروفیسر سید محمد عقیل رضوی کا مضمون ''مشرقی حالی پر مغرب کا نوآبادیاتی دباؤ'' اور پروفیسر شمیم حنفی کا مضمون ''حالی اور نشاۃ ثانیہ''

کے عنوان سے حالی فہمی میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر علیم اشرف نے انجام دی۔

سیمینار کے ساتویں اجلاس کی مسند صدارت پر ڈاکٹر عراق رضا زیدی، پروفیسر ابوالکلام قاسمی اور پروفیسر سید محمد عقیل رضوی تشریف فرما تھے۔اس اجلاس کے مقالے نگاروں میں پروفیسر انیس اشفاق کا مقالہ ''حالی کی تنقید مقدمہ شعروشاعری اور یادگارِ غالب کے دوراہے پر'' پروفیسر غفار شکیل کا مقالہ ''حالی کا لسانی شعور اور اسلوب'' پروفیسر غفار شکیل کا مقالہ ''حالی کا لسانی شعور اور اسلوب'' پروفیسر عبدالحق کا مقالہ ''حالی کی انتقادی فکر تہذیبی حوالے سے'' اور پروفیسر نثار احمد فاروقی کا مقالہ ''مولانا الطاف حسین حالی ''قدامت اور جدت کے درمیان'' اور پروفیسر عبدالودود اظہر کا مقالہ ''حالی حیات سعدی کے حوالے سے'' کے عنوان سے تھا یہ تمام مقالے نہایت ہی جامع 'علمی اور کافی محنتوں سے لکھے گئے تھے۔اس اجلاس کی نظامت کا فریضہ ڈاکٹر وسیم راشد نے انجام دیا۔سیمینار کے اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر صادق، پروفیسر عبدالحق اور پروفیسر انیس اشفاق نے انجام دی۔اس اجلاس میں مصر اور ایران سے آئے ہوئے اسکالرز نے اپنا مقالہ پیش فرمایا۔''عناصر شعری ترکیب بندی از غالب دہلوی'' کے عنوان سے ایران سے آئے ہوئے اسکالر یحییٰ طالبیان نے اپنا مقالہ پیش فرمایا۔مصر سے آئے ہوئے مہمان اسکالر یوسف عامر نے بھی اس اجلاس میں ''مقدمہ شعروشاعری'' میں عربی تنقید کے اصول کے عنوان سے اپنا پر مغز مقالہ پیش فرمایا۔سیمینار کے اس اختتامی اجلاس میں پروفیسر سید امیر حسن عابدی صاحب نے تاثراتی تقریر بھی پیش فرمائی۔مہمان اسکالرز نے بھی اپنی تاثراتی تقریر میں اس کامیاب سیمینار کی کامیابی کا سہرا غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر شاہد ماہلی کے سر باندھا جن کی دن رات کی کوششوں نے اس سیمینار، مشاعرہ اور شامِ غزل کو تاریخی بنا دیا۔آخر میں ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ شاہد ماہلی نے تمام اسکالرز، سامعین شعراء ادباء کا فرداً فرداً شکریہ ادا کیا۔

مزارِ غالب پر یوم غالب

(۱۵؍فروری ۲۰۰۲ء)

غالب انسٹی ٹیوٹ اور انجمن ترقی اردو ہند (دہلی شاخ) کے زیرِ اہتمام مزارِ غالب پر یومِ غالب کے موقع پر مشہور نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے غالب اور ہندوستانی تہذیب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ عام قاعدہ ہے کہ جب ملکوں کی تاریخ لکھی جاتی ہے تو سلطانوں کا ذکر ہوتا ہے۔ مگر جب ملک کی تہذیبی تاریخ لکھی جاتی ہے تو شاعروں کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ اور غالب ہندوستان کا وہ عظیم شاعر ہے جو کئی عرصے سے پوری دنیا میں اپنی شاعری کے ذریعے ہندوستانی تہذیب و ثقافت کو پہنچوادیا ہے۔ آپ نے اپنی تقریر میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ ہر قوم کی شناخت اس قوم کے شعرا سے ہوتی ہے۔ اور ہمیں فخر ہے کہ ہم ہندوستانیوں کی شناخت غالب سے ہے۔ آپ نے غالب کی عظمتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آج ہندوستان کے کسی بھی خطے کا فرد ہو وہ اپنی ادبی گفتگو اور تقریر میں غالب کو حوالے کے طور پر ضرور استعمال کرتا ہے۔ اس سے پہلے مزارِ غالب پر گل پوشی اور فاتحہ خوانی کا بھی اہتمام کیا گیا۔ فاتحہ خوانی اور گل پوشی کے موقعے پر جناب بدر دُریز احمد، جناب شاہد ماہلی، ڈاکٹر خلیق انجم، جناب گلزار دہلوی اور کمال احمد صدیقی کے علاوہ اور بھی اربابِ علم و دانش موجود تھے۔ اس موقع پر ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ جناب شاہد ماہلی صاحب نے اپنی استقبالیہ تقریر میں کہا کہ پچھلے پچاس برسوں سے مزار، غالب پر گل پوشی اور فاتحہ خوانی کا اہتمام کیا جا رہا ہے اور ہر سال پوری دلچسپی کے ساتھ اہلِ علم و ادب اس عظیم شاعر کو اس موقع پر خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ صدرِ جلسہ ڈاکٹر خلیق انجم نے بھی اس موقع پر غالب کی شعری معنویت پر تقریر کی۔ اس جلسہ میں جناب بدر دُریز احمد، ابوالفیض سحر، پروفیسر اسلم آزاد (پٹنہ) پروفیسر شریف حسین

قاسمی اور گلزار دہلوی کے علاوہ بڑی تعداد میں اہلِ علم و دانش موجود تھے۔ تقاریر کے بعد ایک طرحی مشاعرہ غالب کی زمین میں منعقد کیا گیا، جس میں زبیر رضوی، ابرار کرت پوری، ماجد دیوبندی، شکیل شمسی، ابوالفیض سحر، مخمور سعیدی، وارث کرمانی، گلزار دہلوی، صادق، عارف رستوگی اور شاہد ماہلی کے علاوہ دلی اور اطرافِ دلی کے مشہور شعراء نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

غالب انسٹی ٹیوٹ میں خانِ آرزو پر سمینار کا انعقاد۔
(۱۶رفروری ۲۰۰۲ء)

اٹھارہویں صدی کے مشہور شاعر سراج الدین علی خانِ آرزو کی حیات و خدمات کے اعتراف میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام ہونے والے ایک روزہ سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے پروفیسر نذیر احمد نے خانِ آرزو کو فارسی زبان و ادب کا ایک نابغۂ روزگار عالم و شاعر قرار دیا آپ نے خانِ آرزو کی شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کی شخصیت کا نمایاں پہلو ان کی ہمہ گیری ہے وہ بیک وقت فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں یکساں دسترس رکھتے ہیں۔ اس موقع پر ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ، شاہد ماہلی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ کلاسیکی شعراء اور ادیبوں پر سمینار اور لکچر کرانا غالب انسٹی ٹیوٹ کی پرانی روایت رہی ہے خانِ آرزو پر منعقد ہونے والا یہ سمینار اُس عظیم شاعر کی بازیافت ہے جسے قومی سطح پر پہلی مرتبہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے یاد کیا ہے۔ سمینار کا پہلا اجلاس ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، ڈاکٹر تنویر احمد علوی اور پروفیسر وارث کرمانی کی صدارت سے ہوا، اس اجلاس کا پہلا مقالہ جناب سرورالہدیٰ کا تھا۔ خانِ آرزو کی اردو شاعری'' کے موضوع پر جناب سرورالہدیٰ کا یہ مقالہ خانِ آرزو کے اردو کلام اور ان کے معاصرین کے کلام کے تقابلی مطالعے کی شکل میں تھا۔ اس اجلاس کا دوسرا مقالہ ''علی حزین اور خان آرزو کا ادبی معرکہ'' کے عنوان سے ڈاکٹر ریحانہ خاتون کا تھا اس کے علاوہ '' آرزو اور اس کا تذکرۂ مجمع النفائس'' کے عنوان سے ڈاکٹر نورالاسلام کا مقالہ، ''فارسی میں ادبی تنقید کی روایت اور تنبیہ

الغافلین'' کے عنوان سے پروفیسر شریف حسین قاسمی کا مقالہ اور ''عزائب اللغات اور نوادرالالفاظ کے موضوع پر ڈاکٹر خلیق انجم کا مقالہ تھا یہ تمام مقالے خانِ آرزو کی حیات وخدمات پر نہایت ہی پُرمغز اور علمی تھے۔ اس اجلاس کی نظامت کا فریضہ ڈاکٹر رضا حیدر نے انجام دیا۔

سمینار کے دوسرے اجلاس کا مقالہ'' ڈاکٹر عراق رضا زیدی کا '' وطن پرست خان آرزو کی اصلاحیں'' کے عنوان سے تھا اس اجلاس کے دوسرے مقالوں میں پروفیسر وارث کرمانی اور جناب رشید حسن خاں نے خانِ آرزو کی حیات وخدمات پر بڑی ناقدانہ بحث کرتے ہوئے اُن کی شاعری کے حوالے سے چند نئے گوشوں کی طرف بھی اشارہ کیا۔

اس اجلاس میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے بھی خانِ آرزو کے شعری مرتبے پر اظہار خیال کیا اس اجلاس کی صدارت کے لیے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر خلیق انجم اور پروفیسر شمیم حنفی کو زحمت دی گئی تھی اور نظامت کا فریضہ ڈاکٹر ابنِ کنول نے انجام دیا۔

سمینار کا اختتامی اجلاس میں ہندوستان او رایران کے فارسی اساتذہ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کے اس اقدام کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ یہ سمینار علمی دنیا میں خانِ آرزو کی شخصیت کو مزید متعارف کرانے میں اہم رول ادا کرے گا۔ اس اجلاس میں نظامت کا فریضہ ڈاکٹر محمود فیاض نے انجام دیا۔

پروفیسر سیّد امیر حسن عابدی کو استقبالیہ

(۱۶ر فروری ۲۰۰۲ء۔ شام ۵ بجے)

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام فارسی و اُردو کے محقق و دانشور بابائے فارسی پروفیسر سید امیر حسن عابدی کے اعزاز میں ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا جس کی

صدارت سیّد مظفر حسین برنی (سابق گورنر، ہریانہ) نے کی اور مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے جناب شاہد مہدی (وائس چانسلر، جامعہ ملّیہ اسلامیہ) نے شرکت کی اس موقع پر جناب بدر دُرریز احمد، شاہد ماہلی، پروفیسر نذیر احمد، اور خواجہ حسن ثانی نظامی نے عابدی صاحب کی خدمت میں گلدستہ پیش کیا، انجمن اساتذہ فارسی اور اہم فارسی اساتذہ کی طرف سے بھی عابدی صاحب کی گُل پوشی کی گئی۔ پروفیسر امیر حسن عابدی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ہندوستان، پاکستان، اور ایرانی اسکالرز کی طرف سے لکھے گئے مضامین جسے پروفیسر شریف حسین قاسمی اور شاہد ماہلی نے کتابی شکل میں مرتب کیا ہے اس کا اجراء بھی اس استقبالیے میں مظفر حسین برنی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقع پر مختلف اہلِ علم وادب نے عابدی صاحب کی زندگی اور علمی مرتبے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروفیسر نذیر احمد نے ان کی مخلصی اور انسان دوستی کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستان میں علم الانساب کا انہیں سب سے بڑا عالم قرار دیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے ان کی سادگی اور منکسر المزاجی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ عابدی صاحب کی زندگی کی سب سے بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے بڑی بے باکانہ زندگی گذاری، مشہور ایرانی اسکالر آقای اکبر ثبوت نے عابدی صاحب کی علمی عظمتوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ وہ صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ ایران میں بھی استاد الاساتذہ کے لقب سے جانے جاتے ہیں۔ پروفیسر عبدالودود اظہر نے آپ کی شخصیت کو مونالیزا کی اُس تصویر کی طرح قرار دیا جو ہر زاویے سے مسکراتی رہتی ہے۔ خواجہ حسن ثانی نظامی نے عابدی کی صاحب کی فضیلتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ کچھ لوگ دنیا میں ایسے ہوتے ہیں جو اپنے علم پر ناز کرتے ہیں مگر عابدی صاحب کی شخصیت ایسی ہے جن پر خود علم کو ناز ہے۔ جناب شمیم احمد قریشی نے کہا کہ جن ممالک میں بھی فارسی بولی جاتی ہے وہاں عابدی صاحب جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ جناب شریف احمد صاحب نے بھی عابدی صاحب سے اپنے دیرینہ تعلقات

کا اظہار کیا۔ اس موقع پر ڈائرکٹر، غالب انسٹی ٹیوٹ، شاہد ماہلی نے عابدی صاحب کی خدمت میں سپاس نامہ پڑھا۔ جناب بدر دُرریز احمد صاحب نے پچیس ہزار روپئے کا چیک اور مومنٹو پیش کیا۔ اپنی صدارتی تقریر میں جناب مظفر حسین برنی صاحب نے سینٹ جانس کالج آگرہ کے اُن دنوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ عابدی صاحب کا اور میرا سینٹ جانس کالج آگرہ میں کافی عرصے تک ساتھ رہا اُن کی وجیہہ اور علمی شخصیت کے ہم لوگ اُسی زمانے سے قائل ہیں۔ جناب شاہد مہدی صاحب نے بھی اس موقع پر عابدی صاحب سے اپنے پرانے تعلقات کا ذکر کیا۔ جناب عابدی صاحب نے بھی اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے اس اعزاز کے لئے اراکینِ غالب انسٹی ٹیوٹ کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کیا۔ آخر میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے تمام سامعین ایرانی اسکالرز اس استقبالیہ میں شریک تمام فارسی و اردو اساتذہ اور اربابِ علم و دانش کا فرداً فرداً شکریہ ادا کیا۔ اس استقبالیے کی نظامت کا فریضہ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے انجام دیا۔

اس موقع پر افتتاحی اجلاس میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے ذریعے منعقد ہونے والے مضمون نگاری کے مقابلے میں اوّل، دوم اور سوم آنے والے طلبہ کو انعامات سے بھی نوازا گیا۔ واضح رہے کہ اس مقابلے میں پہلا انعام جناب شہاب الدین (حیدر آباد)، دوسرا انعام جناب محمد ارشد (علی گڑھ) اور تیسرا انعام جناب عظمت اللہ (مظفر پور) کو دیا گیا۔ ایک اعزازی انعام جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے جناب رضوان الحق کو دیا گیا۔ یہ تمام انعامات پروفیسر نذیر احمد نے اپنے ہاتھوں سے دیئے۔

فخر الدین علی احمد میموریل لکچر

(۲۴ر مئی ۲۰۰۲ء)

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام فخر الدین علی احمد میموریل لکچر کے موقع پر معروف صحافی اور راجیہ سبھا ممبر جناب کلدیپ نیّر نے ''کیا ہندوستان میں سیکولرازم باقی رہے گا'' کے موضوع پر اپنی گفتگو میں گاندھی جی کے سکولر کردار کا حوالہ دیتے

ہوئے فرمایا کہ گاندھی جی ہمیشہ سیکولرازم کے علمبردار رہے وہ برابر ہندو مسلم اتحاد کی وکالت کرتے رہے اور ان کا تاریخی بیان بھی ہمارے سامنے ہے جس میں انہوں نے ہندو اور مسلمان کو ہندوستان کی دو آنکھیں کہا مگر افسوس کہ اُسی گاندھی کی سرزمین پر گجرات سانحے کے بعد سیکولرازم کے اوپر ایک سوالیہ نشان لگ گیا ہے۔ آپ نے اس بات پر اطمینان ظاہر کیا کہ مستقبل میں ہندوستان میں سیکولر روایات کا تحفظ ممکن ہے کیونکہ ہندوستان کی اکثریت سیکولر ہے۔ جناب کلدیپ نیر نے اپنی تقریر میں سیکولرازم کی بھی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سیکولرازم کا مطلب لادینیت ہے جب کہ ایسا نہیں ہے بلکہ سیکولرازم کا مطلب مذہبی آزادی ہے، آپ نے اپنی گفتگو میں شیخ عبداللہ کے بھی سیکولر نظریہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جب شیخ عبداللہ سے یہ پوچھا گیا کہ آپ پاکستان کیوں نہیں جانا چاہتے ہیں تو آپ نے فرمایا تھا کہ میں اُس ملک میں رہنا نہیں چاہتا ہوں جس میں صرف ایک مذہب کے لوگ رہتے ہوں بلکہ میں ایک ایسے ملک میں رہنا چاہتا ہوں جس میں تمام مذہب و ملت کے لوگ رہتے ہوں، اپنی تقریر کے اختتام پر آپ نے کہا کہ سیکولر روایات ہی ہماری اتحاد کی علامت ہیں کیونکہ بغیر سیکولر روایات کے اس ملک کی بقا ممکن نہیں ہے۔

جناب کلدیپ نیر کی تقریر سے پہلے شاہد ماہلی، ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ نے تمام مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ فخرالدین علی احمد میموریل لکچر، غالب انسٹی ٹیوٹ کی اہم سرگرمیوں میں سے ہے، ہندوستان کے اہم دانشور و ادیب نے اس موقع پر اپنے خطبات پیش فرمائے ہیں۔ آج کا دن ہمارے لیے تاریخی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ آج جناب کلدیپ نیر نے اس اہم موضوع پر تقریر کرنے کے لیے ہماری درخواست قبول کی۔

اس موقع پر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے جناب کلدیپ نیر صاحب کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ نیر صاحب اُن لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے ہمیشہ سیکولرازم کی حمایت میں آواز اٹھائی ہے۔

جناب سید مظفر حسین برنی جو اس پروگرام کی صدارت فرما رہے تھے آپ نے جناب کلدیپ نیّر اور چند سیکولر لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ جب تک اس طرح کی شخصیتیں ہندوستان میں موجود ہیں یہاں کی سیکولر روایات کو کوئی خطر نہیں ہے۔ آپ نے موجودہ حالات کے پس منظر میں ہندوستانی صحافت کی بھی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے اخبارات اور خصوصی طور پر الکٹرانک میڈیا نے بھی کافی سیکولر رول ادا کیا ہے۔ اس موقع پر جناب متین امروہوی نے بھی مرحوم فخر الدین علی احمد کی شان میں چند اشعار پیش فرمائے۔

21 Mohtarma Sughra Mehdi,
"Abid Villa,"
Jamia Nagar,
NEW DELHI-110 025
NEW DELHI-110 025

22 Dr Ali Ahmad Fatmi,
Department of Urdu,
Allahabad University,
ALLAHABAD (U P)

23 Dr Zafar Ahmad Siddiqui,
Department of Urdu,
Aligarh Muslim University,
ALIGARH (U P)

24 Janab Sheen Kaaf Nizam,
Kalla Street,
JODHPUR (Rajasthan)

25 Dr Osama Farooqi,
C/o Idara-e-Adabiyat-e-Urdu,
Aiwan-e-Urdu, Panja Gutta,
HYDERABAD (A P)-82

26 Dr Mazhar Mehdi,
Department of Urdu,
Jawahar Lal Nehru University,
NEW DELHI-110 067

27 Dr Siraj Ajmali,
Department of Urdu,
Aligarh Muslim University,
ALIGARH (U P)

28 Dr Ahmad Mehfooz,
Department of Urdu,
Jamia Millia Islamia,
NEW DELHI-110 025

29 Janab Mushtaq Tejawan,
4/151, Ziabad, Jamalpur,
ALIGARH-202 002 (U P)

30 Dr Waseem Begum,
F/141, Street No 21,
Zakir Nagar, Okhla,
NEW DELHI-110 025

31 Dr Yousuf Amir,
Deptt Of Urdu,
Faculty of Languages & Translation,
Al-Azhar University,
NASP City, CAIRO (EGYPT)

32 Dr Mohayya Abdurrahman,
1, Tupik, 2, Visal St ,
TASHKENT - 700 147
UZBEKISTAN

33 Dr Raza Haider,
F-261, Pandav Nagar,
Mayur Vihar,
DELHI

CONTRIBUTORS

1 Prof Nazır Ahmad,
4/645, Sır Syed Nagar,
ALIGARH (U P)

2 Janab Rasheed Hasan Khan,
167, Barzoo-II,
SHAHJAHANPUR (U P)

3 Prof Nısar Ahmad Farooqı,
837, Batla House, Okhla,
NEW DELHI-110 025

4 Prof Mukhtaruddın Ahmed,
4/286, Nazıma Manzıl,
Amır Nıshan Road,
Cıvıl Lıne Dodhpur,
ALIGARH (U P)

5 Dr Khalıq Anjum,
Anjuman Taraqqı Urdu Hınd,
Urdu Ghar, Rouse Avenue,
NEW DELHI-110 002

6 Dr Kamal Ahmad Sıddıquı,
202, Munırka Vıhar,
NEW DELHI-110 067

7 Prof Shamım Hanfi,
B-114, Zakır Bagh, Okhla Road,
NEW DELHI-110 025

8 Dr S Abdul Wahab Ashrafi,
"Asharfi House,
Haroon Colony, Sector-11,
P O Phulwari Sharıf,
PATNA (Bıhar)

9 Prof Abul Kalam Qasemı,
Department of Urdu,
Alıgarh Muslım Unıversıty,
ALIGARH (U P)

10 Prof S M Aqeel Rızvı,
Daryabad-211 003
ALLAHABAD (U P)

11 Prof Haneef Naqvı,
Department of Urdu,
Banaras Hındu Unıversıty,
VARANASI (U P)

12 Prof Shareef Husain Qasemı,
D-23, Nızamuddın East,
NEW DELHI-110 013

13 Dr Kazım Alı Khan,
27-B/10, Jopling Road,
LUCKNOW-226 001 (U P)

14 Prof Anees Ashfaq,
Department of Urdu,
Lucknow Unıversıty,
LUCKNOW (U P)

15 Dr Aslam Parvez,
1919/IX, Turkman Gate,
DELHI-110 006

16 Prof Asghar Abbas,
Head Deptt of Urdu,
Alıgarh Muslım Unıversıty,
ALIGARH (U P)

17 Prof Ghaffar Shakeel,
51, 2nd Maın C V Road Cross
Barnımentap 'A',
MYSORE-570 015

18 Prof Iqtedar Husaın Sıddıquı,
61, Ahmad Nagar, Cıvıl Lınes,
ALIGARH (U P)

19 Prof Zaheeruddın Malık,
4/1084, Sır Syed Nagar,
ALIGARH (U P)

20 Prof A W Azhar,
98, Hajı Bhawan,
Sadar Bazar,
DELHI-110 006

Ghalibnama

NEW DELHI

July 2002 VOLUME 23 No 2

Price Rs 150/-

Printer & Publisher

SHAHID MAHULI

Computer Composer

MOHD UMAR KAIRANVI

Printed by

AZIZ PRINTING PRESS

Tel 3285884

GHALIB NAMA

Aiwan-e-Ghalib, Aiwan-e-Ghalib Marg

(Mata Sundri Lane), New Delhi-110002

Ph 3232583-3236518

Ghalibnama

Chief Editor

PROF NAZIR AHMAD

Editors .

PROF SIDDIQUR RAHMAN KIDWAI

PROF SHAREEF HUSAIN QASEMI

SHAHID MAHULI

GHALIB INSTITUTE

AIWAN-E-GHALIB MARG (MATA SUNDRI LANE),
NEW DELHI 110002